سالنامہ ادبی دنیا

سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن

اس ایسوسی ایشن کے سرپرست حضور ملک معظم ہیں۔ ایسوسی ایشن کی امتیازی خصوصیت بیماروں اور زخمیوں کی تیمارداری اور اتفاقی حادثات میں فرسٹ ایڈ (ابتدائی امداد) بہم پہنچانا۔ اور اس کی ترویج و تعلیم دینا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اکثر و بیشتر ایسے دور افتادہ مقامات بھی ہیں جہاں کسی ضرورت کے وقت طبی امداد کا بہم پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے ایسے ہی حالات کے پیش نظر ایسوسی ایشن نے ابتدائی امداد کی تعلیم کے مراکز جاری کر رکھے ہیں۔ جہاں مردوں، عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرب، چوٹ، زخم وغیرہ کے فوری علاج اور بیماروں کی تیمارداری کا ابتدائی طریقہ سکھایا جاتا ہے اب ان مراکز میں بچے کی نگہداشت اور رکھ رکھاؤ کا طریقہ بطور نصاب داخل کرلیا گیا ہے۔

ایسی تعلیم اور اس کی ضرورت کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب خدانخواستہ آپ کے کسی عزیز کو کوئی ناگہانی حادثہ پیش آجائے اور طبی امداد کے فوراً حاصل نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس کے دکھ اور درد کو کم کرنے کے لئے کوئی چارہ نہ کرسکیں۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حفظان صحت کے اصولوں کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرب یا چوٹ کو معمولی سمجھ کر بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ جس کے نتائج نہایت شدید تکالیف کی صورت میں مریض کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

انھیں امور کے پیش نظر سینٹ جان ایمبولنس ایسوسی ایشن ابتدائی امداد کی تعلیم کو عام کرنا اپنا اہم ترین فرض سمجھتی ہے۔ چنانچہ اپنے قائم کردہ مراکز کے ذریعے سے سکولوں، کالجوں، ریلوے ملازموں، کان کنوں، فوجیوں، کارخانوں اور ہر ایسی جگہ جہاں چند افراد کو جمع کرنے کا موقع مل سکے اس علم کو تقریروں اور امتحانوں کے ذریعے سے ترویج دیتی ہے۔

ایسوسی ایشن کے خاموش لیکن باقاعدہ کام کا اندازہ آپ اس امر سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ گزشتہ دس سال کے عرصے میں صرف صوبہ پنجاب میں چھ ہزار ایک سو بیالیس ۶۱۴۲ افراد کو اس مفید خدمت کے کام سے بہرہ ور کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود اس بات کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایسوسی ایشن اپنے کام کو وسیع تر پیمانے پر رواج دے لیکن سرمائے کی کمی کے باعث ان تجاویز پر فوری عمل نہیں ہوسکتا۔ جو اس وقت ایسوسی ایشن کے پیش نظر ہیں۔ اگر آمدنی میں معقول اضافہ ہوجائے تو ایسوسی ایشن اپنے مفید خلائق کام کو بیش از بیش وسعت دے سکتی ہے +

انجمن صلیب احمر ہند
(ریڈ کراس سوسائٹی)

انجمن صلیب احمر ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جس کی بنیاد ۱۸۶۳ء میں ہنری ڈیوننٹ نے اس غرض سے ڈالی تھی کہ میدان جنگ میں زخمیوں اور بیماروں کو طبی امداد رضاکارانہ طور پر مہیا کی جائے۔ اب اس کے اغراض میں توسیع کر دی گئی ہے چنانچہ زمانہ امن میں بھی وبا، سیلاب، زلزلہ، قحط یا ایسی ہی دوسری ابتلاؤں کے مواقع پر یہ انجمن اپنی خدمات پیش کرتی ہے اور مصیبت زدوں کو بلا امتیاز قومیت و مذہب یا رنگ و نسل امداد بہم پہنچاتی ہے۔

ہر مذہب و ملت کے افراد کو انجمن کی ممبری کے لئے دعوت دی جاتی ہے جس کے لئے چندہ حسب ذیل ہے۔

زندگی بھر کے لئے ممبر کا چندہ	۱۵۰ روپے
زندگی بھر کے لئے معاون ممبر کا چندہ	۵۰ روپے
سالانہ ممبر کا چندہ	۱۲ روپے
سالانہ ممبر کا چندہ	ایک روپے سے پانچ روپے تک

اس کے علاوہ سکولوں کے مدرسوں کے ذریعے سے طلبا میں اس انجمن کے ممبروں کو وسعت دی جاتی ہے۔ بچوں کے پنپتے ہوئے دماغوں میں حفظان صحت کے اصول داخل کئے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وبائی امراض کا ٹیکہ لگوانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ بچوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے اور مصائب میں کام آنے کے جذبات پیدا کئے جاتے ہیں۔

ممبروں کے چندے کی رقوم اور اس کے علاوہ مخیر اصحاب جو چندہ عنایت کریں اسے ملک کے مصیبت زدگان اور مریضوں کی امداد پر صرف کیا جاتا ہے۔

صلیب احمر کے ماتحت ۱۸۴ بچہ خانے کھولے گئے ہیں۔ جہاں ماؤں کو بچوں کی پرورش کے صحیح طریقے سکھائے جاتے ہیں۔

قریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کا سامان ہر سال فوجی اور سول ہسپتالوں میں دیا جاتا ہے۔

اس وقت انجمن صلیب احمر استیصال تپ دق کے لئے مختلف طریقوں سے بڑی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ مثلاً:۔

دق سے بچنے کی ہدایات پر مختلف قسم کا لٹریچر تقسیم کرتی ہے۔ کنگ جارج تھینکس گوِنگ فنڈ کو کامیاب بنانے میں مدد دے رہی ہے۔ دق زدہ مریضوں کا علاج اپنے خرچ پر کراتی ہے اور تپ دق کے متعدد شفاخانوں کو امداد دیتی ہے۔

انجمن ایک رسالہ بھی "ریڈ کراس" کے نام سے شائع کرتی ہے۔ جس کی ادارت کے فرائض ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور چودھری محمد عبدالسمیع صاحب بی۔ اے۔ سرانجام دے رہے ہیں۔

انجمن نے جرنیلی سڑک پر دہلی سے اٹک تک "فرسٹ ایڈ پوسٹ" قائم کر دئے ہیں اور اب اس کے علاوہ دوسری بڑی سڑکوں پر یہ سلسلہ جاری کیا جا رہا ہے۔

حصار کے قحط زدوں کے لئے انجمن نے ایک ہزار روپیہ گرم کپڑوں اور خوراک کے لئے ارسال کیا ہے اور اس ضمن میں مزید امداد بہم پہنچانے کا ذمہ اٹھایا ہے۔

غرض کہ انجمن کی سالانہ رپورٹ کے مطالعے سے آپکو معلوم ہوگا کہ اس کے ممبر اور کارکن کس تن دہی کے ساتھ بنی نوع انسان کے دکھ درد کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسے آفات ارضی و سماوی سے بچانے کے لئے کس انہماک اور سرگرمی سے مصروف کار ہیں ✦

اعلیٰ درجہ
مگر کم قیمت
ریڈیو سیٹ
فلپس ۵ والو آل انڈیا ریسیور
مشہور عالم ساخت
جس پر آپ بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور ہندوستان کے دیگر سٹیشنوں کا پروگرام نہایت صاف اور عمدہ آواز میں سن سکتے ہیں۔ پہلی دفعہ نہایت کم قیمت اور قسط وار ادائیگی کی آسانی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے
خصوصیات
خوبصورت کیبنٹ
اے۔ سی اور ڈی سی دونوں کرنٹ
بجلی کا خرچ نہایت کم
آواز کو گھٹانے بڑھانے والا آٹو
آٹومیٹک والیوم کنٹرول
فلپس کے باقاعدہ ڈیلر سے خرید کر پوری گارنٹی حاصل کیجئے۔
قیمت
صرف ۱۸۰/- روپے
یا پندرہ پندرہ روپے ماہوار کی بارہ قسطیں
تفصیل مندرجہ ذیل پتہ سے معلوم کیجئے
سول ڈسٹری بیوٹرز: سپارکو ریڈیو (ہندوستان میں ریڈیو کے پہلے ماہر) دیال سنگھ مینشن مال روڈ۔ لاہور
PHILIPS
radioplayers

AKSHMI'S STRENGTH

guarantees your Security

سال مختتمہ ۳۰ اپریل	NEW Busineness نیا بزنس	ASSETS ملکیت
۱۹۲۵	روپیہ ۲۲۶۷۷۵۰	روپیہ ۱۲۰۰۰
۱۹۲۸	" ۵۵۲۹۵۰۰	" ۶۵۲۰۰۰
۱۹۳۲	" ۷۰۸۹۰۰۰	" ۳۲۸۸۰۰۰
۱۹۳۶	" ۱۴۰۱۶۰۰۰	" ۷۹۲۶۰۰۰
۱۹۳۸	" ۱۶۱۱۱۳۷۷۵	" ۱۱۲۵۷۶۱۶

HE LAKSHMI INSURANCE CO., LTD.

HEAD OFFICE: **LAKSHMI BLDG. LAHORE**

دنیائے کاروبار

لکشمی بیمہ کمپنی لاہور

اس کمپنی کی بنیاد ملک کے مایۂ ناز فرزندان لالہ لاجپت رائے - پنڈت موتی لال نہرو، آنجہانی، اور پنڈت کے سنتانم نے ۱۹۲۴ء میں ڈالی تھی۔ معلوم نہیں کس مبارک ساعت میں گلستان ہند کے اس نونہال کا بیج بویا گیا کہ "جادوگر کے آم" کی طرح لمحہ بہ لمحہ اس کے ڈال۔پات، پھول اور پھل نکلتے ہی چلے آئے۔ چنانچہ آج اس کی شاخیں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں اور اپنی عافیت خیز چھاؤں کے نیچے ملک کے بے شمار گھرانوں کو لئے ہوئے امن و عافیت کا حقیقی پیغام دے رہی ہے۔

کمپنی کی ساحرانہ ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ قیام کے چھ ہفتے کے اندر دفتر جاری ہو گیا۔ چھ ماہ کے اندر اندر تمام حصص فروخت ہو چکے تھے۔ سال ختم ہونے سے پہلے ۲۴ لاکھ روپے کا کام آ چکا تھا۔ چار سال کے بعد بارہ اور دس روپیہ فی ہزار فی سال منافع منظور ہوا۔ آیندہ چار سال کے بعد سوا پانچ لاکھ روپے کی بچت ہوئی اور بیمہ داروں کو ۱۸، اور ۱۵ روپے فی ہزار بونس دیا گیا تیسری مرتبہ چار سالہ حسابات پر ۱۹۳۶ء میں چودہ لاکھ روپے کی بچت ہوئی اور منافع ۲۰ اور ۱۶ روپے فی ہزار فی سال کے حساب سے ادا ہوا

اور یہ حیرت میں ڈال دینے والی ترقیاں کیوں نہ ہوں جب کہ اس تمام سحرکاری کا سرانجام دینے والا پنڈت کے سنتانم جیسا ساحر ہو جس کے سحر کا راز اس کی ان تھک محنت، جاں فشانی اور کفایت شعارانہ طرز عمل میں مضمر ہے اور جس کی پشت پر ایماندار اور جفاکش معاون موجود ہیں۔

کمپنی کی سربفلک اور عالی شان عمارتیں لاہور، بمبئی اور کلکتہ میں پہلے سے موجود ہیں۔ اب کراچی میں ایک عظیم الشان عمارت تکمیل کو پہنچی ہے جس کا افتتاح مسز سروجنی دیوی نائڈو نے کیا ہے۔

ہم اس مبارک موقع پر کمپنی کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمیں آیندہ بھی ایسی مبارک باد پیش کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔

نیشنل گرامو فون ریکارڈز مینو فیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

جھاویری ہاؤس - ۱۱۰ مینڈوز سٹریٹ بمبئی

ملک کے چند مشہور قومی رہنما اور بلند پایہ تاجروں نے مل کر مندرجہ بالا نام سے ایک ریکارڈ بنانے والی کمپنی کا اجرا کر کے ملک کے بڑھتے ہوئے صنعتی اداروں میں ایک اور مفید ادارے کا اضافہ کیا ہے

کمپنی کے ڈائرکٹروں میں شانتی لال منگل داس بھولا بھائی جے سنگھ بھائی، سنی لال موہن لال، ترکم لال ہیا سکھ رام اور ڈورلے رائے انندرائے جیسے مقتدر اصحاب موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے دائرۂ عمل میں ملک کی خدمت امکان بھر کی ہے۔

مسٹر ڈی۔ اے۔ پانڈیا نے جو مینجنگ ایجنسی کے ایک رکن ہیں۔ جاپان میں جا کر اس صنعت کا بغور مطالعہ کیا اور پھر اپنے ساتھ جاپان کے ایک ماہر ریکارڈ ساز کو اس شرط پہ لائے کہ وہ ہندوستانی نوجوانوں کو اس کام میں ماہر کر دے۔

کمپنی کا سرمایہ ۳۰۰۰۰۰ روپے پر مشتمل ہے۔ کارخانہ بمبئی میں لگایا گیا ہے جس میں جدید ترین قسم کی مشینیں موجود ہیں جن کے ذریعے سے تیار کیا ہوا مال پرانی بدیشی کمپنیوں کا ہر طرح سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوران عمل میں جو کچا مال استعمال کیا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ خالص ہندوستان کا تیار شدہ ہوتا ہے۔

کمپنی کو اس بات پر فخر ہے کہ انھیں پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگرس کے صدر سبھاش چندر بوس جی کے پیغامات "ینگ انڈیا" ریکارڈوں میں محفوظ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

دو سال کے قلیل عرصے میں کمپنی نے قریب پانچ سو ریکارڈ بھرے ہیں جن میں ملک کے بہترین گویّے بھی شامل ہیں۔ اس قلیل مدت میں کمپنی نے سورت اور احمد آباد کی نمائشوں سے سنہری تمغے بھی حاصل کئے ہیں۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ پربھات فلم کمپنی نے اپنی مشہور فلم گوپال کرشن کے گانے اسی کمپنی کے ریکارڈوں میں بھروائے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ دوسری فلم کمپنیاں بھی اس سودیشی صنعت کو فروغ دینے کے لئے کمپنی کی امداد کریں گی۔

مسٹر ڈی۔ اے پانڈیا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس مبارک صنعت کو ہاتھ میں لے کر اپنی محنت اور کوشش سے بہت حد تک اسے کامیاب بنا لیا ہے۔

ریڈیو الیکٹرک انسٹی ٹیوٹ

لیمنگٹن چیمبرز بمبئی نمبر ۴

ریڈیو الیکٹرک انسٹی ٹیوٹ غالباً ہندوستان میں سب سے پہلا ادارہ ہے جس نے طلبا کو ریڈیو کی صنعتی تعلیم دینی شروع کی۔ چار سال کے قلیل عرصے میں ملک کے مختلف حصوں سے پانچ سو طلبا یہاں سے تعلیم حاصل کر کے معقول معاوضوں پر کام کر رہے ہیں۔

یہ سکول گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے۔ طلبا کو وائرلیس۔ اوپریٹرز سرٹیفکیٹ کلکتہ اور سٹی اینڈ گلڈ انسٹی ٹیوٹ اور انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل انجینیرز لندن کے امتحانوں کے لئے بھی تیار کیا جاتا ہے۔

سکول میں تمام قسم کے ضروری آلات موجود ہیں۔ ۹ ماہ کے قلیل عرصے میں تعلیم مکمل کر دی جاتی ہے۔

طلبا کی تربیت تعلیم اور رہائش کا انتظام نہایت تسلی بخش ہے

طلبا کے والدین یا سرپرستوں کو ان کی تعلیمی ترقیوں کے حالات سے باقاعدہ اطلاعات دی جاتی ہیں۔

مکمل پراسپکٹس جس میں فارغ التحصیل طلبا کے ناموں کی فہرست کے علاوہ متعدد فوٹو بھی دیئے گئے ہیں مندرجہ بالا پتے سے منگوائیے۔

"ٹائمز آف انڈیا کراس ورڈز"

کراس ورڈز (معموں) کی ابتدا۔ امریکہ کے جریدہ "نیویارک ورلڈ" کے مدیر آرتھر وین نے کی تھی۔ انعامات تقسیم کرنے کا یہ طریقہ اس قدر جلد مقبول عوام ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کے بیشتر چھوٹے بڑے اخبارات نے اسے اختیار کر لیا۔

ہندوستان میں ان معموں کی ابتدا سنہ ۱۹۳۲ء میں موقر جریدہ "ٹائمز آف انڈیا" نے کی۔ سب سے پہلا انعام پانچ ہزار روپے کی رقم سے شروع کیا گیا۔ اس وقت یہی جریدہ قریباً پچاس ہزار روپیہ ماہوار اپنے خریداروں میں تقسیم کر رہا ہے۔ اور گزشتہ چار سال کے عرصے میں تقریباً ستائیس لاکھ روپیہ تقسیم کر چکا ہے۔

ملک کے چند دوسرے اخبارات بھی کم و بیش رقوم کے لیے انعامی معمے وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے ہیں لیکن فنی اور علمی نقطۂ نگاہ سے اور پھر بیش قرار رقوم کی تقسیم کے اعتبار سے جو مقبولیت ٹائمز آف انڈیا نے حاصل کر رکھی ہے۔ وہ ابھی تک کسی کے حصے میں نہیں آئی۔

اس ماہ کے انعامی کراس ورڈز کے لئے اشاعت ہذا میں مفصل اشتہار دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے۔

فاورے لیوبا اینڈ کمپنی لمٹیڈ

وقت کا دوسرا نام زندگی ہے۔ یا پھر زندگی کے لئے وقت دولت ہے اور وقت ہی علم ہے۔

زندگی کی قدر کرنے والوں کے نزدیک وہ لوگ بنی نوع انسان کے سب سے بڑے محسن ہیں جو انسان کے لمحات زندگی کو چھوٹے سے چھوٹے لیکن صحیح ترین اجزا میں تقسیم کر کے انھیں کام میں لانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس صنف میں مسرز فاورے لیوبا اینڈ کمپنی کا نام خاص طور

زندک
CONTAINS NOTHING AGAINST ANY RELIGION
MAQBOOL'S
ZINDAK
FOR SKIN & SCALP
SEE DIRECTIONS ON THE BACK
PREPARED BY MAQBOOL CHEMICAL WORKS BOMBAY 3
یہ مشہور عالم جادو اثر مرہم ہر قسم کے زخم چوٹ۔ جلے ہوئے۔ کٹے ہوئے۔ ناسور، پھوڑا، پھنسی اور جلدی امراض کے لئے اکسیر ہے۔ نہروکو گلا دیتا ہے۔ ورم کو دور کرتا ہے۔ اور زہریلے جانوروں کے زہر کا اثر نابود کرتا ہے اس کے متعلق بڑے بڑے ڈاکٹروں نے سرٹیفکیٹ دیئے ہیں قیمت: فی بکس علاوہ پوسٹیج ۳ بکس فری پوسٹیج
دی مقبول کیمیکل ورکس ناگدیوی سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

سے قابل ذکر ہے جو ۱۸۴۸ء سے بہترین گھڑیاں پبلک میں پیش کر رہے ہیں۔ اس فرم کی "سینڈو" اور "زینتھ" نام کی گھڑیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "زینتھ" حسن ساخت اور پائداری کے علاوہ متواتر پندرہ سال سے صحیح ترین وقت دینے کی وجہ سے امتیازی سرٹیفکیٹ حاصل کر رہی ہے۔

انسان کے لئے دو چیزوں کا انتخاب اہم ترین ہوتا ہے۔ ایک اچھا "رفیق زندگی" اور ایک "اچھی گھڑی" رفیق زندگی کے انتخاب میں آپ کی رائے سب سے زیادہ وقیع ہو تو ہو لیکن اچھی گھڑی کے انتخاب میں مسرز فاورے لیوبا اینڈ کمپنی لمٹیڈ سے مشورہ لینا عین دانشمندی ہے۔ کلکتہ یا بمبئی کے پتے سے فہرست مفت طلب کریں۔

باٹانگر

کلکتہ سے ۱۲ میل جنوب کی سمت، دریائے ہگلی کے دائیں کنارے پر ایک نیا صنعتی شہر باٹانگر کے نام سے آباد ہو رہا ہے۔ اس شہر کو تھامس باٹا آنجہانی کی تجاویز کے مطابق اُن نوجوان ہندوستانیوں نے آباد کیا ہے جو یورپ میں ۳ سال کی صنعتی اور حرفتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

باٹانگر کی باٹا شو فیکٹری ایک ہندوستانی ادارہ ہے جہاں ہندوستانی کاریگر ہندوستانی کچے مال کی مدد سے بہترین اور ارزاں ترین جوتے تیار کرتے ہیں۔ کارخانے کی سات عظیم الشان عمارتوں میں (جن کی تعداد ابھی اور بڑھ رہی ہے) چار ہزار ملازمین جوتوں کے قریباً دو لاکھ جوڑے ہفتہ وار تیار کرتے ہیں۔ جن کی معتد بہ تعداد غیر ممالک کو بھی بھیجی جاتی ہے۔ کارخانے کی بنیاد حفظان صحت کے جدید ترین اصولوں کے مطابق رکھی گئی ہے۔ ان کی عمارتیں وسیع اور ہوادار ہونے کے علاوہ چاروں طرف سے باغات سے باغات سے گھری ہوئی ہیں۔

فروخت کے انتظامات ملک کے طول و عرض میں کمپنی کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ نفع اٹھانے والے متعدد درمیانی تاجروں اور دلالوں کی غیر موجودگی نے کمپنی کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ کلکتہ، لاہور، حیدرآباد، مدراس، بابنگلور میں ہر جگہ یکساں اور ارزاں قیمت پر اپنا مال فروخت کریں۔

کاریگروں کی آسائش کے لئے انہیں اعلیٰ درجے کے سازوسامان سے آراستہ وسیع ہوادار اور صاف ستھرے مکانات دئیے گئے ہیں۔

اپنے فرائض سے فراغت پانے کے بعد وہ مختلف قسم کے کھیلوں میں شریک ہوتے ہیں اور اس طرح اُن کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ باٹانگر کا اپنا ڈاک خانہ، ٹیلیفون گھر، ریفرشمنٹ روم، اور اتفاقی حادثات کے لئے آگ بجھانے کا انتظام اور پولیس بھی موجود ہے۔ سینما اور تھیئٹر ہال کے علاوہ اب بچوں کے لئے ایک سکول تعمیر کرنے کی تجویز مکمل ہو چکی ہے۔ حال ہی میں ایک ہسپتال بھی جاری کیا گیا ہے جس میں اوپریشن کے انتظامات بھی موجود ہیں۔

باٹا کمپنی اور باٹانگر کی ترقی کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:-

۱۹۳۳ء میں کمپنی کے ملازمین کی مجموعی تنخواہ ۱۰۲۵۳۰۸ روپے تھی۔
۱۹۳۷ء میں یہ رقم ۱۲۳۸۷۲۹ روپے تک پہنچ گئی۔

۱۹۳۳ء میں باٹانگر کی آبادی ۱۲۵۱ تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ۴۰۱۴ افراد ہو گئی۔ اسی طرح ۱۹۳۳ء میں باٹانگر کے باشندوں کی اوسط آمد فی ۵ روپے ہفتہ وار تھی۔ آج سات روپے ۱۵ آنے ہے۔

باٹا کمپنی نے کچے مال کی خرید پر ۱۹۳۷ء میں ۳۶۴۵۳۰۰ روپیہ خرچ کیا لیکن اس میں سے ۸۲ فی صدی رقم یعنی ۲۵۹۰۸۰۰ روپیہ ہندوستانی مال کی خرید پر صرف ہوا۔

ان اعداد و شمار سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ باٹانگر بہ کمال سرعت ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ترقی سے مستفید ہونے والے صرف اس کے گاہک ہی نہیں جنہیں پہننے کے لئے جوتے ارزاں قیمت پر مہیا کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ وہ ہندوستانی ملازمین بھی ہیں جن کی فلاح و بہبود کمپنی کے پیش نظر ہے اور جو آگے چل کر ہندوستان کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کا باعث ہوں گے۔

سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور

سن لائٹ نے اپنی تھوڑی سی عمر میں کاروباری لحاظ سے وہ شہرت حاصل کر لی ہے کہ بعض پرانی کمپنیاں بھی اس کا لگا نہیں کھاتیں۔ کوئٹہ کے زلزلے کے موقع پر وہاں کے پالیسی ہولڈروں کے بدنصیب ورثا کی مصائب کا خیال کرتے ہوئے پالیسی ہولڈروں کے ناموں کی فہرست شائع کر دی تھی اور یہ امر

بیمہ کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ مطالبات کی فوری ادائیگی کمپنی کی خصوصیت ہے۔ ایک متوفی پالیسی ہولڈر کا کلیم کاغذات پُر کرنے کے ۳ روز کے اندر اندر ادا کر دیا گیا۔

کمپنی کی باگ ڈور نہایت تجربہ کار منتظمین میں ہے اور کاروبار نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔

ایک قومی ادارہ

مدبرین ملک کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی بہبودی کا راز بہت بڑی حد تک ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی میں مضمر ہے۔ اس ضمن میں جو پُرجوش خدمات ادارۂ "انڈسٹری" نے گزشتہ تیس سال میں انجام دی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں۔

۱۹۱۰ء میں جب کہ مسٹر کے ایم مینرجی نے ماہنامہ "انڈسٹری" کی بنیاد رکھی ملک کی فضا ملازمتوں کے خبط سے پُر اور ایسے رسالے کے لئے بے حد ناسازگار تھی۔ ملک کی موجودہ صنعتی اور تجارتی ترویج اور ترقی میں ان کی مستقل مزاجی اور پامردی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

انڈسٹری نے جاری ہوتے ہی تھوڑے سرمائے سے فالتو وقت میں روپیہ پیدا کرنے کے نسخے شائع کرنے شروع کر دیئے اور اس کے بعد خاص خاص مفید اور نفع بخش صنعتوں پر مبسوط مضامین لکھے۔ رسالہ کی ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے۔ جو ہر صنعتی موضوع پر صناعوں کی مشکلات کو حل کرنے پر مستعد رہتے ہیں۔

ادارہ انڈسٹری نے مختلف صنعتی موضوعات پر متعدد کتابیں بھی شائع کی ہیں جن کی فہرست درخواست کرنے پر مفت مل سکتی ہے۔

"انڈسٹری ییر بک اینڈ ڈائرکٹری" گزشتہ دس سال سے باقاعدہ شائع ہو رہی ہے جو صناعوں اور تاجروں کے لئے بہترین معلومات مہیا کرتی ہے۔

ادارہ انڈسٹری صحیح معنوں میں ایک قومی ادارہ ہے جس پر قوم اور ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ذیابیطس اور اس کا کامیاب علاج

ذیابیطس کا مرض ان چند موذی امراض میں سے ہے جو انسان کی زندگی کو ایک مستقل عذاب بنا دیتے ہیں اور جس کے نتائج جسمانی کمزوری، وزن کی کمی، ضعف اعصاب دماغی کمزوری، ضعف بینائی، وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ذیابیطس کا سبب ایک نہیں بلکہ کئی ایک ہوتے ہیں اس لئے اس کا علاج بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جو اُن تمام پر حاوی ہو سکے اور ان کا ازالہ کر سکے۔

عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ مریض مرض کی تکالیف سے مرعوب ہو کر علاج کے پرانے طریقوں پر کاربند ہوتے ہوئے فاقوں اور قیمتی ادویات کے ٹیکوں سے اپنی صحت اور روپے کو ضائع کرتا رہتا ہے۔

ڈیملن وہ ایجاد ہے جس کی بنیاد سائنس کے جدید ترین اصولوں پر قائم ہے۔ اور ذیابیطس کے پانچ اولیں اسباب کے ازالے پر حاوی ہے۔ اس کے استعمال سے ہزارہا مریض صحت یاب ہو چکے ہیں تفصیلی حالات کے لئے ڈیملن ریسرچ لیبارٹری، پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱، بمبئی سے رسالہ مفت منگوائیے۔

لمٹن گھڑیاں

کلائی پر باندھنے والی گھڑیوں کے متعلق یہ شکایت بہت عام ہے کہ وہ صحیح وقت دینے میں کچھ ایسی کامیاب نہیں رہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو قبولیت اِن گھڑیوں کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسری صنف کی گھڑیوں کو حاصل نہیں ہوئی جسمانی زینت کے علاوہ گھڑی کے ہر وقت پاس رہنے اور وقت دیکھنے میں آسانی کی ایسی صفات ہیں۔ جنھوں نے اسے دوسری تمام قسم کی گھڑیوں میں ممتاز بنا رکھا ہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی ہے کہ لمٹن واچ کمپنی، نمبر ۱۳ ڈلہوزی سکوئر، کلکتہ نے اعلیٰ درجہ کی گھڑیاں پبلک میں پیش کی ہیں۔ جو ظاہری حسن و خوبصورتی کے علاوہ صحیح وقت دینے والی، مضبوط اور پائیدار اور ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت میں مقابلتاً ارزاں ہیں۔

مندرجہ بالا پتے سے کمپنی کی مصور فہرست مفت طلب کیجئے۔

بکنگھم اینڈ کرناٹک ملز لمیٹڈ مدراس کی شاندار خدمات کا اعتراف

حضور وائسرائے ہند کیا فرماتے ہیں؟

خاکی زین KHAKI DRILL اہم ضروریات کا ایک جزو ہے جس کے حصول کے لئے مدراس میں ہماری نگاہیں **بکنگھم اینڈ کرناٹک ملز لمیٹڈ** پر ہیں۔ افواج ہند کیلئے جتنا خاکی کپڑا استعمال ہوتا ہے وہ سب کا سب ان ملوں کا تیار کردہ ہوتا ہے۔ کمپنی ہذا نے اپنے مال کی کوالٹی میں نمایاں اضافہ کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زین کو خاکی رنگنے کے لئے اپنے خاص پلانٹس ایجاد کئے ہیں۔

کمپنی ہذا کی خاکی رنگ سازی کی مشینری موجودہ وقت کی سب سے بڑی بہترین اور لاثانی ایجاد ہے

کپڑے کے کنارے پر ہر دو گز پر ہمارے ٹریڈ مارک ملاحظہ کریں

سول ڈسٹری بیوٹر :-

برجموہن کرشن پرشاد

کٹڑہ اہلو والیاں امرتسر

دیگر دفاتر:-

لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور

دہلی۔ کانپور۔

بمبئی

ای ۔ ایس پاٹن والا

ای ۔ ایس پاٹن والا کا نام سنتے ہی نہ صرف صابن، غازے اور عطریات کی رنگا رنگ ٹکیاں اور خوبصورت شیشیاں نظروں میں پھر جاتی ہیں بلکہ قوت شامہ پر بھی طرح طرح کی خوشبوؤں کی ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔ ان مصنوعات کی ہر دلعزیزی کا اندازہ آپ اس امر سے بخوبی کر سکتے ہیں کہ جس کارخانے کی ابتدا ۱۹۱۱ء میں محض ایک سو روپے کے سرمائے سے کی گئی تھی، آج اس کی بنیادیں ایک لاکھ روپے کے سرمائے سے استوار کی گئی ہیں۔

پاٹن والا کی مشہور ترین چیز "افغان سنو" ہے جس کے اجزا کا معائنہ پیرس کی لیبارٹری میں ہو چکا ہے اور انسانی جلد کے لئے اس کے مفید ہونے کی تصدیق کی جا چکی ہے۔

پاٹن والا نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ دیسی مصنوعات اپنی ساخت حسن اور دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اپنی صنف کی بدیشی مصنوعات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں۔ ان کی اشیاء ہر شہر کے معزز دکانداروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں، یا پھر براہ راست اشتہار میں دئیے ہوئے پتے پر خط و کتابت کیجئے۔

بمبئی ٹاکیز

بمبئی ٹاکیز، ار دسمبر ۱۹۳۸ء کو اپنی تازہ ترین فلم "بھابی" پردۂ سیمیں پر دکھانے والی ہے۔ کہانی کا موضوع ہندوستانی عورت کی بے غرضی اور اس کا اپنی راحت و آسائش کو دوسروں پر قربان کر دینے کا جذبہ ہے جو نہایت دل آویز پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔

رینوکا دیوی اور پی جیراج ہیروئن اور ہیرو کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ مایا دیوی۔ ایم نذیر اور پی۔ ایف پیٹھاوالا بھی اپنے مخصوص کردار کے ساتھ شامل ہیں۔

امید ہے بمبئی کی پبلک بالخصوص اور سینما کے شوقین بالعموم اس فلم کا کما حقہ خیر مقدم کریں گے اور کمپنی کی محنت کی ایسی داد دیں گے جس کی وہ مستحق ہے۔

دی سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ

یہ جہازراں کمپنی ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی سرمائے سے ہندوستانیوں کی نگرانی میں قائم کی گئی تھی۔ اس وقت کمپنی کا ۲۶ جہازوں کا بیڑا نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔

کمپنی نے حجاج کی تکالیف کے پیش نظر اپنے جہازوں کو جدید ساز و سامان سے آراستہ کیا ہے اور ان کے آرام کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اچھی غذا، پانی کی فراوانی جگہ کی فراخی وغیرہ کے علاوہ کمپنی نے حاجیوں کے جذبات و ضروریات مذہبی کو محسوس کرتے ہوئے جہاز "المدینہ" میں صاف اور پاک جگہ، اور کتب مذہبی کی ایک لائبریری بھی مہیا کی ہے۔ اکثر مقتدر حجاج نے کمپنی کے انتظامات اور حسن سلوک کا اعتراف کیا ہے۔

عازمین حج بیت اللہ کمپنی کے صدر دفتر بمبئی یا کراچی و کلکتہ کے دفاتر سے طلب کریں۔

اوٹین کریم اور سنو

جس طرح جسم کی قوت اور نشو و نما کا انحصار اس خوراک پر ہے جو ہم کافی غور و خوض کے بعد منتخب کرتے ہیں اور پھر سینکڑوں مختلف طریقوں سے تیار کرتے ہیں اسی طرح جلد کی تر و تازگی و صحت کا انحصار اس بیرونی خوراک اور صفائی پر ہے جو ہم اس کے لئے مہیا کریں اور جس طرح ہر خوراک میں وہ قوت بخش اجزا موجود نہیں ہوتے جو اس کے نشو و نما میں ممد و معاون ہوں اسی طرح ہر کریم اور سنو میں وہ صفات نہیں ہوتیں جو اس کی تر و تازگی کو قائم رکھیں۔

اوٹین سنو اور کریم ایسے اجزا سے تیار کی جاتی ہیں جو بیرونی طور پر جلد کو خوراک مہیا کرتے ہیں اور جلد کے مسامات سے مضر اثرات کو دور کر دیتے ہیں۔ چہرے کی خوبصورتی کے تحفظ اور اضافے کے لئے یہ دونوں مرکبات اپنے مفید اثرات کے سبب سے نہایت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ خوبصورت پیکنگ اور روح پرور خوشبو اس کے علاوہ ہیں۔

تفصیلات کے لئے اشتہار ملاحظہ فرمائیے۔

روز آغاز سے شاہراہِ اقبال پر

شملہ بنکنگ اینڈ انڈسٹریل کمپنی لمٹیڈ کے اجلاس منعقدہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کے صدر راجہ رگھبیر سنگھ صاحب او۔ بی۔ ای کی تقریر کا خلاصہ:

صاحبان! ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء تک کی ڈائرکٹروں کی رپورٹ اور بیلنس شیٹ آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ کاروبار کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے مقابلے میں اس سال بنک کی ڈیپازٹ بقدر ۱۶۴۰۶۴ روپے کے زیادہ رہی۔

باوجودیکہ ہم نے شرح سود میں کمی کر دی تھی۔ ہم اب بھی ناروا مقابلہ کرنے والوں کی پیروی نہ کریں گے اور ہمارا ارادہ ہے کہ شرح سود کو اور گھٹا کر ملک کے بڑے بڑے اداروں کی شرح سود کے برابر کر دیں۔

اس وقت بنک کی شرحِ سود اس قدر کم ہو گئی ہے کہ متوسط الحال روپیہ لگانے والوں کے لئے اس میں کافی تحریص باقی نہیں رہی اس لئے ہمیں نئی شرح مقرر کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ لوگوں کا رجحان بنک کے بجائے کسی دوسری طرف نہ ہو جائے۔

ہم نے اکثر حالتوں میں شرح سود کی کمی سے قرض لینے والوں کو بھی مستفید کیا ہے اور قرضے کی شرح سود گھٹا دی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا اثر ہمارے منافع پر پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں جو فائدہ اپنے گاہکوں کی خوشنودی کی صورت میں ہوگا اسے ہم بنک کی مقبولیت کے خیال سے زیادہ اہم اور مفید سمجھتے ہیں۔

۱۹۳۲ء سے لے کر اب تک جو طریقہ ہم نے روپیہ لگانے کے متعلق اختیار کر رکھا تھا وہ معقول فائدہ دیتا رہا۔ لیکن گزشتہ مالی سال بین الاقوامی جھگڑوں کی وجہ سے کاروباری معاملات پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ جنگ اور جنگ کے امکانات نے سامان تجارت کی قیمتوں پر ایسا برا اثر ڈالا کہ ابھی تک کاروبار باوجود امریکہ اور برطانیہ کی بہترین کوششوں کے اس صدمے سے پوری طرح نہیں سنبھل سکا۔ آج بھی جنگ جدل کی تاریک گھٹائیں کرۂ ارض کے طول و عرض پر منڈلا رہی ہیں اور

ہمیں معلوم نہیں کہ مستقبل کے پردے میں ہمارے لئے کیا کچھ پوشیدہ ہے، ہمارے بیلنس شیٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر جنگ کی صورت میں کوئی خاص افتاد نہ آ پڑی جو عام تجارتی کساد بازاری کا باعث ہوگی تو ہمیں آیندہ سالوں میں بھی ایسے ہی خوش گوار نتائج کی توقع رکھنی چاہیے۔

ہمارے گاہکوں کی یہ عام خواہش تھی کہ نئی دہلی میں بھی ایک شاخ کھولی جائے۔ چنانچہ جیسا کہ ڈائرکٹروں کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔ گزشتہ مارچ کے مہینے میں اورینٹل انشورنس کمپنی لمٹیڈ کی نئی عمارت واقع کوئنس وے روڈ میں دفتر کھول دیا گیا جو نہایت کامیابی کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ اب بورڈ کے سامنے دو ماتحت دفاتر کھولنے کی تجویز زیر غور ہے۔ جن میں سے ایک صدر بازار میں اور دوسرا چاندنی چوک میں ہوگا۔

سالنامہ ادبی دنیا لاہور
قیمت ایک روپیہ چار آنہ
سالانہ چندہ پانچ روپیہ
ادارۂ تحریر
صلاح الدین احمد
بی۔ اے
میراجی
عاشق حسین بٹالوی
بی اے ایل ایل بی
محمد شریف کاتب

ادبی دُنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	سالنامے کی تصویریں	تہیہ راجی	۲۴
۲	بزم ادب	صلاح الدین احمد	۳۴

افسانے اور ڈرامے

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۳	جنّت اور جہنم	جناب کرشن چندر ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۵۴
۴	نفرت	پروفیسر سید فیاض محمود ایم۔ اے	۶۵
۵	من کی من میں	جناب راجندر سنگھ بیدی	۸۲
۶	سنت تکارام (ڈرامہ)	صلاح الدین احمد	۹۰
۷	روشنی کی کرن	عاشق حسین بٹالوی	۱۰۵
۸	پنگھٹ	جناب وقار انبالوی	۱۱۸
۹	کیمیا گر	جناب شبّیر حسن بی اے	۱۲۹
۱۰	ایک اتوار (ڈرامہ)	پروفیسر سنت سنگھ ایم اے	۱۴۵
۱۱	مسافر	جناب ایم۔ بقایا	۱۵۴
۱۲	خام مواد	جناب اختر انصاری	۱۶۸
۱۳	قبرستان کی ساحرہ	جناب طاہر قریشی	۱۷۳
۱۴	ایک شوہر کا روزنامچہ	جناب مہر محمد خاں شہاب	۱۸۹
۱۵	ایک حادثہ	جناب مجید لشاری	۲۰۱
۱۶	کنال (ڈرامہ)	جناب اندر لال داس قمر (مقیم لندن)	۲۱۷
۱۷	فرشتہ	جناب سراج الدین احمد نظامی	۲۳۴
۱۸	بدلا ہوا زمانہ (ڈرامہ)	جناب راجہ فاروق علی خاں	۲۵۳
۱۹	کاکی	جناب چندر بھوشن سنگھ آزاد	۲۷۳

اندرونی صفحات گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں اور ٹائٹل و تصاویر وکٹوریہ پریس لیے روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر چھپ کر شائع ہوئیں۔

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ

علمی و ادبی مضامین

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۲۰	[illegible] دیہاتی اور [illegible] کے گیت	میراجی	۴۱
۲۱	شعر میں [illegible]	پروفیسر فیض احمد ایم اے	۶۲
۲۲	[illegible] کا ایک اردو شاعر	جناب پیارے لال شاکر میرٹھی	۷۳
۲۳	عہد مغلیہ میں فنون لطیفہ	علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی	۱۱۳
۲۴	جاپانی لڑکیوں کا [illegible]	جناب سید نور الحسن برلاس (پروفیسر جامعہ ٹوکیو)	۱۲۴
۲۵	قدیم ہندوستان کی معاشی حالت	جناب سید بادشاہ حسن بی اے	۱۳۷
۲۶	[illegible] کی موت	جناب شہنشاہ حسین رضوی	۱۶۲
۲۷	یورپ کا [illegible]	جناب چارلس پطرائش	۱۸۱
۲۸	انور کا انجام	جناب مظفر احمد	۱۹۴
۲۹	تورودت	جناب پیارے لال شاکر میرٹھی	۲۰۹
۳۰	سورج کا زوال	جناب بسنت سہائے	۲۴۲

حصہ نظم

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۳۱	دعا	جناب خواجہ عبد السمیع پال آثر صہبائی۔ ایم اے۔ ایل ایل بی	۳۳
۳۲	سال کی آخری رات	جناب مہر لال سونی ضیا فتح آبادی۔ ایم اے	۴۰
۳۳	غزل	جناب اسد ملتانی	۵۱
۳۴	چاند اور سورج	جناب سید علی منظور	۵۲
۳۵	ستار	علامہ محمد حسین عرشی امرتسری	۶۰
۳۶	چھائی کالی رات	پنڈت اندرجیت شرما	۶۱
۳۷	مقصد حیات	جناب روشن دین تنویر بی اے۔ ایل ایل بی	۶۴
۳۸	ساقی نامہ	جناب قیوم نظر بی اے	۷۰
۳۹	رباعیات	جناب سید احمد اعجاز بی اے	۷۹، ۸۷، ۱۲۷، ۱۳۵
۴۰	فردا کی امید	جناب مہر لال ضیا فتح آبادی	۸۰
۴۱	تجلیات	جناب چودھری جلال الدین اکبر بی اے (آنرز)	۸۱
۴۲	غزل	جناب حکیم سید الطاف حسین آزاد انصاری	۸۸

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۴۳	غزل	جناب اختر شیرانی	۸۹
۴۴	ایک شاعرِ جواں مرگ سے	جناب تابش صدیقی بی اے	۱۰۴
۴۵	معراجِ تغزّل	علامہ عاشق حسین سیماب اکبرآبادی	۱۱۱
۴۶	سوچ	پروفیسر فیض احمد ایم اے	۱۱۲
۴۷	سرگوشیاں	میراجی	۱۱۶
۴۸	اندیشہ ہائے دور و دراز	جناب ظہیر الدین احمد ایم اے	۱۱۷
۴۹	غزل	جناب احمد علی شاد عارفی	۱۲۱
۵۰	غزل	جناب کشفی ملتانی	۱۲۲
۵۱	بارش کے بعد پرندوں کی کیفیت	جناب مرزا عباس بیگ محشر	۱۲۳
۵۲	اعجازِ تغزّل	جناب اعجاز حسین اعجاز صدیقی	۱۲۸
۵۳	کلامِ فراق	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق۔ ایم اے	۱۳۶
۵۴	باقیاتِ فانی	جناب شوکت علی خاں فانی بدایونی	۱۴۲
۵۵	چاندنی اور سلئے	جناب ساقی	۱۴۳
۵۶	پیامِ زیست	جناب سکندر علی وجد ایم۔اے	۱۵۳
۵۷	گاؤں کی صبح	جناب احمد ندیم قاسمی بی اے	۱۵۹
۵۸	نعرۂ عشق	جناب خاور (سہام)	۱۶۶
۵۹	دیوانہ	جناب باقی صدیقی	۱۷۲
۶۰	شعورِ تحت الشعور	جناب سید احمد حسین امجد حیدرآبادی	۱۷۷
۶۱	نکہت	جناب راجہ مہدی علی خاں	۱۸۸
۶۲	غزل	جناب نذیر احمد خاں مرغوب ایم اے	۱۸۸
۶۳	نوائے بیگانہ	جناب مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی	۱۸۰
۶۴	غزل	جناب حفیظ ہوشیارپوری ایم اے	۱۸۷
۶۵	التفاتِ حسن	جناب ساغر نظامی	۱۹۳
۶۶	شاعر کی راتیں	جناب علی احمد	۱۹۸
۶۷	جوانی	جناب ملک مراتب علی خاں تائب	۲۰۶
۶۸	توہمات	جناب عبدالحمید، حمید عرفانی۔ ایم اے	۲۱۵
۶۹	غزل	جناب مسعود شاہد ایم۔اے	۲۱۵
۷۰	چلی گئیں	جناب قیوم نظر بی اے	۲۱۶
۷۱	باغِ نسیم	جناب روش صدیقی، جوالاپوری	۲۳۱

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۷۲	تنبیہات	جناب خان اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی	۲۳۳
۷۳	غلاف عید ولادت	جناب تخت سنگھ بی اے	۲۴۱
۷۴	کشمکش	جناب احسان دانش	۲۴۹
۷۵	ریل کے سفر میں	جناب ماہر القادری	۲۵۰
۷۶	غزل	جناب شہید ابن علی	۲۹۶
۷۷	نشاطِ عشق	جناب ضمیر جعفری بی اے	۲۶۱
۷۸	جذبۂ محبت کی شکایت	جناب فطرت واسطی	۲۷۵
۷۹	محبت اور غلطی	جناب سراج الدین ظفر	۲۷۵

سالنامے کی تصویریں

اس دفعہ سالنامے کی تصویروں میں ایک دو باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ رنگین اور سادہ تصاویر رسالے کی تمام وسعت پر پوری طرح حاوی ہوں۔ مغربی آرٹ کے پہلو بہ پہلو مشرقی موقلم کی رعنائیاں بھی کسی صورت کم نہ رہ جائیں۔ مصوری کے ساتھ ہی فوٹو آرٹ کے نمونے بھی موجود ہوں اور اس کے علاوہ مقالات کی دلچسپی اور وضاحت کو بڑھانے کے لئے متعلقہ موضوعی تصاویر بھی شامل کی جائیں۔

جس نقطۂ نظر کو انتخاب میں ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا اسی نقطۂ نظر سے ہم تکمیلِ کار کو جانچنے کے لئے تمام تصویروں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

۱۔ **کیف شباب** (خان بہادر عبد الرحمٰن چغتائی) کا عمل ہے۔ اس جگہ حضرت چغتائی کے مخصوص فن قلم کاری سے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ خطوط اور رنگوں کی نزاکت اور نفاست امتزاج کی بے انتہا تعریف کرنا پڑتی ہے۔ میر تقی کا مشہور شعر ہے ؎

کیفیت اس کے لب کی کہوں کیا، پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اسی غزل کا مقطع ہے ؎

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

جس طرح میرؔ نے شاعری کے ذریعے سے ان دو شعروں میں صرف ہونٹوں اور آنکھوں کے ہی بیان سے جوانی کا ایک کیف انگیز نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے اسی طرح چغتائی کے مشاق قلم نے مصوری کے ذریعے سے اس تصویر میں صرف ہونٹوں اور آنکھوں ہی کو نمایاں کر کے کیفِ شباب کا ایک مکمل سماں باندھ دیا ہے۔"

۲۔ **تخلیقِ نغمہ** ۔ برندابن کے گوالے کا مغربی تصور ہے۔ دیوتا مین نغمہ سرائی میں محو ہے اور اس کی شہنائی خیال انگیز نغمے پیدا کئے جا رہی ہے۔ جن کے نغمہ نواز کے لئے جنگل میں منگل بن گیا ہے۔

۳۔ **مغل شہزادی** ۔ موضوع ایک شہزادی ہے۔ لباس کی نفاست اور جمال آرائی سے مغل بادشاہوں کے درباری تمدن، اور جاہ و حشم اور دنیوی قوت کی فراوانی کے باوجود مذہب سے ان کی دل بستگی کا اظہار ہوتا ہے لیکن مصوری

سلسلے کے لئے صفحہ ۲

ایک بہتر سگریٹ
کیوں پیا جائے
پاسنگ شو
Smoke
PASSING SHOW CIGARETTES
much better for your health

(صفحہ ۲۴ سے آگے)
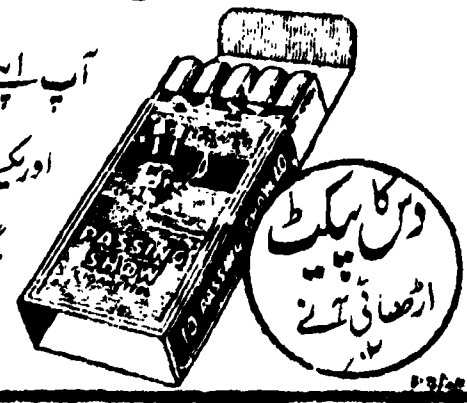
کے لحاظ سے شہزادی کی بہ نسبت پشتانہ یعنی دیوار کے نقش و نگار زیادہ توجہ کے طالب ہیں اور دیوار کے نقش و نگار پر غور کرنے سے مغل بادشاہوں کی فنون لطیفہ میں بلند ترقیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

۴۔ **حرم کے باغیچے میں** ۔ قدیم ترکی فضا ہے لیکن مصور مغربی ہے۔ جے ایف لیوس کی یہ تصویر مہاراجہ گائیکواڑ بڑودہ کے ریاستی نگار خانے میں موجود ہے۔

۵۔ **ماندگی** ۔ ایڈورڈ ای سائمنز کی یہ تصویر سٹی آرٹ میوزیم سینٹ لوئیس میسوری (امریکہ) میں موجود ہے۔ اس تصویر کی ہر چیز سے غربت کی مشقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ بڑا بچہ بستر پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی گود میں ایک اور چھوٹا بچہ ہے۔ عورت چقندر چھیلتے چھیلتے تھک گئی ہے اور ماندگی کی وجہ سے اس پر نیند نے غلبہ پا لیا ہے۔

۶۔ **موجِ رقصاں** ۔ یہ تصویر پنجاب کے نوجوان مصور لیٹھور سنگھ کا تخیل ہے قدیم ہندوستان کے برہمنوں نے سمندر کے سفر کو مذہبی لحاظ سے ممنوع قرار دے دیا اور اس ممانعت کا اثر ادب اور آرٹ پر بھی پڑا۔ اسی وجہ سے شاعروں اور مصوروں کے لئے سمندر اور بحری موضوعات ذیلی حیثیت اختیار کر گئے لیکن مغربی قوموں کے لئے ابتدا ہی زمانہ سے سمندر ایک زبردست تحریکِ طبعی رکھتا ہے۔ ہندوستان بھی مغربی اثرات کے ماتحت اب نئے نئے موضوعات کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ یہ تصویر نئے رجحانات کا ایک کامیاب اظہار ہے۔ مصور نے سمندر کی گوہر ریز، بپھرتی اور بل کھاتی ہوئی موجوں کو مجسم صورت میں پیش کر دیا ہے۔ "موجِ رقصاں" کے نسائی استعارے سے ہندوستانی مصور کی شاعرانہ افتادِ طبع بھی مترشح ہے۔

۷۔ **ساقی نامے کے ساتھ** ہالدار کی تصویر دیپک راگ ایک خاص نسبت رکھتی ہے۔

۸۔ **کنول** اور ۹۔ **"پن گھٹ"** پر بھی ہالدار ہی کے قلم کا کمال ہیں۔ کنول کے پھولوں کا حسن صفحۂ کاغذ سے جس نفاست کے ساتھ پھوٹ رہا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ "پنگھٹ پر" دیہاتی زندگی کا ایک مطالعہ ہے لیکن یہ مطالعہ محض خطوط کی ایک ہلکی سی قید کا پابند ہے۔

۱۰۔ **رادھے شیام** ۔ موزو مدار نے رادھا اور کرشن کے رومان کو جو حقیقت میں روحِ انسانی اور معبود کے ملاپ کا استعارہ ہے بہت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۱۱۔ **سہاگ رات** ۔ آنند کمار سوامی کے مجموعۂ تصاویر میں سے ہے اور قدیم راجپوت مصوری کا نمونہ ہے۔ رادھے شیام اور سہاگ رات، ان دونوں تصویروں کا تعلق ودیاپتی کے مضمون سے ہے۔ ممکن ہے کہ ودیاپتی کے گیتوں کی مذہبی نوعیت سے ہم اپنا ذہن فکر انگیز موضوع کی طرف مائل ہو جائیں کہ کیا یہ دنیا ایک حقیقت ہے یا فریبِ حقیقت۔ کیونکہ اس کی ہر بات ہمیں مبہم سے اشارے کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہی اشارے ہمیں ایک اور حقیقت سے دوچار کر دیں گے؟ لیکن یہ اشارے تو ہمیں ایک دھندلا سا منظر دکھاتے ہیں کہیں ہم اس دھندلکے کی خیال انگیزی میں پڑ کر حقیقت سے دور ہی نہ ہو جائیں؟ —— یہی مقام ہے جہاں ادب اور آرٹ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں باقاعدہ اور اچھے راستے دکھا سکتے ہیں۔ آرٹ اور مذہب میں ایک قدیمی تعلق ہے بلکہ قریباً ہر آرٹ کی ابتدا اور بنیاد مذہب ہی کی مرہون ہے۔

۱۲۔ **سایہ** ۔ اس تصویر کی خوبی کا انحصار تیرے کی چابکدستی کی بہ نسبت زیادہ تر خیال پر ہے "سایہ" جھاڑی کا سایہ بھی ہے۔ اور ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا گھیرے دار گاؤن بھی ہے۔ اس نسائی نسبت نے جھاڑی کی سادگی اور روکھے پن میں بھی ایک دلکشی پیدا کر دی ہے۔ فوٹو آرٹ کا یہ نمونہ نیویارک کے اڈولف فیس بنڈر کا مرہونِ منت ہے۔

۱۳۔ **نسائیت** ۔ دنیا ہمارے ناموں اور چہروں ہی سے مانوس ہے۔ ہماری اندرونی زندگیاں اس کے لئے پُراسرار عجائبات ہیں۔ صورت دیکھ کر سیرت کا اندازہ ایک مشکل بلکہ ناممکن سا کام ہے لیکن اس صورت سے موضوعِ تصویر کی پُروقار طبیعت صاف ظاہر ہے۔ اس دنیا میں اَن گنت اور مختلف چہرے موجود ہیں لیکن ان ہی میں ہمیں کبھی کبھی کوئی ایسی صورت بھی دکھائی دے جاتی ہے کہ اس کو دیکھ کر ہم بہت ہی بلند خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ ایسی صورتیں ہمیں بلند خیالات کی طرف اس لئے نہیں لے جاتیں کہ ہمارے احساسات ان سے دھوکا کھا جاتے ہیں بلکہ یہ صورتیں اپنے اندر ایک طرح کا الہامی انداز پنہاں رکھتی ہے۔ یہ حسنِ اتم اور حقیقتِ کبریٰ کی ایک جھلک ہوتی ہیں۔ اور اس جھلک کو ہم اس اندھیرے سایوں والے غار سے دیکھتے ہیں جسے ہم اپنی زندگی کہتے ہیں۔ دنیائے فانی پکارتے ہیں۔ اس تصویر کا بنانے والا چیکوسلوویکیہ کا ایک فن کار گریٹے پوپر ہے

۱۴۔ حسنِ منتظر۔ یہ تصویر مشہور ایکٹریس ریکول ملر کا ایک عکس ہے لیکن محض ایک عکسی تصویر ہی نہیں بلکہ اپنے اندازِ پیش کش کے لحاظ سے فوٹوگرافی کے آرٹ میں شمار ہونی چاہیے۔ اس خیال انگیز تصویر کو دیکھ کر ہم سوچتے ہیں کہ کیا اس دنیا میں اس عورت کا کوئی بھی ساتھی نہیں ہے اور یہ ہمیشہ یونہی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی اس انتظار میں رہتی ہے کہ کوئی [illegible] وہ درحقیقت منتظر لباس مجازی میں اسے دکھائی دے جائے [illegible] کوئی دوست ابھی ابھی اس کے پاس سے گیا ہے اور یہ اس کو راستے پر جاتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ شیشے کی شیشہ میں باہر محو ہوتی ہے [illegible] ہے اور ابھی تک وہ نہیں آیا۔۔۔ جوں جوں آپ تصویر کو دیکھتے رہیں گے اس قسم کے مختلف خیال آپ کے ذہن میں آتے جائیں گے اور آپ رفتہ رفتہ اس نازک اضمحلال کی تہہ تک پہنچتے جائیں گے جس کا اظہار اس کے ملال انگیز چہرے سے ہو رہا ہے۔ کیا غالب کا یہ شعر آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہے؟ ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ ۔ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

۱۵ و ۱۶۔ کاروانِ حیات۔ پہلی اور آخری منزل۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ جوانی کے تکلفات پرست ہیں سو کیونکہ جوانی تو ایک ایک کر کے مختلف صورتوں کو آزما رہی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی اصلی صورت کو پا لے۔ پیدائش سے موت تک کا عرصہ ایک سفر کی مانند ہے۔ آغاز میں ہر دن نئی خوشیاں اور نئے تجربات لاتا ہے اور آیندہ زندگی کے رومانوی امکانات کی کوئی حد ہی دکھائی نہیں دیتی۔ اور موت تو ایک بہت ہی دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں گویا سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ سائے لمبے ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ذرا فاصلے پر ایک منحوس پیامی کی صورت دکھائی دے جاتی ہے۔ لیکن یہ ناپسندیدہ صورت روزانہ قریب ہی آ رہی ہوتی ہے اور آخر دنوں کا گزرنا یوں محسوس ہوتا ہے گویا کسی فرضی مالا پر کسی غیبی ہاتھ کی انگلیاں منکوں کو ایک ایک کر کے گراتی جا رہی ہیں اور چہرے پر یہ ہر روز ایک آدھ جھری زیادہ کر دینے والا قرار جاری رہتا ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ زندگی ایک اندھی طوفانی دھارا میں بہتا ہوا ایک تنکا محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اچانک ایک روز سفر پورا ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ نیویارک پر ایک طائرانہ نظر۔ قدیم بادشاہوں کی قوت اور جاہ و حشم کا اظہار اُن کے درباروں اور جلوسوں کی شان و شکوہ سے ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب نہ وہ بادشاہ رہے۔ نہ اُن کی وہ باتیں۔ اب تہذیبِ جدید کی قوت و عظمت کا اظہار نئے طریقوں سے ہوتا ہے۔ آج کل کے مغربی شہر اور خصوصاً نیویارک تہذیب و تمدنِ جدید کا ایک امتیازی نمایندہ ہے۔ یہ تصویر اس ہیبتناک شہر کا ہوائی منظر ہے۔

۱۸ و ۱۹۔ دو مطالعے۔ دو سادہ سے چہرے ہیں لیکن چہروں کے انفرادی نقوش کو فوٹوگرافی کے فن کار نے امتیازی طور پر نمایاں کر دیا ہے۔

۲۰۔ شیشے کے اُس طرف۔ پیرس کے ایک فن کار سوجینز کا کمال ہے۔ بچوں کی دلچسپی کی خاص چیز ہے جب ہم اس تصویر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نہ صرف شیشے کے آر پار دکھائی ہی دیتا ہے بلکہ شیشے کی سختی بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

۲۱۔ رقصِ بہار۔ دور درختوں کے پار پانی ہی پانی ہے۔ اِس طرف فضائے قریب میں گھاس پھوس پر چند نازنینیں ایک رقص میں محو ہیں۔ گویا بُت بنی کھڑی ہیں۔ درختوں سے بہار کے آثار ہویدا ہیں اور ناچنے والیوں کے بازو دعائیہ شکرانے کا اظہار کر رہے ہیں۔

۲۲۔ ساحلِ سنگلدیپ کی ایک صبح۔ لنکا رومان انگیزی کے لئے زمانۂ قدیم ہی سے مشہور ہے۔ یہاں کے افسانے۔ یہاں کی معاشرت اور یہاں کے مناظر اب بھی ہمیں اُس پرانی خالص تہذیب کے بچے کھچے نشانات سے واقف کر سکتے ہیں۔

۲۳۔ جشنِ سحر اور پھول۔ یہ تصویر مشہور جرمن امریکن ایکٹریس مارلین ڈیٹرش کی عکسی تصویر ہے اور اپنے عنوان سے اپنی آپ وضاحت ہے اور فوٹوگرافی کے آرٹ کا ایک اچھا نمونہ پھولوں ٹہنیوں اور عورت کے چہرے پر روشنی کے ہلکے انتشار سے صبح کا لطیف اظہار ہو رہا ہے۔

۲۴۔ انور پاشا۔ ۲۵۔ کمال اتاترک اور ۲۶ وہ جگہ جہاں انور پاشا کا قتل ہوا۔ یہ تینوں تصویریں مظفر احمد صاحب کے دلچسپ مضمون "انور کا انجام" سے متعلق ہیں۔

۲۷۔ سراجیوو کے بازار میں۔ ۲۸۔ حکایات و معاملات۔ ۲۹۔ سراجیوو کا ایک اسلامی محلہ اور ۳۰۔ سراجیوو کے رومیو کا سرودِ شبانہ یہ چاروں تصویریں مسٹر چارلس پطراش کے مضمون "یورپ کا مکہ" سے متعلق ہیں۔

ان تمام تصاویر کے علاوہ آپ سالنامے میں ادبی دنیا کے اُن قلمی معاونین کی عکسی تصاویر بھی ملاحظہ فرمائیں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے گزشتہ دو سالناموں میں رونق افروز نہ ہو سکے +

میرا جی

میالون
پولینڈ کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر ... کی حیرت
انگیز ... کے استعمال سے ایک ماہ کے اندر اندر
خوبصورت گھنے اور لمبے بال پیدا ہو جاتے ہیں
قیمت فی شیشی ۳ روپے ۲ آنے علاوہ محصول ڈاک و پیکنگ
ہر جگہ سے دستیاب ہو سکتا ہے
MADE IN POLAND
Mia
SECOND WEEK
FOURTH WEEK
میا ایجنسی۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۱۵ بمبئی
... ایجنٹ:۔ للا برادرز۔ میکلوڈ روڈ۔
راولپنڈی:۔ جے۔ این ہتہ۔ ۲۵۔ کیننگ روڈ
لاہور:۔ ... برادرز۔ انارکلی بازار

اگر آپ
زندگی بیمے کے کام میں مستقل کامیابی حاصل کرنا
چاہتے ہیں
تو
آج ہی ہندوستان
کی مایۂ ناز بیمہ کمپنی
دی انڈسٹریل اینڈ
پروڈینشل آف بمبئی
کے چیف آفیسر برائے یو۔پی
دہلی پنجاب و صوبہ سرحد
لالہ پنڈی داس جی
یا ان کے مندرجہ ذیل دفاتر کے
سیکرٹریز سے ملاقات کا
انتظام کریں۔
INDUS
PRUDEN
PINDI DASS & CO
central office
پنڈی داس اینڈ کمپنی سنٹرل آفس پنڈی۔پنڈی داس بلڈنگ میکلوڈ روڈ۔لاہور
صدر بازار پشاور
کالج روڈ راولپنڈی
حسین آگاہی ملتان
ہال بازار امرتسر
چاندنی چوک دہلی
لاٹوش روڈ لکھنؤ
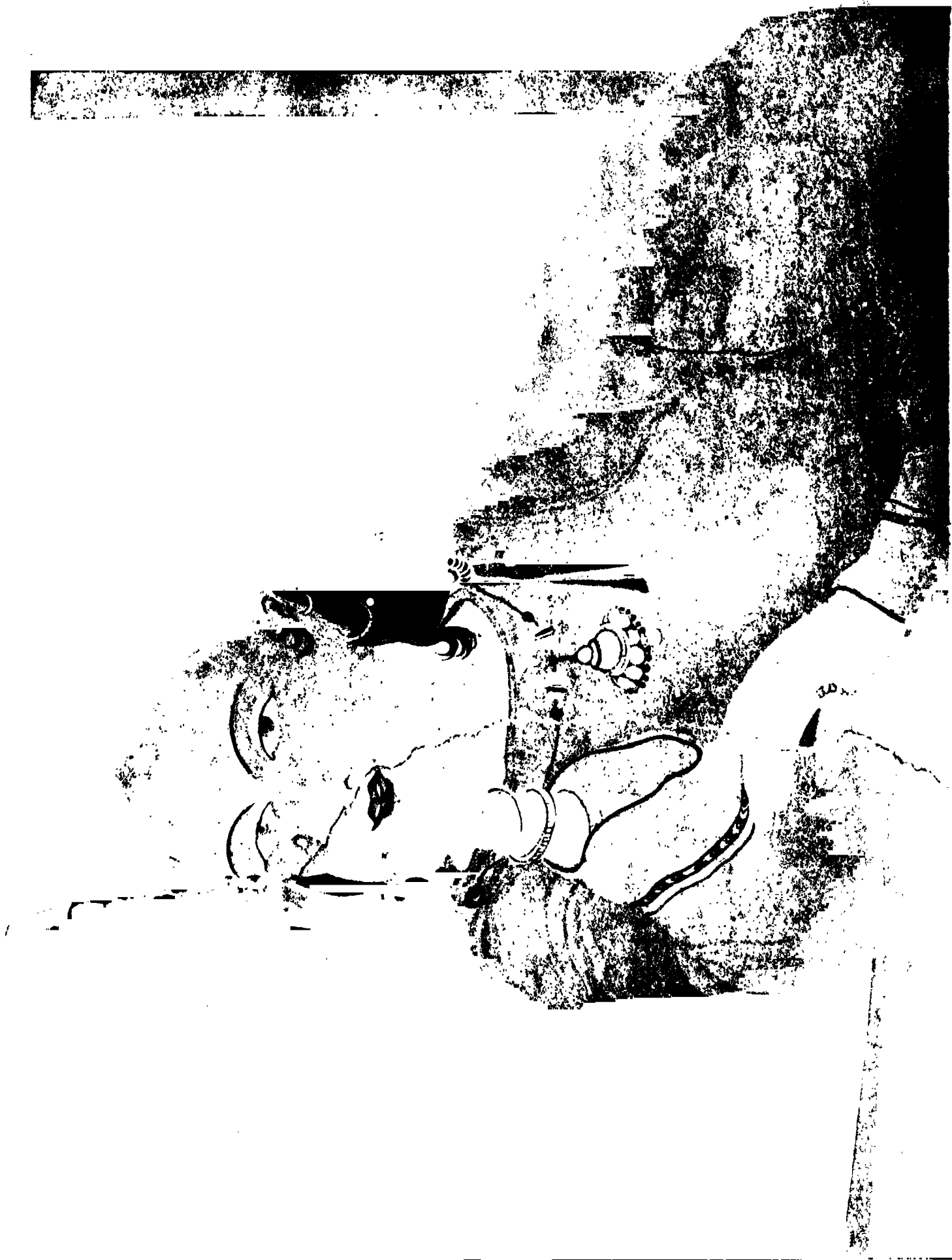
دُعا

تاریکیٔ باطل میں ہے مستور کہیں حق ۔۔۔ باطل پہ کہیں حق کا ملمع بھی چڑھا ہے
کام آتی نہیں شمع یہاں عقل و خرد کی ۔۔۔ کچھ بھی نظر آتا نہیں یہ کیا ہے! وہ کیا ہے!
پہچان سکوں جس سے کہ یہ حق ہے وہ باطل ۔۔۔ جلووں میں ترے کیا کوئی ایسی بھی ضیا ہے!
یارب مری آنکھوں کو وہ تنویر عطا کر!

ہنگامۂ باطل ہے بپا بزمِ جہاں میں ۔۔۔ جی میں ہے کہ ہنگامۂ باطل کو مٹا دوں
ہیں روئے حقیقت پہ جو تاریک سے پردے ۔۔۔ ان پردوں کو میں روئے حقیقت سے اٹھا دوں
ایسی کوئی شمشیر ترے پاس اگر ہے ۔۔۔ جس سے سرِ ابلیس کو اک دم میں اڑا دوں
یارب مرے ہاتھوں کو وہ شمشیر عطا کر!

مٹ جائے یہ بیداد، یہ ظلم اور جہالت ۔۔۔ معمور ہوں دل جذبۂ اخلاص و وفا سے
ہر لب پہ سلام اور دعا کے ہوں ترانے ۔۔۔ ہر آنکھ منور ہو محبت کی ضیا سے
وہ لطف ہو وہ کیف ہو، وہ وجد وہ مستی! ۔۔۔ یہ بزمِ جہاں رقص میں ہو ذوقِ دعا سے
یارب مری آہوں کو وہ تاثیر عطا کر!

معصوم جو ہو صبحِ بہاراں سے زیادہ ۔۔۔ تنویر میں جو ہو مہ و خورشید سے بڑھ کر
انوارِ صداقت کے ہوں ہر ایک کرن میں ۔۔۔ جو ہو مئے الفت کا چھلکتا ہوا ساغر
ہر آنکھ کو جس میں ترا جلوہ نظر آئے ۔۔۔ جو ہو تری تصویر کا آئینہ سراسر
یارب مجھے وہ اخترِ تقدیر عطا کر!

اثر صہبائی

بزمِ ادب

خداوندِ دوجہاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم ناظرینِ ادبی دنیا کی خدمت میں ایک ایسا سالنامہ پیش کر رہے ہیں جو ہر لحاظ سے اپنے پیشرو سالناموں سے ممتاز ہے۔ ادبی دنیا کی بنیاد ایسی مبارک گھڑی میں رکھی گئی تھی کہ اس کا جو قدم اٹھا ترقی ہی کی راہ پر اٹھا۔ مشکلات ہر ہر قدم پر کامیابی اور کامرانی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ توفیقِ الٰہی، ہمارے اہلِ قلم دوستوں کی بے غرض امداد اور ہمارے ناظرین کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ہماری تنہا کوشش اُس خارزار میں جسے نئی اُردو کا میدان کہتے ہیں، ہمیں کسی منزل پر بھی پہنچانے کے قابل نہیں تھی۔

ادبی دنیا کا دورِ جدید ۱۹۲۹ء کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور آج چھ سال کے بعد جب ہم ایک نگاہ اُس چھوٹی سی پگڈنڈی پر ڈالتے ہیں جو بل کھاتی ہوئی کبھی کسی شاداب سبزہ زار میں سے گذری ہے اور کبھی کسی گنگناتے ہوئے چشمے کے کنارے سے، اور جس پر چل کر آج زبان و ادب کا یہ خادم اپنی عمر کی ساتویں منزل میں قدم رکھتا ہے تو ہمارا دل ایک بے پایاں مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور ادبی دنیا کی وہ ناچیز خدمات جو اس نے اپنی اِس چھوٹی سی زندگی میں انجام دی ہیں، ایک ایک کر کے ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اور شاید اجمال کو بھی خودستائی پر محمول کیا جائے۔ اس لئے صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اردو میں نئے اسلوبِ بیان داخل کرنے، ہندوستان کی لنگوا فرینکا کے مسئلہ پر فیصلہ کن اور سیر حاصل مباحث شائع کرنے، دنیا کی دیگر زبانوں کے..... بہترین لٹریچر بالخصوص شاعری سے اردو کا دامن بھرنے اور تاریخِ ادب کے کئی فراموش شدہ اوراق کو از سرِ نو روشن کرنے میں ادبی دنیا نے جو کام کیا ہے وہ یقیناً اہلِ نظر کے لئے قابلِ توجہ ہے۔

ادبی دنیا کی ایک اور قابلِ ذکر خدمت یہ ہے کہ اس نے گذشتہ چند سالوں میں ایسے متعدد نوجوانوں کو دنیائے ادب میں روشناس کرایا ہے، جن کے اندازِ خیال کی رعنائیاں اور جن کے قلم کی جولانیاں ایک شاندار مستقبل کی نوید دیتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ کی برق رفتاری کے ساتھ ساتھ ادب بھی ترقی کر رہا ہے اور ہر زندہ ادب میں خیالات کے نئے نئے انداز اور بیان کے نئے نئے اسلوب داخل ہو رہے ہیں۔ اردو اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لئے اگر اسے زندہ زبانوں کے دوش بدوش رہنا ہے تو اس کی ادبی صحافت کا پہلا فرض یہی ہے کہ وہ اُس خام مواد کو جِلا دے دے کر ادب میں داخل کرتی چلی جائے جو دنیا کی جدید تحریکوں اور خیالات کے جدید انداز کے زیرِ اثر ہمارے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے دماغ میں پرورش پا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ اظہار اور بیان کے جو اصول اور حدود قواعد کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، نئے لکھنے والوں کو ایک معقول حد تک اُن کا پابند رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ ادب میں سیاسی "انارکی" کے مماثل کوئی صورتِ حالات پیدا نہ ہو جائے۔ بہرحال ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ادب کے جسم میں بھی اگر لگاتار نیا خون داخل نہیں کیا جائے گا تو اس کی نشو و نما رک جائے گی، اور جہاں یہ رُکی وہیں سے تنزل شروع ہو جائے گا۔ اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہئے کہ ہم خدانخواستہ اُن اُدباء کی قدر نہیں کرتے جن کی ادبی زندگی کا آغاز آج سے دس پندرہ یا بیس سال پہلے ہوا تھا۔ ہرگز نہیں۔ ہم انہیں سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہیں۔ البتہ ہم اس روش کو بہت نقصان دہ سمجھتے ہیں کہ ذمہ دار ادبی صحیفہ نگار چند بُت تراش لیں اور اپنے حلقۂ اثر میں اُن کی پرستش جاری کرا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جیتا جاگتا ادیب واقعی بت بن جاتا ہے اور اس کی ذہنی نشو و نما رک جاتی ہے اور وہ اپنا فرسودہ اندازِ خیال اور پامال طرزِ بیان اُس حلقہ پر ٹھونسے جاتا ہے جس میں اس کے پرستار مدیر نے اس کی پرستش جاری کی تھی اور سب سے بڑا نقصان پڑھنے والوں کا ہوتا ہے کہ اُن کا مذاق ترقی نہیں پاتا اور وہ ایک لمبے عرصے تک آگے بڑھنے کی بجائے ایک دائرے میں چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حالات کی بیشتر ذمہ داری ہم صحیفہ نگاروں پر ہے کہ شاید بت سازی و بت پرستی کی عادت ہمارے

رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو صنم تراش بت شکنی نہیں کر سکتا وہ کبھی اچھا بت ساز بھی نہیں بن سکتا! اپنے نگار خانوں کو رشکِ چین بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم انہیں نئی نئی من موہنی مورتوں سے سجائیں۔ ان مورتوں کا غازۂ رخسار ہم اپنے خون جگر سے بہم پہنچائیں اور ان کے لئے اپنے صنم کدوں میں عزت کی جگہ پیدا کریں۔ یاد رکھئے کہ جو نوجوان ہماری بزم میں آج حاشئے پر بیٹھے ہیں۔ کل وہی صدر نشین ہوں گے اور شاید برسوں اُنہیں نئے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے اور یہ کچھ ادب ہی پر موقوف نہیں آرٹ کے ہر شعبے کی زندگی کا یہی راز ہے!

ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ ہماری پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے اور اُمید ہے کہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ جہاں کہیں جوہر قابل کو دیکھیں اسے پلکوں سے اٹھا لیں۔ اُسے جلا دیں۔ اس کی تراش خراش میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیں اور پھر اسے موقعہ دیں کہ وہ اپنی آب و تاب سے نگاہوں کو خیرہ کرے۔ ادبی دنیا کے اوراق کہنہ مشق بلند پایہ اُدبا کے لئے ہمیشہ کھلے ہیں، وہ اگر نوازش فرمائیں تو دیدہ و دل فرش راہ۔ لیکن ہم اپنے تقاضوں سے اُن کا دم ناک میں نہیں کرتے۔ اگر کسی عالی مقام ادیب یا شاعر کو زبان و ادب کی کوئی خدمت دشوار معلوم ہوتی ہے تو ہم اُسے زیادہ تکلیف نہیں دیتے بلکہ اُس کی جگہ کسی ہونہار ادیب کو دے دیتے ہیں جو اپنے فکرِ نو سے ایک جہانِ تازہ پیدا کر دیتا ہے!

سالنامۂ زیرِ نظر ہماری اسی روش کا آئینہ دار ہے۔ اس میں آپ کو اساتذہ کے شاہکار بھی ملیں گے اور نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے نتائج طبع بھی۔ اور آپ دیکھیں گے کہ افکار کے اس حسنِ اتصال کے باعث اس محفلِ ادب میں تمکنت اور سنجیدگی کے ساتھ رعنائی اور دلفریبی بھی موجود ہے اور ہمارے لئے جہاں یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ بعض اُن نوجوانوں کے مضامین نظم و نثر جن کی ادبی زندگی کی نشوونما "ادبی دنیا" ہی کی فضا میں ہوئی۔ آج سالنامے کی زینت ہیں۔ وہاں ہمیں یہ محسوس کر کے بھی خوشی ہوتی ہے کہ ادبی دنیا میں لکھنے والے کسی ایک قوم یا طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارے ممتاز قلمی معاون بلا لحاظِ مذہب و ملت اپنی زبان و ادب کی خدمت میں ایک دوسرے سے پیش پیش ہیں۔ اب ہم مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

افسانے اور ڈرامے

کرشن چندر گرچہ عمر کے لحاظ سے ابھی بالکل نوجوان ہیں لیکن اُن کا آرٹ پختگی اختیار کر چکا ہے۔

جنت اور جہنم اُن کی اس پختہ کاری کا ایک شگفتہ نمونہ ہے۔ ویسے تو وہ اپنے افسانوں کے لئے جو مناظر انتخاب کرتے ہیں۔ اُن میں جان ڈال دیتے ہیں لیکن جب کبھی وہ اپنے کسی افسانے کا پس منظر اپنے ہمارے وطن کشمیر میں رکھتے ہیں تو ان کا قلم سچ مچ گلریزی کرنے لگتا ہے۔ "جنت اور جہنم" میں اس جنتِ ارضی کی وجد آفریں کیفیتوں میں جب وہ وہاں کی عسرت اور عسرت سے پیدا ہونے والی انسانی کمزوریوں کا عکس دکھاتے ہیں تو چشم تماشا سے خون کے آنسو اُبل پڑتے ہیں۔ جنت اور جہنم ایک بہت کامیاب افسانہ ہے اور بقول مصنف اُن چند افسانوں سے ہے جن پر انہوں نے خاص محنت کی ہے۔

سید فیاض محمود اردو میں سب سے بہتر معاشرتی افسانہ لکھتے ہیں اور گھر کی بہانی فضا کو جس خوبی سے وہ اپنے افسانے کے اوراق میں منتقل کرتے ہیں۔ وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ اس دفعہ انہوں نے **"نفرت"** کے عنوان سے ایک بے مثال افسانہ لکھا ہے اور متوسط طبقے کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے کی معاشرت کے ایک دل آویز پہلو کو بے نقاب کیا ہے۔ بھائی بہن کی نوک جھوک بے حد دلچسپ ہے اور سلطان کا کیرکٹر ایک نہایت غائر مطالعہ ہے۔

ہمارے نوجوان افسانہ نگار سردار راجندر سنگھ بیدی کے متعدد ایسے افسانے ہمارے ہاں چھپ چکے ہیں جن کا ماحول دیہات کی فضا میں رکھا گیا تھا۔ راجندر سنگھ کے افسانے اس فضا میں خوب "پھولتے پھلتے" ہیں۔ چنانچہ زیر نظر افسانہ "من کی من میں" بھی گاؤں کی سادہ معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن شہر ہو یا گاؤں انسانی جذبات کی شدت اور نیرنگی ایک ہی سی ہوتی ہے۔ "من کی من میں" اس تلاطمِ احساس کی ایک کامیاب تصویر ہے۔ "مادھو" کی انسانیت اور "کلکارنی" کی نسائیت کو فن کار کے قلم نے خوب اُبھارا ہے۔

عاشق حسین صاحب بٹالوی کا افسانہ "روشنی کی کرن" ان کے پاکیزہ ترین افسانوں میں سے ہے۔ عاشق صاحب کو ٹریجڈی سے بہت لگاؤ ہے۔ موجودہ افسانہ اگرچہ شروع ہی سے ٹریجڈی کی مقدس تاریکی میں ملفوف ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کی تیرہ و تار فضا دھندلکے میں تبدیل ہونا شروع ہوتی ہے اور آخر کار روشنی کی ایک ظلمت رُبا کرن سے جگمگا اٹھتی ہے۔ سعیدہ کا کیرکٹر ایک لطیف نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اور عاشق صاحب کے خود بین Subjective اندازِ خیال کی ایک بہترین مثال۔ زبان کی لطافت اور روانی۔ اور الفاظ کا فن کارانہ انتخاب حسبِ معمول اس افسانے میں بھی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔

ہمارے عزیز دوست وقار انبالوی المعروف بہ "دیہاتی" بجائے

خود ایک چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا گاؤں ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ دیہات کی معاشرت کی اُن سے بہتر تصویر شاید ہی کوئی اتار سکے۔ "پنگھٹ" اُن کی ایک المناک کہانی ہے جس کی بنیاد ایک دیہاتی دوشیزہ کی غم انجام محبت پر رکھی گئی ہے۔ پلاٹ سادہ ہے لیکن اس سادہ تصویر میں جذبات کی رنگ آمیزی قابل داد ولطافت اور چابک دستی سے کی گئی ہے۔ افسانہ نگار کا وہ پنچ جہاں وہ ... کو تعمیر کی شدت میں کنوئیں کی تہ ... پر کھڑے ... کس قدر تفصیل آفت سے بوٹے گنگناتے دکھاتا ہے۔ حقیقت میں آرٹ کی انتہائی بلندی پر جا پہنچا ہے۔

شبیر حسن صاحب لکھنوی نے "کیمیاگر" کے نام سے ایک بہت اچھا افسانہ لکھا ہے اور کیمیا جیسے پامال موضوع پر اس کی تعبیر ایسی ندرت اور خوبی سے کی ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ افسانہ کے ہیرو علم سے زیادہ قابل توجہ کیرکٹر اس کی بیوی مفلس کا ہے۔ جو نسائیت کی ایک مثالی تصویر ہے سلائی کی مشین خریدنے کی آرزو میں مہینوں تک اس کے پمفلٹ پڑھ پڑھ کر ذہب نفس میں مبتلا رہنا۔ انسانی زندگی کی کیسی تلخ لیکن کس قدر سچی کیفیت۔

ہمارے دوست ایم ہنس راج ... کا پراسرار افسانہ "مسافر" اپنے اندر جو لطافتیں اور فن کی باریکیاں پنہاں رکھتا ہے۔ انہیں سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ نوعمر ... اپنے نوجوان کندھوں پر ایسا پختہ سال سر کیونکر اٹھائے پھرتا ہے۔ مسافر کی کہانی پڑھئے اور پھر سوچئے کہ وہ کون تھا۔ بیزبانہ کا شوہر؟ اس کی روح؟ اشوک؟ یا محض ایک مسافر؟

خام مواد جناب اختر انصاری کے نتائج طبع میں سے ہے لیکن بہت "پختہ" ہے۔ اختر صاحب اگرچہ علی گڑھ میں رہتے ہیں لیکن دہلی کی نکھری ہوئی زبان لکھتے ہیں۔ افسانہ نگار کی دنیا اور حقیقی دنیا کے فرق کو اختر صاحب نے جس نرالے انداز میں ظاہر کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔

یہ تو ہوئے طبعزاد افسانے۔ اب آگے دنیا کی دیگر زبانوں کے چند بہترین افسانوں کے ترجمے ہیں۔ "ایک شوہر کا روزنامچہ" اور "کاکی" ہندی سے "ایک حادثہ" اور "قبرستان کی ساحرہ" فرانسیسی سے اور "فرشتہ" روسی سے لیا گیا ہے۔

"کاکی" مختصر افسانہ نویسی کی ایک انتہائی مثال ہے جسے ہمارے دوست چندر بھوشن سنگھ آزاد نے ہندی کے مشہور شاعر شیارام سرن گپت سے حاصل کیا ہے اس ایک صفحے کی کہانی میں افسانہ نگار نے ایک چھوٹے سے بچے کے ننھے منے جذبات اور سنہری تخیل کی ایک نازک اور پیاری سی تصویر کھینچی ہے۔ ایسے افسانے ہمارے ہاں کم یاب ہیں۔ ضرورت ہے کہ اردو کے افسانہ نویس اس قسم کے خام مواد پر زیادہ توجہ کریں۔

شوہر کا روزنامچہ ہمارے دور افتادہ کرم فرما مہر محمد خاں صاحب شہاب نے شریمتی رام شری نہرو کی ہندی سے لیا ہے۔ ترجمہ نہایت دل آویز ہے اور افسانہ دور حاضر کی معاشرتی الجھنوں کا ایک نہایت دلچسپ مرقع۔ انسان کبھی اپنی حالت پہ مطمئن نہیں ہوتا۔ گذشتہ نسل کے شوہر چاہتے تھے کہ ان کی بیویاں چراغ خانہ بن کر رہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور اشغال میں دخل نہ دیں۔ موجودہ نسل کے رجحانات اس کے برعکس ہیں۔ آج کل کے شوہر "بیویاں" چاہتے ہیں۔ دیویاں نہیں۔ انہیں رفاقت کی ضرورت ہے عبادت کی نہیں۔ اس بدلتے ہوئے دور میں تعلقات زن و شوہر کے سلسلہ میں جو ایک اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ یہ روزنامچہ اس کا آئینہ دار ہے۔ اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ معاشرت کے جسم کی اس پھڑکتی ہوئی نبض پر اگر انگلیاں رکھی ہیں تو ایک عورت ہی نے رکھی ہیں اور شریمتی نہرو نے سوشل بے چینی کے ایسے دلپذیر اظہار سے سماج کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

حادثہ۔ مجید لبشاری صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے لبشاری صاحب پہلی مرتبہ ہماری بزم میں شریک ہوئے ہیں لیکن جو چیز وہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کا درجہ نفس مضمون اور زبان دونوں کے اعتبار سے کافی بلند ہے فرانسیسی ادب میں عموماً اور فرانسوا کوپے کے ہاں خصوصاً افسانے میں جو ڈرامائی عمل (ایکشن) پایا جاتا ہے۔ وہ اس افسانے میں خوب نمایاں ہے

فرشتہ خاص روسی طرز کی ایک لاجواب کہانی ہے جو اپنی نرمی اور سوز کے باعث لیونڈ اینڈریف کی کہانیوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ زمانہ قبل از انقلاب کے روسی افسانہ نگاروں کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے اپنے افسانوں کے جلی نقوش بہم پہنچا لیتے ہیں۔ اور پھر ان نقوش سے ایک ایسا ماحول تیار کر لیتے ہیں جو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور انہیں خود میں جذب کر لیتا ہے۔ فرشتہ میں روسی افسانہ کی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

سراج الدین احمد صاحب نظامی ایک شگفتہ نویس ادیب ہیں۔ اور انہوں نے اس ترجمے میں اصل کی روح جوں کی توں برقرار رکھی ہے۔

ہمارے مخلص کرم فرما جناب طاہر قریشی موپساں کے

بے شمار افسانے اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ انہیں اس فرانسیسی فن کار سے
بے حد دلچسپی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حال ہی میں موپساں کے افسانوں
کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا ہے جو سحر فرانس کے نام سے دفتر ادبی دنیا کی طرف
سے شائع ہونے والا ہے۔ "قبرستان کی ساحرہ" میں موپساں کے آرٹ
اور طاہر صاحب کے ترجمے کے تمام محاسن موجود ہیں۔ افسانہ نویس کی
حسین مناظر سے دل بستگی اور افسانے کے ہیرو کی ان مناظر سے اثر پذیری،
افسانے کا تدریجی عروج اور پھر شدید بحران موپساں کی ممتاز خصوصیات
ہیں اور طاہر صاحب کے ترجمے کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ایک ایک لفظ کو اس
احتیاط سے چنتے اور رکھتے ہیں جیسے ایک سادہ کار کسی جڑاؤ زیور میں نگینے لگا
رہا ہو۔ افسانے کا پلاٹ بالکل اچھوتا اور بے حد دلچسپ ہے اور طاہر صاحب
کے ترجمے نے اس کی دلکشی میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اب لیجیئے ڈرامے ۔ ادبی دنیا کے ممتاز ڈرامہ نویس اندرلال
داس صاحب قمر آج کل ترقی تعلیم کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہیں اور ہمیں
مسرت ہے کہ سات سمندر پار جا کر بھی وہ ادبی دنیا کو نہیں بھولے۔ قمر
صاحب عموماً ایسے ڈرامے لکھتے ہیں جن کے کردار ہماری جدید بلکہ جدید ترین
سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں ہماری مغرب زدہ معاشرت کا
مضحکہ اڑانے میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ اب کہ وہ خود لندن
جیسے بلدۂ حسن و عشرت میں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر ایک شدید
بحران طاری ہو گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے انگلستان سے ہمیں جو ڈرامہ ارسال
کیا ہے وہ ہندوستانِ قدیم کے ایک واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ "کنال" کا
زمانہ مہاراج اشوک کا عہد اور اس کے مناظر پراچین بھارت کے مناظر
ہیں۔ مکالمہ نہایت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ ایکشن تقریباً معدوم ہے اور
جا بجا ایسے اشارات دیئے گئے ہیں جن سے آواز ہی آواز میں ایکشن کا کام
نکال لیا گیا ہے۔ اس لئے ریڈیائی نقطۂ نظر سے یہ ڈرامہ بہت قدر و قیمت
رکھتا ہے۔

نارورن ریویو کے ایڈیٹر پروفیسر سنت سنگھ ادبی دنیا میں پہلی مرتبہ لکھ
رہے ہیں لیکن ان کی پہلی چیز ہی فن کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہے۔ ان کا "ایک اتوار" ایک
لطیف معاشرتی ڈرامہ ہے گو ہم اسے ڈرامہ نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ
"پلے" کہہ سکتے ہیں بلکہ ذاتی طور پر تو میں اسے مکالمہ کہنا ہی پسند کروں گا۔ ناظرین
کو یاد ہو گا کہ پچھلے سالنامے میں پروفیسر فیاض محمود نے میاں بیوی کا ایک بے نظیر
مکالمہ "دس سال" لکھا تھا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ ایک اتوار بھی اسی قسم کا
مکالمہ ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع بالکل مختلف ہے "ایک اتوار" پڑھ کر آپ میں
سے بہت سے حضرات یہی محسوس کریں گے کہ پروفیسر سنت سنگھ آپ
کی خانہ داری کا سب حال دیکھ آئے ہیں اور اب اسے نشر فرما رہے ہیں۔

بدلا ہوا زمانہ، ہمارے نوعمر دوست راجہ فاروق علی خاں نے
لکھا ہے۔ اس کا انداز بھی ریڈیائی ہے۔ ایکشن کا کام مکالمے سے لیا گیا ہے
اور اس میں ڈرامہ نگار کو چنداں تکلف نہیں کرنا پڑا۔ ڈرامے کا مرکزی خیال
شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھنے کی وہ عام خواہش ہے جو ہر نوجوان کے
دل میں پائی جاتی ہے۔ یہ خیال اگرچہ نیا نہیں لیکن فاروق صاحب نے
اسے ایسی نفاست سے ادا کیا ہے کہ انہیں بے اختیار داد دینی پڑتی
ہے۔ اس ڈرامے کی ایک بہت بڑی اور قابل تعریف خصوصیت یہ ہے
کہ ڈرامہ نویس نے جو ایک مسلم نوجوان ہیں ہندو معاشرت کا گہری نگاہ
سے مطالعہ کیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے لڑکیوں کی فطری
بول چال اور چھیڑ چھاڑ کا ایسا صحیح چربہ اتارا ہے کہ ہمیں شک گذرتا ہے
کہ "بدلے ہوئے زمانے" کی شادی میں وہ خود لڑکیوں کا بھیس بدل کر زنان
خانے میں تو گھسے ہوئے نہیں تھے۔

سنت تکارام ۔ مشہور و معروف مصنف ہرندرناتھ چٹوپادھیا
کے انگریزی پلے کا ہندی آمیز اردو ترجمہ ہے جو اس کم فرصتی کے عالم میں
اس خاکسار کو کرنا پڑا۔ اگر پروفیسر حمید احمد خاں کا موعودہ مضمون وقت پر آ جاتا تو
اس کی نوبت نہ آتی۔ مگر انسان ہزار ہے قسمت کا لکھا پیش آ ہی جاتا ہے۔
پروفیسر صاحب موصوف کے لئے کچھ ورق مخصوص کر رکھے تھے اور وہ دسمبر
کے وسط تک خالی رہے۔ آخر مجبور ہو کر انہیں پُر کیا گیا۔

ترجمے کی نسبت تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا جیسا کچھ ہے آپ کے
سامنے ہے۔ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں کر دیا گیا ہے اور اس امر کا
حتیٰ المقدور خیال رکھا گیا ہے کہ الفاظ سے بے وفائی اور مطالب سے
غداری نہ کی جائے۔ ڈرامے کے آخری چار گیتوں کا ترجمہ میرے دوست
میراجی کے قلم کا مرہون ہے۔ انہوں نے جب مجھے دوسرے امور میں بے حد
مصروف دیکھا تو ازراہِ کرم آخری چار گیت مجھ سے لے لئے اور انہیں لکھ
ڈالا۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی موزونی طبع اور ہندی پر زیادہ قدرت رکھنے
کے باعث ان کے لکھے ہوئے گیت میرے گیتوں سے بہتر ہوں گے۔

خود ڈرامہ کی نسبت البتہ مجھے اس قدر ضرور عرض کرنا ہے کہ
پلے ہرندرناتھ چٹوپادھیا کا بہترین پلے ہے اور اس کی فضا اس قدر پاکیزہ

[illegible] خوبصورت ہے کہ ایک ملحد کے دل پر بھی کچھ دیر کے لئے خدائے بزرگ کی عالمگیر محبت کی چھاپ بیٹھ جاتی ہے۔ [illegible] کی جان تکارام کی بیوی اولالی کے وہ حوالے [illegible] جن میں وہ عدم پرستی کا مذاق اڑاتی ہے یا ایک عام دنیا دار کی روزانہ مشکلات کا چربہ اتارتی ہے۔ تکارام کے گیت ہندو صوفیانہ [illegible] کلام معرفت کی پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ [illegible] ہیں تو غضب ڈھانے ہوں گے۔ ہندوستانی میں جیسے کچھ لکھے جاسکتے ہیں آپ کے سامنے ہیں۔

علمی وادبی مضامین

ہمارے قدیم کرمفرما منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی نے اس دفعہ سالنامہ کے لئے دو نہایت بیش قیمت مضامین لکھے ہیں۔ "تورودت" اور "ملک الشعرا فراسو"۔ تورودت وہ [illegible] نوعمر شاعرہ جس نے انگلستان کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین وصول کیا اور جو ہر قابل لے کر پیدا ہوئی تھی کہ اگر اس کی عمر وفا کرتی تو خدا جانے اس کا کلام کن کن بلندیوں کو پہنچا دکھاتا۔ [illegible] دو خوال بیانات عام طور پر اس کے کلام کی خوبیوں سے بہت کم آشنا ہیں۔ شاکر صاحب نے اس مختصر مضمون میں ہمارے ناظرین سے شاعرہ کا تعارف کرایا ہے اور اس کے کلام کے چیدہ چیدہ نمونے نظم اور نثر میں پیش کئے ہیں۔

"جرمن نسل کا ایک اردو شاعر" شاکر صاحب کے اس سلسلہ مضامین کی ایک اہم کڑی ہے جو وہ فرنگی نژاد شعرائے اردو کے کلام اور حالات پر سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ یہ مضمون نہ صرف ایک خاص علمی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس سے اُس زمانے کے شرفا کی معاشرت کی ایک نہایت صحیح اور دلپذیر تصویر ہمیں حاصل ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں شاکر صاحب اردو کی تاریخ ادب کی چند نہایت اہم فصلیں جو مختلف وجوہ سے اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھیں، نہایت محنت سے از سرِ نو مرتب فرما رہے ہیں۔ فراسو کا کلام اس زمانے کے شاعروں کے کلام سے کسی حیثیت میں کم نہیں بلکہ بعض بعض شعر تو دل میں چٹکیاں لینے لگتے ہیں۔ مثلاً دیکھئے۔ میر کے رنگ میں کہتے ہیں ؎

جو آپ کی دوری میں دل پر مرے غم گذرا
فرہاد پہ کم گذرا مجنوں پہ بھی کم گذرا

ایک اور شعر ہے ؎ خوب نہیں اس قدر حسن پہ کرنا غرور
ے کے انگڑائیاں دیکھو ہو پرچھائیاں

مصرعہ ثانی میں جو کچھ شاعر نے بیان کیا ہے اس کی کیفیت اور ندرت احساس [illegible]

"وِدیاپتی اور اس کے گیت" میرا جی کے گہرے مطالعے اور دل آویز اندازِ بیان کا ایک شاہکار ہے۔ میرا جی کو ہندوستان کی صوفیانہ شاعری خصوصاً ویشنو شاعری سے ایک روحانی اور قلبی تعلق ہے۔ اس لئے جب کبھی وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں معرفت، سوز اور پریم کے دریا بہا دیتے ہیں۔ کرشن کنہیا اور اُن کی البیلی رادھا کے گیت لکھنے میں وہ کسی بنگالی یا ہندی شاعر سے کسی لحاظ سے کم نہیں ہیں اور اس موضوع پر مغربی مصنفین کے مطالعہ نے اُن کی نظر میں زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ "وِدیاپتی اور اس کے گیت" ایک بسیط مقالہ ہے جس میں انہوں نے متھلا کے اس شاعرِ اعظم کے کلام اور اس کے سلسلہ میں ویشنو شاعری پر ایک فاضلانہ اور ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے اور اس کے ساتھ ودیاپتی کے بہت سے گیتوں کے نہایت رس بھرے ہندی آمیز اردو ترجموں سے ہمارے ذوقِ شعر و موسیقی کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

پروفیسر فیض احمد نے ایک مختصر لیکن نہایت پُر مغز مضمون لکھا ہے "شعر میں اظہار اور ترجمانی"۔ غالباً مولانا حالی کا شعر ہے ؎

اے شعرِ دلنشیں نہ ہو گر تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

اہلِ ذوق کے ہاں اشعار کی قدر و قیمت کو جانچنے کا جو پیمانہ مقرر ہے یہ شعر اس کی مختصر سی تفسیر ہے۔ مگر فیض صاحب نے اپنے قیمتی مضمون میں تفصیل سے بتایا ہے کہ شاعری میں ترجمانی کا کیا درجہ ہے۔ اظہار اور ترجمانی میں کیا فرق ہے اور کسی شعر کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا صحیح معیار کیا ہے۔ مضمون نہایت خیال انگیز ہے اور ہمارے تنقیدی لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ۔

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی جنہیں "دی گرینڈ اولڈ مین آف اردو" کہنا چاہئے۔ ادبی دنیا پر ہمیشہ خاص عنایت فرماتے ہیں۔ چنانچہ اب کے بھی انہوں نے ایک بیش قیمت مضمون لکھا ہے "عہدِ مغلیہ میں فنونِ لطیفہ"۔ اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان کے سنہری عہد کی ان فنی ترقیوں کا حال بیان کیا ہے جو ہندو مسلمان فن کاروں کی متحدہ کوششوں سے وجود پذیر ہوئیں اور جنہیں باذوق بادشاہوں نے فروغ دیا۔ مقالہ زیرِ نظر جنابِ علامہ کی دقتِ نظر اور ذوقِ تحقیق کا شاہد ہے۔ اور صاحبِ موصوف کی شگفتگی بیان کا آئینہ دار۔

سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی نے "ہند قدیم کی معاشی حالت" پر ایک نہایت بصیرت افروز مقالہ لکھا ہے جو بے شمار کتابوں کے مطالعہ اور ان کی ذاتی ریسرچ کا نتیجہ ہے۔ اس مختصر مقالے میں جس قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں اور انہیں جس دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے بادشاہ حسن صاحب کی مہارتِ اختصار و ایجاز کا ثبوت ملتا ہے۔ مضمون زیرِ نظر پڑھ کر [illegible]

ایک دائرے میں گھومتی رہی ہے۔ اور جن اشیا کو ہم آج تہذیب جدید کی پیداوار سمجھتے ہیں اگر ان کا کھوج لگایا جائے تو تہذیب قدیم کے کسی جگہ میں یا اُن کی جھلک نظر آ جائے گی۔

سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی نے ایک بیش قیمت تحقیقی مضمون "بابر کی موت" کے تاریخی واقعہ پر سپرد قلم کیا ہے۔ بابر کی موت ہندوستان میں عہد مغلیہ کی صبح کا ایک دھندلا سا مگر دلفریب نقش ہے۔ بیشتر مورخین نے اس واقعہ کی تحقیقات میں ٹھوکر کھائی ہے۔ رضوی صاحب نے شہنشاہ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم کی تصنیف ہمایوں نامہ کی امداد سے اس واقعہ کی پوری تحقیقات کی ہے اور جو نتائج برآمد کئے ہیں، وہ تاریخی لحاظ سے بہت بیش قیمت ہیں۔

مدیر کے ایک فاضل آسٹرین دوست چارلس لیطراش نے جو یورپ کے متعدد بلند پایہ اخبارات کے نامہ نگار ہیں یوگوسلافیہ کے موجودہ اسلامی تمدن پر ایک شگفتہ باتصویر آرٹیکل لکھا ہے "یورپ کا مکہ۔ سراجیو"۔ ہمارا خیال ہے کہ بیشتر ناظرین کے لئے یہ معلومات بالکل نئی ہوں گی اور بے حد دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

ادبی دنیا کے دور افتادہ کرمفرما سید نورالحسن صاحب برلاس مقیم ٹوکیو ہر سال "جاپانیات" پر ایک مفید اور دلچسپ مقالہ عنایت فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ آپ نے ایک نرالا اور دلپذیر مضمون "جاپانی لڑکیوں کا تخیل" تحریر فرمایا ہے جس میں آپ نے جاپانی نسائیت کے ذہنی رجحانات کا ایک نہایت صحیح خاکہ اعداد و شمار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ مشرق و مغرب کے اتصال باہم سے ہر ملک میں جو ایک ذہنی انتشار سا پیدا ہو گیا ہے پروفیسر صاحب نے اس کا وہ رُخ دکھایا ہے جو جاپان جدید کی نسوانی دنیا میں نمایاں ہے اور آپ نے اپنے مطالب کی وضاحت کے لئے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بے حد اچھوتا اور دلچسپ ہے۔

منصور احمد مرحوم (زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے) کے برادر اصغر مظفر احمد صاحب نے کمال اتاترک کے سانحہ وفات سے متاثر ہو کر ترکی کے ایک اور درخشندہ ستارے کے غروب کی کیفیت لکھی ہے جو موجودہ سانحہ سے بہت مختلف ہے "انور کا انجام" ایک بے حد دلچسپ اور دردناک بیان ہے جس سے ایشیا کے اس بطل عظیم کے انجام کے صحیح اور بے کم و کاست حالات پہلی مرتبہ اردو خوان اصحاب کے سامنے آتے ہیں۔ انور جس طرح شہید ہوئے اس کی کیفیت پڑھ کر ہر صاحب دل کے جسم میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

ناظرین ادبی دنیا نے بسنت سہائے صاحب کے پُراز معلومات سیاسی مقالوں کا اکثر مطالعہ کیا ہے۔ آج اُن کا ایک علمی مضمون "سورج کا زوال" آپ کے پیش نظر ہے یہ مضمون مشہور سائنس دان سر جیمس جینز کے تازہ ترین افکار کا خلاصہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر وہ انجام عالم جسے عرف عام میں قیامت کہتے ہیں ایک دور از کار نہیں وہم نہیں بلکہ ایک نہ ٹلنے والا سانحہ ہے جو ایک دن ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو پیش آ کر رہے گا ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون تعلیمی حلقوں میں خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اب رہیں منظومات سال کی نسبت ہمیں فقط وہی کچھ کہنا ہے جو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ شعر کا تعلق تفہیم کی بہ نسبت وجدان سے بہت زیادہ ہے۔ اُن بلند پایہ شعرا کا کلام جس سے ادبی دنیا کے اوراق روشن ہیں ہمارے ہر تبصرہ سے بالاتر ہے۔ آپ ان اوراق میں جناب قیوم نظر کا بے نظیر ساقی نامہ۔ حضرات آسی ملتانی، آزاد انصاری اختر شیرانی۔ فانی بدایونی کشفی ملتانی۔ ساغر نظامی نظیر لدھیانوی۔ سیماب اکبر آبادی۔ جلال الدین اکبر۔ شاد عارفی۔ نذیر احمد مرغوب۔ اعجاز صدیقی۔ فراق گورکھپوری یاس یگانہ۔ حفیظ ہوشیار پوری۔ مراتب علی تائب۔ مسعود شاہد۔ سراج الدین ظفر اور شبیہ ابن علی کی وجد آور غزلیات اور حضرات علی منظور۔ عرشی امرتسری۔ اندرجیت شرما۔ روش جوالاپوری۔ روشن دین تنویر۔ ضیا فتح آبادی۔ تابش صدیقی۔ فیض احمد فیض۔ ظہیر الدین احمد ظہیر۔ مرزا عباس بیگ محشر۔ سکندر علی وجد۔ احمد ندیم قاسمی خاور سہامی۔ باقی صدیقی۔ سید احمد حسین امجد۔ علی احمد۔ مہدی علی خاں۔ ایم ساقی حمید عرفانی۔ احسان دانش اور ضمیر احمد جعفری۔ اثر صہبائی۔ ماہر القادری۔ فطرت واسطی اور تخت سنگھ کی بلند پایہ نظمیں۔ اور جناب سعید احمد اعجاز کی کیف بار رباعیاں ملاحظہ فرمائیں گے اردو زبان کے چوٹی کے شعراء کا جتنا وافر بلند اور منتخب کلام ادبی دنیا میں شائع ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ پڑھئے اور حرز جاں بنائیے۔

تصاویر کا مفصل تذکرہ آپ کو میراجی کے مضمون سالنامے کی تصویروں میں ملے گا۔ یہاں پر ہمیں اپنے مکرم دوست خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنا ایک شاہکار "کیف شباب" ادبی دنیا کو بطور خاص عنایت فرمایا۔ چغتائی صاحب کا بے مثال آرٹ کسی تعارف کا محتاج نہیں اور ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ان کی کسی تصویر کا شائع کرنا ایشیا بلکہ یورپ کے کسی بلند ترین مجلے کے لئے بھی باعث فخر ہے۔

ماسٹر ایشور سنگھ صاحب کی تصویر "موج رقصاں" کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں اور ہمیں امید ہے کہ سردار صاحب آئندہ بھی ہماری بزم میں رونق افروز ہوتے رہیں گے۔

سید سرفراز اپنی طرز میں پنجاب کے بہترین فن کار ہیں سالنامہ کا ٹائیٹل انہی کے موقلم کا شرمندہ ہے۔ اور ہم اُن کے احسان کے زیر بار۔

آخر میں مجھے اپنے عزیز دوست میراجی کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے دو ماہ کی شب و روز محنت میں میرا پورا ساتھ دیا اور سالنامہ کی ترتیب و تدوین میں مجھے نہ صرف بہترین مشورے دیئے بلکہ عملی امداد فرمائی۔

سالنامہ اب آپ کے سامنے ہے اور ہمیں آپ سے امید ہے کہ آپ اس کی خوبیوں کی قدر کریں گے اور اس کے عیوب سے چشم پوشی فرمائیں گے

صلاح الدین احمد

سال کی آخری رات

ختم ہوتا ہے سال آجاؤ　　دور کر دو ملال آجاؤ
بھول جاؤ مرے گناہوں کو　　شب کے نالوں کو، دن کی آہوں کو
جو ہوا اس کا غم فضول ہے اب　　داستانِ الم فضول ہے اب
نامرادی کا ذکر جانے دو　　کامرانی کا دور آنے دو
آؤ پھر بیٹھ جاؤ پاس مرے　　ولولے کیوں رہیں اداس مرے
آؤ ہم پھر پئیں پلائیں کہیں　　موسمِ نو کا لطف اٹھائیں کہیں
آؤ پھر گیت پریم کے گائیں　　عالمِ بےخودی میں کھو جائیں

آؤ پھر چھیڑ دیں شباب کا ساز
سالِ نو کا ہے ہونے کو آغاز

سرد و تاریک اور طویل ہے رات　　عشرتِ صبح کی دلیل ہے رات
آج کی رات غم کسی کو نہیں　　رقص کرتے ہیں آسمان و زمیں

یہ ستارے جو جھلملاتے ہیں
پریم کی راگنی سناتے ہیں

ضیا فتح آبادی

رادھے شیام

سہاگ رات

ودیّاپتی اور اُس کے گیت

ودیاپتی پرانے ہندوستان کا ایک وَیشنَو شاعر تھا جس نے کرشن اور رادھا کے نغمہ ہائے محبت لکھ کر بنگالی، میتھالی اور ہندی ادب میں ایک غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔

ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ جس طرح انسان اپنے سائے سے نجات نہیں پا سکتا اسی طرح کوئی ملک اپنے گذشتہ واقعات، اور اپنی تاریخ سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔ جس طرح سماجی حالات پر ادب کا اثر ہوتا ہے اسی طرح ادب پر تاریخی حالات کا بھی بہت اثر ہوتا ہے یہاں تک کہ مغرب جو ترقی یا ارتقا کی دوڑ میں نور کی رفتار سے بڑھا چلا جا رہا ہے اپنے ماضی کا بارِ دوشِ امروز پر لئے ہوئے ہے۔ ہندوستان کے ہر مسئلے میں زندہ بدست مردہ کا یہ پہلو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اس وقت ہم ہندوستان کے ایک ایسے شاعر کا کلام اور حالات بیان کرنے کو ہیں جس کی شخصیت کی نشو و نما اس کی اپنی زندگی کے آغاز سے نہیں ہوتی بلکہ قدیم ہندوستان کی ادبی مذہبی اور سماجی تاریخ بھی اس کی تشکیل میں حصہ دار ہے اس لئے بے جا نہ ہوگا اگر ہم آغازِ سخن قدیم ہندوستان کی ابتدا سے کریں۔

وسط ایشیا کے کسی غیر معین حصے میں کوئی خاص واقعہ رونما ہوا۔ آب و ہوا میں آہستہ آہستہ کوئی موسمی انقلاب پیدا ہو گیا۔ یا وہاں کے سبزہ زار بارش کی قلت کی وجہ سے برباد ہو گئے۔ یا بارش مناسب مقدار سے زیادہ ہوئی اور وہاں کی وادیاں پہاڑوں سے بہہ کر آئی ہوئی ریت سے ناقابل زراعت بن گئیں اور ــــــ اس علاقے کی ساکن قوموں میں ایک حرکت پیدا ہو گئی۔

قوموں کی اس حرکت سے تین لہریں پیدا ہوئیں، ایک لہر فارس کو گئی دوسری لہر کوہ قاف کو پار کر کے یورپ میں جا پہنچی اور تیسری لہر موجودہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں آئی اور پھر رفتہ رفتہ پانچ دریاؤں کی زمین میں نازل ہوتی رہی اور پانچ دریاؤں کی زمین آریہ ورت کہلانے لگی۔ اس تمام انقلاب کی مدتِ عمل غیر محدود ہے۔ کتنے عرصے تک، کتنی صدیوں تک یہ انقلاب جاری رہا یا کتنی نسلوں تک آریہ نئی سرزمین کو اپنا مستقل وطن بنانے میں مصروف رہے اور قدیم اقوام کو زیر کرتے رہے یہ ہم نہیں جانتے، اور نہ جان سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ آریہ سندھ سے لے کر ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم اور گنگا جمنا کی وادیوں تک پھیل گئے بلکہ ان کی پہنچ راجپوتانہ اور جنوبی اور مشرقی ہندوستان تک ہو گئی۔

جب پہلے آریہ حملہ آور ہندوستان میں نمودار ہوئے تو یہ سرزمین جنگلوں سے بھرپور تھی اور نئے آنے والوں نے ان جنگلوں سے بہت جلد فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ ان جنگلوں سے انہیں کیا کچھ نہ ملا! ــــــ سورج کی دھوپ اور آندھیوں سے پناہ ملی، گلّوں کے لئے سبزہ ملا، جلانے کو لکڑی ملی اور جھونپڑیاں بنانے کو مسالہ ملا۔ اور یوں مختلف آریہ قبیلوں نے مختلف جنگلی خِطّوں میں اپنے اپنے سردارِ قبیلہ کے ماتحت سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح اولین کی وجہ ہی سے ہندوستان کی تہذیب نے جنگلوں میں جنم لیا اور اِس ماخذ اور ماحول کی وجہ سے اس تہذیب و تمدن نے ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا۔ یہ لوگ قدرت کے بچے تھے۔ منظرِ قدرت ان کا گہوارہ تھا اور مادرِ فطرت ہی ان کی تمام ضروریات کی کفیل تھی۔ دانائی اور قدرتی ماحول میں انہیں ایک روحانی کیف بھی محسوس ہوتا تھا۔ مذہبی تجربے کی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ دانائی پوجا قدرتی راستوں میں چلنے لگی۔ سورج سردی سے بچاتا تھا۔ اسی کی گرمی سے فصلیں پکتی تھیں۔ سوریہ دیوتا بن گیا۔ بادل برسات لاتا تھا، اسی سے زمینیں شاداب ہوتی تھیں، اندر دیوتا بن گیا۔ لکڑیوں کی آگ سے کھانا تیار ہوتا تھا، اگنی دیوتا بن گیا اور یوں ہی مظاہرِ قدرت میں مختلف دیوتاؤں کا وجود معلوم ہوتا گیا

لیکن ابھی تک ان کے دماغ سیدھے سادے تھے اس لئے ان کے مذہبی خیالات بھی سیدھے سادے ہی رہے یعنی وہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے رہے لیکن جب نئی سرزمین کی فتح کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور پنجاب اور گنگا کے میدان آباد ہو گئے تو ان کی تیز اور ذہانت نظریات حیات کے مسئلے میں الجھنے لگی ان سے تعدد ات تشکیل پانے لگے۔ ان کے ذہنوں کے فرائض پیچیدہ تر ہوتے گئے اور وحدت کا زمرہ ومانتا شروع ہونے لگا اور اس طرح بزمین تو بادشاہت وجود میں آئی اور پھر رفتہ رفتہ باقی تمام ہی ہستیوں کے علاقہ سے ختم ہو گئیں لیکن ہمیں اس سے کچھ تعلق نہیں البتہ مذہب و تمدن کے پیچیدہ تر ہو جانے پر جو نئے دیوتا ذہن و ذہانت سے وجود میں آئے ان کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

ان برہمنوں کی بنائی ہوئی دیومالا کے لحاظ سے نظام کائنات میں تین بڑی قوتیں ازل سے کارفرما ہیں۔ پیدا کرنے والی (برہما) پالنے والی (وشنو) اور تباہ کرنے والی (شو) جدا جدا ان تینوں قوتوں کو عظیم ترین تصور کیا جاتا رہا۔ کیونکہ انسانی وسعت اور وقت کے ساتھ ساتھ تینوں قوتوں کے پیرو مختلف فرقوں کی صورت بڑھتے گئے اور ان تین دیوتاؤں کی پوجا ہوتی رہی لیکن بقائے حیات کی ضرورت کے لحاظ سے اور خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہندوستان جیسے زراعتی ملک میں پالنے والی قوت کی طرف سے ہی زیادہ حاجت روائی ہو سکتی ہے، رفتہ رفتہ وشنو کی پوجا کا اعتقاد ہمہ گیر ہوتا گیا۔ اس بات کی وضاحت ہم اس اعتمادی حقیقت سے کر سکتے ہیں کہ آیندہ مذہبی نشو و نما اور مذہبی اعتقادات میں وشنو ہی کا زیادہ دخل رہا یعنی وشنو کے دس اوتار مختلف وقتوں میں ہنگاموں کو فرو کر کے مذہبی خیالات اور تصورات میں باریکیاں پیدا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شری رام چندر جی اور کرشن مہاراج کے نزول کے بعد سے تو آہستہ آہستہ ہندو مذہب ہی رام اور کرشن کی پرستش کا دوسرا نام بن کر رہ گیا۔ لیکن ان دونوں اوتاروں میں سے رام کی پرستش کی بہ نسبت کرشن کی پوجا زراعت پیشہ عوام کے ذہنوں میں زیادہ راسخ ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ رام کشتری تھا، ایک سپاہی، اور کرشن ایک گوالا تھا۔ لیکن ہمیں یہاں اس وجہ سے بحث نہیں ہے۔ صرف یہی نکتہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ کرشن کی پوجا نے آگے چل کر مختلف فنون اور خاص کر علم ادب اور شاعری پر ایک گہرا اثر کیا۔ ایک ایسا اثر جو ادب کے ذریعے سے بھی نہایت لطیف انداز میں مذہبی خدمت کا باعث ہوا۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہی شخص آج ہمیں بہترین

نغمہ خواں دکھائی دیتا ہے جس کا خاص کام کرشن اور رادھا کے گیت گانا ہو۔ اس مضمون میں ہمیں ایک ایسے ہی شخص کے متعلق چند باتیں کہنا ہیں۔

ہندوستان میں ہر سوانح نگار کو یہ عام مشکل درپیش آتی ہے کہ کسی بھی بڑے آدمی کے حالات لکھنا مقصود ہوں۔ اس کے لئے ماخذ اور ذرائع محدود ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہند قدیم میں کام کے ساتھ کام کرنے والوں کا نام باقی رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں ہر زمانے کے آنے والوں کو حکایات اور روایات کا سہارا لینا پڑا اور اس طریقۂ کار سے قدرتی طور پر بلکہ لازمی طور پر اکثر اوقات واقعات کی غلط صورتیں ہی اعتقادات کا جزو راسخ بنتی رہیں۔

بہر حال اس سلسلے میں بھی ایک استثنا ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ جن ماہرین فنون و علوم کا راجاؤں، حاکموں یا امرا سے تعلق رہا ان کے متعلق سوانحاتی مواد نسبتاً آسانی سے مہیا ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ودیاپتی بھی خوش قسمت تھا۔ اس کی پیدائش اگرچہ سورداس اور تلسی داس سے قریباً دو سو سال پیشتر ہوئی لیکن ان دونوں کے برعکس اس کے متعلق ہمیں زیادہ حالات معلوم ہیں اور وہ بھی ذرا وضاحت سے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ اس کی زندگی ایک علم پرور راجہ کے سائے میں بسر ہوئی۔

بہت عرصے تک ودیاپتی کی وطنیت معرض بحث میں رہی لیکن اب اس اختلاف کا یقینی فیصلہ ہو چکا ہے۔ پہلے بعض لوگ شاعر کو بنگالی کہتے تھے اور بعض غیر بنگالی۔ لیکن اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ودیاپتی بنگالی نہیں تھا بلکہ میتھل کا رہنے والا تھا۔ ودیاپتی کا جنم بہار کے ضلع دربھنگہ میں بینی پٹی تھانے کے قریب بسپی گاؤں میں ہوا۔ اس گاؤں کا پہلا نام گڑھ بسپی تھا۔ شاعرانہ شہرت کا مالک ہونے کے بعد ودیاپتی کو اس کے مہربان راجہ شیو سنگھ نے انعام کے طور پر یہ گاؤں دے دیا تھا۔ ودیاپتی کی اولاد اور اس کے متعلقین بہت دنوں تک اسی گاؤں میں بستے رہے۔ لیکن انگریزوں کے اقتدار کے بعد وہ گاؤں چھن جانے پر پاس ہی ضلع کے سوربھٹ نامی گاؤں میں جا کر رہنے لگے۔

ودیاپتی کو کرشن اور رادھا کے گیتوں کی وجہ سے قبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ قبولیت چند وجوہات کی بنا پر ایک عجیب پیچیدہ سی بات بن گئی۔ بیک وقت ایک زبان اور دو بولیوں نے ودیاپتی کے کلام کو اپنا سرمایہ بتانا شروع کر دیا۔ پہلا مطالبہ بنگالی زبان کا تھا، دوسرا میتھلی اور

تیسرا ہندی بولی کا بنگالی مطالبے کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

اُس وقت جبکہ بنگالی زبان ایک بولی کی حیثیت رکھتی تھی اور ابھی اپنی ابتدائی نشوونما کے دور سے ہی گذر رہی تھی، بنگال میں ایک نیک آدمی کا ظہور ہوا۔ میری مراد مشہور مذہبی رہنما چیتن دیو سے ہے۔ چیتن دیو کو ان کی والہانہ عقیدت اور بھگتی کی بنا پر کرشن مہاراج کا آخری اوتار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب چیتن دیو اپنی تعلیم پھیلانے کی طرف رجوع ہوتے اُس وقت میتھلا یعنی موجودہ بہار میں ودیاپتی کے میٹھے گیتوں کی صد درجہ شہرت تھی۔ یہ گیت میتھالی بولی میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ بولی ابتدائی بنگالی سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ چنانچہ چیتن دیو نے ان گیتوں کو اپنی عبادت اور تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا اور رفتہ رفتہ وسیع تعلیم عام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ان گیتوں کو بنگال میں بھی وہی قبولیت حاصل ہوئی جو بہار میں تھی۔ اس قبولیت کے سلسلے میں ہی گیتوں کی اصل زبان بدل کر بہت زیادہ بنگالی ہوتی گئی اور پھر انہی گیتوں کے تتبع میں نروتم داس، کرشن داس، گوبند داس، جنان داس وغیرہم بنگالی ویشنو شعرا نے بھی کرشن اور رادھا کے گیت تصنیف کئے اور جب ویشنو شاعری کا مشہور بنگالی مجموعۂ نظم "پو دو کال پترو" ترتیب دیا گیا تو باقی شعرا کے صف بصف ودیاپتی کے گیتوں کو بھی ایک مستقل جگہ ملی۔ لیکن اب جدید تحقیقات کے بعد بنگال کے نقادوں نے حقیقت سے واقف ہو کر اس بات کو مان لیا ہے کہ ودیاپتی بہار کا میتھالی شاعر تھا اور بنگالی زبان کا پہلا شاعر چنڈی داس تھا۔

ہندی زبان کا مطالبہ بنگالی مطالبے سے بھی کم وزن رکھتا ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے امیر خسرو کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں ابتدائی درجہ حاصل ہے۔ میرے خیال میں حقیقت پرستی کا حق تب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ ودیاپتی کو بنگالی کا پہلا یا ہندی کا ابتدائی شاعر کہنے کی بجائے بہار کی میتھالی بولی کا ایک اور اکیلا شاعر سمجھا جائے۔

سوانحاتی سلسلے میں کسی بڑے آدمی یا شاعر کی پیدائش اور موت کا دن بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے عرصۂ حیات کے تعین کے بعد اُس کی زندگی کے واقعات معلوم کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن عموماً دیکھا گیا ہے اور ہندوستان میں یہ بات خاص ہے کہ حالات تو درکنار مشاہیر کے پیدا ہونے اور مرنے کا دن اگر نا معلوم نہ ہو تو متنازعہ فیہ ضرور ہوتا ہے۔ ودیاپتی بھی اس لحاظ سے مستثنیٰ نہیں ہے

راجہ شو سینہہ نے گدی پر بیٹھنے کے چھ ماہ کے بعد بسپی گاؤں ودیاپتی کو بخشا تھا۔ اس وقت ودیاپتی کی عمر بیس سال کی تھی۔ یہ قول بابو برج نندن سہائے کا ہے۔ لیکن شری بینی پوری اپنی ہندی کتاب "ودیاپتی" میں کچھ اور کہتے ہیں وہ یہ کہ تیس سال کی عمر تک ودیاپتی اور راجہ شو کا ساتھ رہا یہ بات مسلمہ ہے۔ اس کے علاوہ ودیاپتی کے بے شمار گیتوں میں راجہ شو کا ذکر ہے اور یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ تین چار سال کے عرصے میں ہی شاعر نے وہ تمام گیت لکھے ہوں۔

ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جسے دو برہمنوں نے ودیاپتی کی زیر نگرانی راجہ شو سینہہ کی راج دھانی گجرتھ پور میں لکھا تھا۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ شو کو اس کے والد نے اپنی زندگی میں ہی گدی سونپ دی تھی اور ساری رعایا راجہ شو کو ہی اپنا حاکم سمجھتی تھی۔ نیز ودیاپتی راجہ شو سے پہلے بھی اس کے باپ کے دربار میں شاعر کی حیثیت سے موجود تھا۔

یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ودیاپتی بچپن کی عمر میں اپنے باپ گنپتی ٹھاکر کے ساتھ راجہ گنیشور کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں اُس کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔

ودیاپتی ٹھاکر میتھل برہمن تھا اور راج منتری کرمادتیہ کی نسل سے تھا۔ اس خاندان کے بہت سے لوگ اپنے اپنے وقت میں سلطنت کے اچھے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اور ودیاپتی کا خاندان ہمیشہ سے میتھلا میں باعزت اور اونچا چلا آیا تھا۔ شاعر کے آبا و اجداد میں عموماً مصنف اور شاعر بھی ہو گذرے تھے۔ خود ودیاپتی کا باپ گنپتی ٹھاکر راج منتری تھا۔ گویا ودیاپتی کے بڑے بوڑھے سب سرسوتی کے سائے میں زندگی بسر کرتے چلے آئے تھے اور اُن کی سیاست دانی کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی علمی اور ادبی خدمات بھی ہر طرح لائق ستائش تھیں۔

ودیاپتی کی قدر و منزلت اور پرورش میں جو حصہ راجہ شو سینہہ نے لیا وہ قابل قدر ہے۔ اسی علم پرور راجہ کے سایۂ عاطفت میں رہ کر شاعر نے نغمہ سرائی کی۔ جس طرح راجہ شو نے بسپی کا گاؤں ودیاپتی کے نام لکھ کر اپنی عقیدت کا ثبوت دیا تھا۔ اسی طرح ودیاپتی نے بھی راجہ شو اور اس کی رانی لکشمی کا نام اپنے گیتوں میں لا کر ان کو اپنے کلام کے ساتھ غیر فانی بنا دیا۔ راجہ کا دان تو چند ہی صدیوں میں شاعر کی اولاد کے

ہاتھوں سے جاتا رہا۔ لیکن شاعر کی فراخ دلی کا ثبوت مستقل ہے اور کبھی مٹ نہیں سکتا۔

تیرھویں صدی میں متھلا میں دو شاہی گھرانے سب سے بڑے شمار کئے جاتے تھے۔ ایک سگرانو اور دوسرا ایمرانو۔ راجہ شیو سگرانو گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس گھرانے کی حکومت کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب دہلی میں غیاث الدین تغلق کی حکومت تھی۔ راجہ شیو سینہ راجہ دیو سینہ کا بیٹا تھا اور اس کی راجدھانی باگ متی دریا کے کنارے گجر تھد پور میں تھی۔

ودیاپتی نے اپنے گیتوں کے آخر میں اپنے مہربان راجہ اور اُس کی رانی کا نام دیا ہے اس سے بعض لوگوں کو اسی زمانے میں کئی طرح کے شکوک پیدا ہو گئے کہ راجہ کا نام تو دیا لیکن رانی کا نام دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ لیکن ودیاپتی کئی راجاؤں کے دربار میں رہ چکا تھا اور جس راجہ کا نام بھی اُس نے اپنے کلام میں لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رانی کا نام بھی لکھا ہے۔ یہ اس کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی شادی شدہ تھا۔ چنانچہ اس کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا پتہ بھی چلتا ہے۔

متھلا میں کہا جاتا ہے کہ راجہ شیو کے محل میں ودیاپتی کے گیت خاص اہتمام سے گائے جاتے تھے۔ محل میں راجہ شیو اور اس کے پہلو میں رانی لکشمی بیٹھتی۔ چاروں طرف دوسری حرمین اور داسیاں اور باندیاں موجود ہوتیں اور یوں اس مجمع میں "چیری" نام کی خاص گانے والی عورتیں شاعر کے گیتوں کے نغمے فضا میں منتشر کرتیں۔

راجہ شیو شاعر سے بہت پہلے مر گیا۔ اس کی زندگی کا پتہ سنہ ۱۴۴۳ء تک چلتا ہے لیکن ودیاپتی کے مرنے کا سال بھی معین نہیں ہے۔ اندازے سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ودیاپتی کی موت ۱۴۲۹ء میں ہوئی۔ ودیاپتی کی موت کے متعلق ایک روایت بھی ہے۔

جب ودیاپتی کافی عمر کو پہنچ گیا تو ایک روز اس نے راجہ شیو سینہ کو خواب میں دیکھ کر جانا کہ اُس کی موت کا وقت اب قریب آ چکا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر گنگا کی سیوا کو چلا۔ جانے سے پہلے اُس نے بیوی سے کہا کہ عمر بھر شیو کی پوجا کی اور اب گنگا جا رہا ہوں (دیومالا کے لحاظ سے شیو کی جٹائیں ہی گنگا کا ماخذ ہیں)

گھر پر اہل و عیال کو دلاسا دے کر ودیاپتی پالکی میں بیٹھا اور گنگا کی طرف روانہ ہوا۔ راہ میں جب گنگا سے کچھ دور ہی تھا تو پالکی رکوا دی اور ایسے بھگت کی طرح پکار کر کہا جسے اپنی بھگتی پر ناز ہو "میں اتنی دور سے گنگا مائی کے پاس آیا ہوں۔ کیا گنگا میرے لئے دو کوس بھی نہیں آ سکتی؟" یہ کہہ کر اسی جگہ قیام کیا۔ رات وہیں گذری۔ دوسرے دن لوگوں نے جو کیفیت دیکھی اُسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئے گنگا اپنی دھارا چھوڑ دو کوس کی دوری پر پہنچ چکی تھی۔ آج تک اُس جگہ پر گنگا کی دھارا میں ایک خم دکھائی دیتا ہے۔ جس گاؤں کے قریب یہ واقعہ ہوا۔ اُس کا نام بازی پور ہے۔ یہ گاؤں ضلع مظفر پور میں ہے۔ یہیں ودیاپتی کی موت ہوئی۔ ودیاپتی کی چتا پر معتقدین نے ایک شو مندر تعمیر کیا۔

ودیاپتی نے رادھا کرشن کی مدح میں کل کتنے گیت لکھے اس کے متعلق کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہے۔ باوجود جدید تحقیقات کے اس وقت تک سارے گیت اکٹھے نہیں ہو سکے ہیں۔ آنند کمار سوامی نے رادھا کرشن کی محبت کے جن گیتوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے ان کی تعداد ایک سو اڑتیس ہے۔ کالی پرسن کاویہ وشارد کے ایڈیشن میں دو سو دو گیت ہیں کمار سوامی کے ترجمے بھی انہیں پر مبنی ہیں۔ لیکن نگندر ناتھ گپتا نے مہاراجہ دربھنگہ کے لئے جو ایڈیشن تیار کیا ہے اس میں نو سو سے کچھ زیادہ گیت ہیں۔

گیتوں کو دیکھتے ہوئے بنگال میں اور دوسری جگہوں پر بھی یہی خیال کیا جاتا رہا کہ ودیاپتی ویشنو تھا لیکن روایت ہے کہ شاعر کے باپ گنپتی ٹھاکر کا مذہب شو کی پوجا تھا۔ کیونکہ اس نے شو کی پوجا ہی سے ایسا بیٹا حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ ودیاپتی نے بھی ایک جگہ لکھا ہے "کوئی چنڈی کی پوجا کرتا ہے، کوئی وشنو کی پوجا کرتا ہے۔ لیکن میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے بان مہیشور! بھگتوں کا سہاگ جان کر میں نے تمہاری ہی سیوا کی"

ودیاپتی کے گاؤں وسپی سے شمال کی جانب ایک گاؤں میں بان مہیشور مہادیو کا مندر ہے۔ اس کلام میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ ودیاپتی مذہباً شو مت سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسے چنڈی داس بھی ویشنو شاعر ہونے کے باوجود کالی ہی کے مندر کا ایک پجاری تھا۔ ودیاپتی کے مذہبی اعتقادات کے بارے میں ایک اور روایت بھی ہے اور وہ یہ کہ شو کی پوجا کے وقت بعض دفعہ وہ روحانی کیف میں اس قدر ڈوب جاتا کہ بے اختیار رقص کرنے لگتا تھا۔

بدھ مت کے زوال کے بعد ہندوستان میں پہلے شو مت اور

اس کے بعد ویشنو مت کے فرقے پیدا ہوئے۔ ویشنو مت نے سب سے بڑھ کر بنگال کی زندگی اور ادب پر ایک گہرا اور مستقل اثر کیا۔ وشنو مت اپنے منفی پہلو کے لحاظ سے اُس خشک ذہانت اور اُس بے جان اور مردہ رسم پرستی کے خلاف ایک بغاوت تھی جسے قدامت پسند برہمنوں نے ہندوستان میں رائج کر دیا تھا اور اس کے مثبت پہلو سے اس آرزو انگیز نغماتی پکار کی آواز ہویدا تھی جو روحِ انسانی میں معبود کے لئے بے ساختہ پیدا ہوتی ہے، آزادی، مساوات اور اخوت ـــ بس ان تین لفظوں میں ویشنو مت کا تمام فلسفہ پنہاں تھا۔

ودیاپتی اسی ویشنو مت کے اعتقادات کا شاعر تھا۔ ودیاپتی سے سو سال بعد اس مذہب کے مشہور رہنما چیتن دیو بنگال میں آشکارا ہوئے اور انہوں نے ان مذہبی گیتوں سے پہلے خود روحانی کیف کو حاصل کیا اور پھر لوگوں میں مذہبی احساس کی روح پھونکی۔

سولھویں صدی میں بنگالی شاعر بسنت رائے نے ودیاپتی کی نظموں کو بنگالی صورت دے دی۔ بنگالی کا پہلا شاعر چنڈی داس بھی ودیاپتی کا ہم عصر تھا۔ اس کے کلام پر بھی ودیاپتی کا اثر ہوا لیکن وہ بذاتِ خود ایک جوہر خداداد کا مالک تھا۔ نیز اس کے حالات زندگی نے اس کے فطری جوہر کو جلا دی۔ اس لئے اس کا کلام بیرونی اثرات کے باوجود خود مختارانہ حیثیت رکھتا ہے اور اپنی انفرادی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے۔ چنڈی داس کی زندگی میں اس کی محبوبہ رامی دھوبن کی محبت کا واقعہ ایک ایسا تجربہ ہے جس نے اس کے کلام میں ایک خاص ذاتی لہجہ پیدا کر دیا ہے جو ودیاپتی کے گیتوں میں موجود نہیں ہے۔ چنڈی داس نے محبوبہ کی فرقت اور اس کے ملنے میں دنیاوی مشکلات کا سامنا بھی کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے گیتوں میں جدائی کی اذیت کا اظہار ایک شدت اور بے ساختگی کے ساتھ موجود ہے۔ اور ان میں احساسات اور تصورات کو ایک سادگی کے ساتھ ایسے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ودیاپتی کے گیتوں کے آرائشی نقوش اُن کے مقابلے میں کم کیف انگیز ہیں۔ ودیاپتی کی زندگی زیادہ مسرت والی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ ملاپ اور سنجوگ کے سکھ آنند کو بیان کرنے میں پیش پیش ہے اور اس کے گیتوں میں ایک محاکاتی زور ہے، خوشگوار تشبیہیں ہیں، تازہ اور شگفتہ تصور ہیں۔ ودیاپتی کی شاعری میں محبت کی تازگی اور جوش ہے، اور چنڈی داس کی شاعری میں محبت کی شدت اور گہرائی۔ لیکن دونوں کے کلام میں ایک بات یکساں ہے یعنی پوجا اور عقیدت کے احساس ایک ایسی بلندی پر جا پہنچے ہیں۔ کہ دنیا کی نغماتی شاعری میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے ہندوستان کا کلاسیکل ادب شروع سے خارجی چلا آیا تھا لیکن چیتن دیو کی تبلیغ نے جو دو صد مرد اور عورت ویشنو شاعر بنگال میں دو سو سال کے عرصے میں پیدا کئے اُن سے اور اُن سب سے بڑھ کر ودیاپتی اور چنڈی داس سے شاعری کے داخلی پہلو کو بے حد ترقی ہوئی۔

ودیاپتی کی موت کے تین سو سال بعد اس کی وہ نظمیں جو بنگال میں رائج تھیں۔ اصل نسخے سے بہت بدل گئیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے میں قلمی تصنیفات کا دور دورہ تھا اور بنگالی نقل نویس ودیاپتی کی میتھالی بولی سے ناواقف تھے۔ بہت سے گیت مقطع کھو جانے کی وجہ سے گمنام سمجھے جانے لگے اور ساتھ ہی ساتھ یہ اعتقاد بھی راسخ ہوتا گیا کہ ودیاپتی ایک بنگالی تھا اور اس کے ساتھ ہی بہت سی غلط روایات بھی شاعر کی ذات سے متعلق ہوتی گئیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ گیتوں کی زبان خالص بنگالی نہ تھی اس لئے دوسرا نظریہ عام طور پر مانا جانے لگا۔ کہ یہ زبان برج بولی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ برج بولی اور ان گیتوں کی بولی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کبھی ثابت نہیں ہو سکا کہ ودیاپتی برندابن میں جہاں کی زبان برج بولی تھی گیا ہو۔ متھلا کے محققین اگر کوشش کرتے تو اس گتھی کو سلجھا سکتے تھے لیکن متھلا کے لوگوں نے سوائے اس کے کہ شاعر کے مسودوں کو سنبھال رکھیں اور کوئی کام نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ودیاپتی کے متعلق تمام غلط فہمیاں بنگال میں راسخ ہو گئیں۔ لیکن آخر کار ان غلط فہمیوں کو دور بھی بنگال والوں ہی نے کیا۔ شاعر کے خاندانی حالات جمع کئے گئے۔ اُس کے گیتوں کا اصل نسخہ متھلا سے مہیا کیا گیا اور ایک صحیح ایڈیشن کلکتے سے شائع ہوا اور دوسرا دیوناگری ایڈیشن الہ آباد سے ظاہر ہوا۔

متھلا کے علم ادب میں سنسکرت کے بہت سے عالم گذرے ہیں لیکن ودیاپتی سنسکرت کا عالم ہونے کے باوجود پہلا شاعر تھا جس نے عوام کی میتھالی بولی میں اپنا کلام پیش کیا۔ اس سے پیشتر علمی اور ادبی مقاصد کے لئے متھلا کی زبان کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ودیاپتی نے بھی اپنی ابتدائی تصنیفات سنسکرت میں ہی کیں۔ اس کی تصنیف و تالیف کے تین دور ہیں۔ پہلا دور سنسکرت کا۔ دوسرا ایک عام فہم زبان کا دور جسے وہ اباہتھ کہتا تھا اور تیسرا دور اُن گیتوں کا جو اس نے میتھالی بولی میں لکھے ظاہر ہے کہ تیسرے دور میں اُس کی تخلیق زیادہ پختہ ہو گئی تھی اور اسی

تخلیق سے اُسے بنگالی، میتھالی اور ہندی ادب میں ایک غیر فانی درجہ حاصل ہو گیا۔

ان نظموں کا رسم الخط سنسکرت کی بجائے پراکرت ہے۔ اور ان کی زبان بنگالی کی بہ نسبت ہندی سے زیادہ قریب ہے۔ لفظوں اور بحروں کا انتخاب موسیقی کے عین مطابق ہے۔ گیتوں کی اکثریت اختصار اور اجمال کی جان ہے۔ جن میں کبھی کبھی شاعر اپنے ساز کلام کے ایک ایسے تار کو چھیڑ دیتا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے نغمے کوشن کے دل پر بے ساختہ اثر ہوتا ہے۔ مثلاً

شام دھندلکا لے کر آئی۔
گوری گھر سے باہر آئی!
چہرہ جیسے بجلی چمکے،
اور کاندھے پر بال گھٹا سے!
نئی نویلی اور اچھوتی،
مالا بکھرے پھولوں والی!

شام کے دھندلکے کے پس منظر میں گیسو گھٹائیں اور چہرے کا روپ بجلی کی چمک ہے اور چہرے کی شگفتگی کو ظاہر کرنے کے لئے رادھا کے پیکر کو بکھرے پھولوں کی مالا کے اچھوتے پن سے جا ملایا ہے۔

تمام نقاد اس بات میں متفق چلے آ رہے ہیں کہ کرشن اور رادھا کے محبت کے گیتوں سے ویشنو شاعروں کو فانی انسان کی محبت کا بیان نہیں مطلوب ہوتا۔ ویشنو فرقے میں ایسے تمام گیت مقدس لٹریچر کا رتبہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ان گیتوں نے بہت سے لوگوں کو مذہبی احساسات پیدا کر کے نیک راستے پر چلایا۔ یہاں تک کہ مشہور مذہبی رہنما چیتن دیو کے دل پر ان گیتوں نے ایسا اثر کیا کہ انہوں نے نوجوانی میں ہی کنوارپن کا عہد کر کے اپنی زندگی کو مذہبی خدمات اور رادھا کرشن کی محبت اور عقیدت کے لئے وقف کر دیا۔

ان گیتوں میں رادھا کرشن کے استعارے کو سمجھنے کے لئے عام نظریہ یہ ہے کہ رادھا سے روح انسانی مراد ہے اور ہرکارے (اودھو) سے مراد ہے پیغمبر۔ اور کرشن سے معبود یعنی خدا سے مطلب ہے۔ سر جان گریرسن نے لکھا ہے کہ ودیاپتی کے گیت ایک عقیدت مند ہندو کے دل میں بالکل اسی طرح مذہبی احساسات کو بیدار کرتے ہیں جیسے کسی عیسائی راہب کے دل میں حضرت سلیمان کا سرود سلیمانی۔ یہ مان لیا کہ یہ احساس روحانی پیدا کرنے والی بات سچ ہی سہی لیکن درپردہ ایسا ادب جنسی جذبات کو جس قدر تسکین دیتا ہے اس کو دیکھتے ہوئے میرا ذہن ان باتوں کو شک کی نظروں سے دیکھتا ہے اس بات کو جانے دیجئے کہ بقائے نسل جو ایک خاص جنسی معاملہ ہے اُسے بھی بعض مذاہب میں عبادت کا رتبہ دیا جاتا ہے۔ اس پر مجھے اعتراض نہیں اور نہ اس سے بحث ہے۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ جدید مغربی علوم کی روشنی میں جب ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ذہن انسانی میں ہر فعل کی تحریک کا باعث جنسی جذبہ ہے اور مذہبی احساس اور تجربہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم روایات سے غیر جانبدار ہو کر صحیح بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ محض خوش عقیدت انسان بن کر ہی نہ رہ جائیں۔ ویشنو شعرا کی کیفیت بالکل صوفی شعرا کی سی ہے اور یہ سب حسن تعلیل کے طور پر غالب کی زبان میں یہی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بھی بادہ و ساغر کہے بغیر نہیں بنتی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اگر حق سے مراد خدا ہے تو یہ جان لیجئے کہ سچائی اور حقیقت ہی سب سے بڑا خدا ہے۔

اصل میں یہ سارا مسئلہ مذہب اور جنس کے گہرے تعلق کا مسئلہ ہے اس وقت ہمیں ان اجنبی (اور بعض لوگوں کے لئے ناگوار) خیالات سے ایک طرف ہو کر تصوف کی شاعری کے ان پرانے انداز تشریح کو ہی مدنظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ نیا نظریہ وقت طلب ہونے کے علاوہ ہمارے موجودہ مقصد میں بھی حارج ہو گا۔

کرشن کا رنگ نیلگوں کہا جاتا ہے اور یہ آسمان اور سمندر کا رنگ ہے گویا کرشن کے استعارے سے قدرت یا خدا کی بات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگر ان گیتوں میں انسانی عشق کا بیان مقصود ہوتا تو ظاہر ہے کہ کرشن کا حسن عام مردانہ حسن کے مطابق رکھا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کرشن کو شیام کہہ کر حسن ملیح کا مالک بھی ثابت کیا گیا ہے اور رادھا کو مور کی نیلگوں گردن، گھٹاؤں کا مٹیالا پن اور اپنے گیسوؤں کی سیاہی دیکھ کر ہی کرشن کی یاد آیا کرتی تھی۔

اور اب یہ بات آئی کہ ان گیتوں کی کیفیت کیا ہے۔ عام طور پر رادھا کرشن کے ان گیتوں میں جنہیں ودیاپتی نے لکھا ہے (اور ان میں بھی جنہیں دوسرے ویشنو شعرا نے لکھا ہے) کرشن اور رادھا کے احساسات اور جذبات اور محبت کے واقعات کا نقشہ ہوتا ہے کبھی کرشن کنہیا رادھا کی رٹ لگائے رہتے ہیں کبھی اپنے کسی ہمدم سے رادھا کے متعلق باتیں

کر رہے ہیں کبھی کوئی ہمدم نہیں ہے تو آپ ہی آپ کچھ کہہ رہے ہیں اور یہ آپ ہی آپ کہی ہوئی باتیں کسی ہم جلیس کے کانوں میں جا پڑتی ہیں۔ کبھی اودھو یا کسی اور پیامی (ہرکارے) کو کوئی سندیسہ دیتے ہیں تاکہ وہ رادھا تک جا پہنچائے یا کبھی کوئی ساتھی کنھیا کی باتیں سن کر اپنے طور پر رادھا سے جا کہتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں میں ہر وقت کی باتوں کا ایک علحدہ نغمہ تیار ہو جاتا ہے تمام باتیں ایک ہی گیت میں نہیں آتیں۔ کوئی بات کسی گیت میں اور کوئی کسی اور گیت میں۔

اور جیسی باتیں کرشن کنھیا کے دل میں آتی ہیں اور وہ کہتے ہیں ویسی ہی باتیں رادھا کے دل میں بھی آتی ہیں اور وہ بھی کہہ دیتی ہے۔ یہ سب باتیں گویا ایسے پریمیوں کے محبت ناموں کی طرح ہوتی ہیں جو ہر وقت اپنے دلوں میں سنجوگ کی آرزوئیں لئے ہوئے ایک دوسرے کی راہ تک رہے ہوں اور کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملنے کی گھڑیاں آن پہنچیں، لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آجاتی ہے، اور وہ نہیں مل سکتے یا وہ مل بھی جاتے ہیں تو جلد ہی انہیں پھر جدا ہو جانا پڑتا ہے —— مجبوری! —— محبت کی مجبوریاں!۔ اور پھر دوری! —— جدائی کی دوری، حالات کی دوریاں! اور ظاہر ہے کہ ایسی ملاقاتوں سے دل کو تو تسکین ہو نہیں سکتی۔ وہ شعلہ جو ہر شے کو بھسم کر دینا چاہتا ہے، لرزتا ہی رہتا ہے، اور یوں پھر سے وہی پہلی، پرانی، پیار کی بات شروع ہو جاتی ہے۔

ان ملاقات کے گیتوں کو سن کر ہمارے ذہنوں میں بھی اکثر ایک تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ ہمیں ان میں اُن ملاقاتوں کا پورا پورا حال نہیں بتایا جاتا۔ صرف اشارے —— کنائے —— اور کبھی کبھی صاف سیدھی سادی بات! ان ملاقاتوں کا کوئی مقرر وقت نہیں۔ اچانک جیسے آسمان پر کوئی ستارہ نمودار ہو جائے اور پھر اسی طرح یک لخت غائب ہو جائے بس یہی کیفیت ان ملاقاتوں کی ہے۔

ایسے گیت بھی ہیں جن میں رادھا کو پہلی بار دیکھنے کے بعد کرشن کنھیا کے دل میں جو احساس اور خیال پیدا ہوئے انہیں بیان کیا گیا ہے یا اس کے الٹ کرشن کو دیکھنے پر رادھا کے دل کی حالت ظاہر کی گئی ہے۔ ایسے گیت بھی ہیں جن میں اُن آرزوؤں اور آشاؤں کا ذکر ہے جو کبھی پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔ ایسے گیت بھی ہیں جن سے اُن لمحوں کا حال معلوم ہوتا ہے جب دونوں چاہنے والوں میں ایک نہ ٹوٹنے والے بندھن کی ابتدا ہوئی تھی۔ ایسے بھی ہیں جن میں چاہنے والوں کی رنجش اور شکراب کا حال ہے۔ ایسے بھی ہیں جو محبت کے اولیں ایام کی مسرتوں سے لبریز ہیں۔ لیکن ایک بات ان سب گیتوں میں یکساں ہے اور وہ یہ کہ رادھا اور کرشن، پریمی اور پریتم —— دونوں پر ایک سدا جوانی کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ جذبات کے ساون کا ابدی موسم طاری رہتا ہے۔ بلوغ کی شگفتگی کبھی مٹتی ہی نہیں۔ پہلے پیار کی لذت کم ہی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجئے کہ ان گیتوں میں ایک تواتر ہے، زندگی کا ایک حقیقی، یکساں بہاؤ —— اب چند گیتوں کے منظوم ترجمے ملاحظہ کیجئے:-

پھول محل میں کاہن بیٹھے، کھوئے ہوئے چپ چاپ!
من میں رادھا کی یاد آئی۔ آئی آپ ہی آپ!
من کو ایسی سوچ لگی جیسی پریمی کی سوچ،
الجھن بڑھتی جائے، مٹے پھر کیسے جی کی سوچ!
کاہن سکھیوں سے یوں پوچھیں "آؤ، مجھے بتاؤ!
"گھر والوں نے اس کو روکا یا ہے کرودھ سبھاؤ؟
"کیا مجھ سے بڑھ کر ہے گھر والوں کی دل میں چاہ؟
"یا سورج کی گرمی سے ہے تپتی ہوئی سب راہ!
"برا شگن ہے، بھلا شگن ہے؟ کچھ تو مجھے سمجھاؤ"
کاہن سکھیوں سے یوں بولیں "سچ سچ کہو، بتاؤ!"

سکھیاں بولیں "ہے من موہن! رادھا کا کیا حال!
"پل بھر میں آنے کو ہے، مٹ جائیں گے جنجال!"

(۲)

کیسے سکھ پائے رادھا دکھیا، زرد شریر!
کام دیو کے چنچل ہاتھوں نے چھوڑے تھے تیر!

دور کسی بستی میں پہنچی، سپنوں کا تھا ساتھ،
اور پہلو میں کاہن تھے، ہاتھوں میں تھامے ہاتھ!

کالے پھولوں والے بھنورے، اُن سے کہیو جائے،
"رات دنا کا درد تمہارا اب تو سہا نہ جائے!
"راجہ شیو جو لکشمی دیوی کا سرتاج کہائے"،
تیرے دکھ کو بس وہ جانے" ودیاپتی سنائے!

(۳)

پھول کھلا کانٹوں کے بیچ،
بھنورا اُڑ کر جائے نہیں!
سگھند بہاتے دیوانہ پر بھنورا پاس نہیں جائے!
ادھر بھی جائے اُدھر بھی جائے پھول کے پاس نہیں جاتا!
بھنورا اُڑ کر جائے نہیں،
پھول کھلا کانٹوں کے بیچ!

گھوم گھوم کر جگ پھر آئے،
دُور دُور سے پھول کو دیکھے،
پھول کی سندرتا من بھائے،
تکتا جائے، تکتا جائے،
پھول کے پاس نہیں جائے!

سُکھ کی سودھ پائے نہیں،
بھنورا اُڑ کر جائے نہیں،
پھول کھلا کانٹوں کے بیچ!

میٹھا امرت بھری مالتی، سندرتا نینوں کو بھائے!
جیون کی کچھ سوچ نہیں ہے، بھنورے کا من بھی للچائے!
من کو امنگیں ناچ نچائیں "پی لے جتنا بھی رس پائے"
لیکن بھنورا پاس نہ جائے!
پھول کھلا کانٹوں کے بیچ!

امرت سے بھرپور مالتی!
امرت پر جیون کی آس!
دور رکھے کیوں بھنورے کو یوں،
امرت بند رکھے کیوں پاس!

کیوں، تجھ کو اب لاج تو آئی!
سوچ ذرا تو من میں سوچ!
پیاسا بھنورا مر جائے تو
کس کا ہوگا، کس کا دوش!

ودیاپتی یہ بات بتائیں ۔
"جب تک بھنورا امرت پائے، جب تک سوُدھا دان مالتی،
بھنورے کے منہ میں ٹپکائے، تب تک بھنورا جیتا جائے!"

(۴)

پرتھم ملن یعنی پہلی ملاقات کے بیان میں سکھی رادھا کے متعلق
کہتی ہے:۔

رُک رُک کر وہ بول رہی تھی،
شرم سے اس کی آنکھ جھکی تھی،
لاج سے بات ہوئی کب پوری،
لب پر آئی بات ادھوری!
آج تھی اس کی چال انوکھی،
اک پل مانی، اک پل روٹھی!

بات سُنی جب رنگ بھاؤ کی،
زور سے موندیں آنکھیں اپنی!
ایک جھلک میں اس نے دیکھا،
پریم کا ساگر آنکھوں میں تھا!
جب دیکھا مُنہ چُوم ہی لے گا،
رُخ بدلا رادھا نے اپنا!
چاند کنول کو گود میں لے کر،
ڈوب گیا مستی میں یکسر!

ہاتھ کمر پر دیکھا اپنی،
ڈر کر چونکی، جھجکی، سمٹی!
دھیان اچانک جی میں آیا،
مال مدن کا چھن جائے گا!
جب پوشاک پریشاں دیکھی،
دونوں ہات سے گات چھپائی!
سب سنگار دکھائی دیتے۔

ہیرے موتی، ہار اور گجرے،
اس پر بھی پوشاک سنبھالے
سیج سے سندر ڈر کر بھاگے،
سُن کے کوئی کیا جانے، سمجھے!

(۵)

رادھا اپنے آپ سے۔

کب تک اس دل میں اُداسی ہی رہے گی کب تک؟
اور میری روح بارِ غم سہے گی کب تک؟
ماہ سے کس روز نیلو فر ملے گا، آہ! کب!
پھول بھنورے کے وزن سے کب ہلے گا؟ آہ! کب!
گفتگو کرنے کو پریمی مجھ سے کس دن آئے گا!
اور مرے سینے کو چھو کر ایک لذت پائے گا!
تھام کر ہاتھوں کو میرے، چاہ کے آغوش میں
کب بٹھائے گا مجھے وہ، آرزو کے جوش میں!
ہاں، اسی دن، ہاں اُسی دن سارے دکھ مٹ جائیں گے
جب مراری میرے بن کر گھر ہمارے آئیں گے!

(۶)

پیامی کی رادھا سے باتیں۔

"رات اجیالی، چنداوالی، اس کارن میں آئی،
"رادھا کے پتیم کا سندیسہ جی میں چھپا کر لائی!"
انگ انگ رادھا کا ایسی سندر جوت جگائے،
چندر اُجالا جس کے اندر گھل مل کر کھو جائے"!
نین کسی کے دیکھ نہ پائیں، دیکھیں تو کب جانیں؟
رادھا اور چندرماں دونوں ایک ہوں، کیسے مانیں"؟
"سندر! میں نے من میں سوچا، پھر نینوں کو کھولا،
کوئی نہ جگ میں ایسی سندر، میرا من یہ بولا!"
"تو یہ سمجھے تیری دردی کالی رات اندھیری،
تو اجیالی اُس کی بیرن، وہ ہے بیرن تیری!"
سوچ الجھاوے من کے کیسے! اٹھو، آؤ — آؤ،
راہ تکیں گھنشام تمہاری ان سے ملنے جاؤ"!

سب باتیں دوتی کی سُن کر رادھے کچھ نہیں بولی،
مدن دیونے راہ دکھائی، پیچھے پیچھے ہو لی!

(۷)

شیام کی اُودھو (پیامی) سے باتیں۔

بیت چلی ہے، بیت چلی ہے، بیت چلی ہے رات
اودھو! بیت چلی ہے رات
اب تک آئی نہیں ہے رادھے، سوچ کی ہے یہ بات
اودھو! بیت چلی ہے رات
رستے میں سو ڈر کی باتیں، بیری زہری ناگ
کوئی نہ جانے چھُپ کر بیٹھا کون لگائے گھات
اودھو بیت چلی ہے رات
شرمیلی، نرمل سی ناری سہم سہم نہ جائے
جگنو اُس کو راہ بتائے، تھام کے لائے ہات
اودھو! بیت چلی ہے رات
میں بھی اکیلا، وہ بھی اکیلی، دُور ہیں دونوں — دُور،
رات کا اندھیارا ہے گہرا، کالی، اندھی رات
اودھو! سوچ کی ہے یہ بات
اودھو! بیت چلی ہے رات!

شرمیلی، نرمل سی ناری، وہ آئی، وہ آئی؟
اچھا کہہ دے، رستے میں تو ڈر سے نہیں گھبرائی؟
تیرے من میں کون سی شکتی تجھ کو یہاں تک لائی،
ودّیاپتی یہ بات سمجھائیں، پریم کی شکتی، بھائی!

پریم کی شکتی لائی یہاں تک، پریم کی ہے کیا بات
اودھو! پریم کی ہے کیا بات!

(۸)

آج بنی ہے، آج سجی ہے، آج کیا سنگار،
رادھا! آج کیا سنگار!
آج وہ سارے ہوں گے پورے پتیم کے اقرار،

رادھا پریتم کے اُس پار!
راہ میں چلتے چلتے رادھا، راہ میں رُک رُک جائے،
دائیں دیکھے، بائیں دیکھے، پیچھے دھیان لگائے،
لاج سے لرزے، ڈر سے کانپے، ماتا، بندھو وارا،
ایکن سے باسے کوئی پازیبوں کی جھنکار!

نیلی ساڑی تن کو چھپائے، من کی اور ہی سار،
من کے اندر مستانی آشاؤں کے انبار!
من ساگر کے ایسے جھونکے، بل کھائے ہر بار،
پریم، آنند کی آس دلائے، پریتم سے نیّا پار،
رادھا! پریتم سے نیّا پار!

سکھی نے راہ بتائی، راہ میں رادھا جائے،
پلکیں نیچی ڈر سے نہیں ہیں، تن من سب شرمائے!
جیسے جنگل میں بیلیں رینگیں، رینگ رینگ کر جائیں
اور یوں آخر پیڑ سے لپٹیں، اپنی منزل پائیں!
یونہی رادھا راہ میں چلتی چلتی بڑھتی جائے،
چلتے چلتے، بڑھتے بڑھتے، منزل بھی آجائے!

(۹)

کرشن مہاراج اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔

بالاپن اور بھری جوانی
دونوں کا ہے سامنا
سُن لی اس نے میٹھی بانی،
آئی من میں کامنا؛
گھڑی گھڑی کیا سوچے من میں
کھوئی ہوئی ہے کس اُلجھن میں
کبھی سجائے گیسو اپنے، کبھی انہیں بکھرائے،
کبھی چھپائے تن من سارا، کبھی دکھاتی جائے!

پہلے سکھ کا تھا اُجیالا جن میں اب وہ نین،
ایسا بھاؤ دکھائیں جیسے بیکل ہوں، بے چین!
کونجیں کھائے ہوئے ہیں دونوں اودے اودے داغ،
بیاکل چال بتائے سونا سونا دل کا باغ!
مدن دیوتا آنکھیں موندے، جاگے نیند کو تیاگ،
ودیاپتی یہ کہیں مُراری! گاؤ دھیرج راگ!

(۱۰)

سکھی رادھا کی حالت بیان کرتی ہے:۔

چلے گئے گردھاری!
انکھین سے انسوؤن جل اُمڈے راہ تکے بے چاری!
پل پل چھن چھن کیسے کاٹے، پل پل چھن چھن بھاری!

اور رادھا کا دکھڑا سناتی ہے:۔

"ہونی نے دو لوک کیا یوں ۔۔ کیسے میں مُراری!
سجنی! دور گئے گردھاری!
گُن ہے کہہ دوں سجنی! اب میرے بات نہیں ہے بس کی!
کون کرم کا پھل ہے ایسا، پریتم ہوئے بدیسی!
مدن دیو کے تیروں نے کیا حالت کی ہے من کی!

برہن کی آہیں جا پہنچیں پہلو میں پریتم کے!
پریتم کے پہلو میں برہن کون سی بیٹھی جم کے!
پنچھی بن جاؤں تو اڑ کر اُن چرنوں میں جاؤں،
اپنے دکھ کا حال سناؤں، دکھ کا دارو پاؤں!
لائے کوئی پریتم کو میرے، میری جان بچائے!
دیکھ دشا برہن کے من کی دیا کسی کو آئے"!

ودیاپتی کہے سن رادھے! آن ملے گا پیارا!
چنچل من کو دھیرج دے لے، چھائے گا اُجیارا!

میراجی

غزل

رہیں نہ رند، یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیریٔ دام و قفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اُٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں، دسترس کی بات نہیں

انہیں بھی ہو نہ سکی ذکرِ غیر کی جرأت
کہ بزمِ عشق میں اہلِ ہوس کی بات نہیں

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما
یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں

عجب نہیں کہ محبت ہو زندۂ جاوید
کہ عرضِ شوق نفَس دو نفَس کی بات نہیں

اسدؔ یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

اسد ملتانی

چاند اور سورج

ابرِ سیہ کی فرسودہ چادر تاریک رکھتی کب تک یہ منظر
طلعت پہ ظلمت کیا غالب آتی کھلتے نہ کب تک فطرت کے جوہر
دامن گھٹا کا خود چاک کر کے دیکھو! وہ نکلا ماہِ منوّر
یہ "خاص منظر" "مہرِ مبیں" کا کتنا حسیں ہے اللہ اکبر

جو روپ اُس کا وہ روپ اِس کا
اتنا مشابہ چہرہ ہے کس کا

مُنظہر جلالی "مظہر جمالی" دونوں کی صورت ہے بھولی بھالی
دونوں سبک رَوان کی روش سے ظاہر نہیں ہے آشفتہ حالی
تابندہ اُن کے "فیضِ اثر" سے بزمِ خیالی ــــ بزمِ مثالی
دن اُس سے تاباں رات اِس سے روشن "زرکار مسند" کب دیکھی خالی

نظریں ہیں اِن پر حسنِ "اتم" کی
جلووں سے اُس کے شان اِن کی چمکی

خوبی سے کوئی کب ہے معرّا   قُدرت کا شاھد ہے ذرّہ ذرّہ
لیکن ہے ان کی شان اور ہی کچھ   ارض و سما کو ہے ان پہ غرّہ
آئے گہن میں بھی یہ تو کیا غم   ذات ان کی ظلمت سے ہے مبرّا
ہیں میرے روز و شب ان سے دلکش   ہوتا ہوں ان سے خوش روز مرّہ

کہتی ہے عشرت میری نظر کی
لے لو بلائیں شمس و قمر کی

خوش کُن جب ان کا جاہ و حشم ہو   ذوقِ نظر پھر کیوں میرا کم ہو
بالغ نظر ہوں اُس سے نہ کیوں خوش   کل "نُوریوں" کی ضَو جس میں ضم ہو
ہوں دیدہ ور کیوں اُس سے نہ شاداں   تاروں کا باقی جس سے بھرم ہو
ان کی نمودِ ظلمت رُبا پر   پرتو فگن جب "نورِ قدم" ہو

ہو چاند مدّھم یا ماند سُورج؟
چمکیں گے یونہی یہ چاند سورج

سیّد علی منظور

جنّت اور جہنّم

زینی کے تعلق میں کیا جانتا ہوں۔ یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا، انسان کی ذہنی کیفیتیں سمندر کے مدوجزر کی طرح دل کے ساحل پر آتی ہیں اور اکثر نہایت ہی لطیف، ناپائیدار اور مبہم نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ اور عموماً یہ مبہم سی تصاویر لہروں کے دوسرے ریلے ہی میں یوں فنا ہو جاتی ہیں، کہ پھر کوئی ان کا نام و نشان بھی نہیں پا سکتا۔ یا پھر نئے نقوش اپنی تزئین نو اور حسن امتزاج سے نئی جمالیاتی کیفیتیں پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے آغوش میں اس ساحل کی ریت کا ہر ذرہ گنگنا اٹھتا ہے۔ کیا اس سے پہلے بھی زندگی تھی! یا یہ نغمۂ حیات کی ایک اضطراری لے ہے!

لیکن بعض نقوش اس قدر ناپائیدار اور مبہم نہیں ہوتے، اور وہ ساحلِ حیات پر ایسی تصویریں کھینچ دیتے ہیں جو مدت تک قائم رہتی ہیں۔ ایسی ہی تصویروں میں سے ایک تصویر زینی کی بھی ہے۔ اور در اصل ایک ہی نہیں، بلکہ تین، کیونکہ جب کبھی مجھے زینی کا خیال آتا ہے، تو بیک وقت اس کی تین تصاویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ تین مختلف تصاویر، تین مختلف لمحے، نگاہ کے تین مختلف زاویے، جس طرح سات رنگوں سے مل کر قوس و قزح بنتی ہے اسی طرح ان تین تصاویر کی ترتیب سے زینی کی زندگی کی کہانی بن جاتی ہے لیکن یہ زندگی قوس و قزح سے بہت مختلف ہے۔ کہیں مختلف!

دیکھنے میں تو زینی قوس و قزح کی طرح ہی حسین تھی، میں نے جب پہلے پہل اُسے دیکھا، تو اس وقت میں سات پُلوں والے شہر کے سب سے خوب صورت پُل امیرا کدل پر جھکا ہوا جہلم کی سطح پر تیرتی ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہا تھا، یونہی بے کار سا، آوارہ سا، اکتایا ہوا، سری نگر کی دلچسپیوں کو ایک بے کیف سطحی انداز سے دیکھ رہا تھا، شکاروں کے لال لال پھولوں سے کاڑھے ہوئے پردے ایک طرف کو ہٹے ہوئے تھے، اور ان میں کہیں موٹے موٹے مردوں کے ساتھ پری وش عورتیں سوار تھیں، جن کے چہرے اور جن کے طلائی آویزے دوپہر کی دھوپ میں یکساں طور پر چمک رہے تھے،

کہیں تنومند، وجیہہ نوجوانوں کے ہمراہ بھدی اور بدشکل عورتیں اپنے بہترین لباس پہنے بیٹھی تھیں، اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں معلوم ہوتی تھیں، جو عورت جتنی زیادہ بدصورت تھی وہ اتنا ہی اچھا اور بھڑکیلا لباس پہنے تھی۔ در اصل پردہ کی رسم تو انہی عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی، اور ان کے شوہروں کے چہرے کم از کم اس وقت تو ہی خیال کے آئینہ دار تھے، بے چارے دوسرے شکاروں میں بیٹھی ہوئی خوبصورت عورتوں کی طرف گھور گھور کر اپنے نقصان کی تلافی کرنا چاہتے تھے، اور ان کی اپنی بیویاں نہایت دلفریب، میٹھی آوازمیں ہنس ہنس کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، کم از کم مجھے ان کی آواز بہت شیریں معلوم ہوئی، شیریں جیسے کوئل کی کوک، اور آخر کوئل کا رنگ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے!

شکارے خوبصورت اور بدصورت مخلوق سے لدے ہوئے تھے لیکن ان میں زندگی کی حرکت، بے چینی، اضطراب سب کچھ موجود تھا، وہ پانی کی سطح پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے، لال لال پردے ہلتے ہوئے دکھائی دیتے، بھدی شکلیں حسین تصویروں میں تبدیل ہو جاتیں، قہقہے اور ہانجیوں کے گیت ایک ہی نغمہ بن جاتے، اور وہ شکارے دربار ہال کے سامنے اُس کے چند سفید ستونوں کے قریب پہنچ کر شہر وینس کا سا نظارہ پیش کرتے ہوئے یکلخت موڑ پر غائب ہو جاتے، لیکن یہ حرکت، یہ زندگی اُن لمبے لمبے دوم درجے کے ڈونگوں یا ہوس بوٹوں میں نہ تھی جو پانی کی سطح پر چپ چاپ بدنما بطخوں کی طرح تیر رہے تھے، ان کی کھڑکیاں بند تھیں، لیکن پردے آویزاں تھے۔ صرف ایک ہوس بوٹ میں ایک کھڑکی کھلی تھی، کھڑکی کی دونوں طرف دو انگریز عورتیں اونی سویٹر بُن رہی تھیں، کیا یہ لوگ سری نگر میں سویٹر بننے کے لئے آتے ہیں، یا میری طرح پُل کے جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر محض تماشا دیکھنے کے لئے! . . . .

اور پھر اُس وقت مجھے زینی دکھائی دی جہلم کے پانی کا ایک ریلا

ہی اُسے میرے دل کے ساحل کے قریب کھینچ لایا، وہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کے کنارے پر کھڑی کشتی کا رخ بدل رہی تھی، رُخ بدلنے کا چپّو اُس کے ہاتھ میں تھا، اور چاندی کا ایک "جھمکا" اُس کے کان میں کسی خاموش نغمے کی گت پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا، پھر جیسے وہ بجلی کی تیزی کی طرح پُل کے نیچے سے گزر گئی، اور مجھے ڈونگے کا دوسرا سِرا نظر آیا، یہاں ایک لمبی سی ڈانڈ لئے ایک گیارہ بارہ سال کا لڑکا ڈونگے کو کھے رہا تھا، اُس کا گول سرخ و سپید چہرہ اور سر پر گول منقش ٹوپی بھی پل کے نیچے غائب ہوگئی اور جب میں نے مڑ کر دیکھا، تو وہ پل کی دوسری جانب آچکے تھے، وہ ڈونگے کو نچلے گھاٹ پر لگانے کے لئے رُخ بدل رہے تھے۔ ڈونگے کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں، اور ان کھڑکیوں کے زرد و زرد پردے ہوا میں لہرا رہے تھے، میں نے کن پٹیوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہوئے ڈونگے کا نام پڑھا، جو دھوپ میں چمکتے ہوئے نیلم کے ٹکڑے کی طرح درخشاں نظر آرہا تھا "The Heaven" "جنّت!" یہ نام غالباً کسی عیش پسند سیّاح یا کسی انگریز پادری نے رکھا ہوگا، جنّت اب نچلے گھاٹ کے قریب آرہی تھی، اس کے ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی کے اوپر ایک چوکور بورڈ لٹک رہا تھا، "TO LET" جنّت کرائے کے لئے خالی تھی، میں جنگلے سے ہٹ کر ایک دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا، زینی اور چھوٹا لڑکا اب اُسے کنارے پر باندھ رہے تھے معاً میرے دل میں ایک خیال آیا، اور میں ایک تیزی سے امیراکدل کے پُل سے گزرتا ہوا نچلے گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

زینی نے مجھے دیکھتے ہی سر جھکا کر سلام کیا، پھر وہ ڈانڈ کا سہارا لئے ایک عجیب جھجھک اور ایک عجیب بے باکی کے ساتھ کشتی کے کنارے پر کھڑی ہوگئی، اور چھوٹے لڑکے سے بولی۔ "عزیزا، صاحب کو ہوس بوٹ دکھاؤ!"

عزیزا ہنستا ہوا اُٹھا، وہ یونہی ہنس رہا تھا بغیر کسی وجہ کے کشمیری لڑکوں کی طرح، اس کے دانت جو ٹوتھ پیسٹ کے استعمال کے بغیر ہی غیر معمولی طور پر سفید تھے، اُس کے سُرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی لڑی کی طرح چمک رہے تھے، اُس نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بے پروائی سے زینی کے قدموں میں پھینک دی، اور پھر زینی نے اُسے جس ملائمت اور ملاطفت آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا ہے۔ اُسے کچھ میں ہی بہتر جانتا ہوں، اس کی آنکھیں عزیزا کی اس معصوم شوخی پر ایک دم اس طرح چمک اٹھیں جیسے سحر کے وقت ڈل کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہوجائے۔ اور جب میں عزیزا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، تو زینی کی تصویر آنکھوں کے سامنے ہی تھی۔

عزیزا کہنے لگا "یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ اس طرف آئینہ والا میز ہے، یہ لکھنے کا میز"۔

اور میں نے عزیزا سے پوچھا "کیا یہ ہوس بوٹ تمہارا ہے؟ اور وہ لڑکی کون ہے؟"

"وہ؟" عزیزا نے یونہی سر ہلاتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ زینی ہے، میری خالہ۔ یہ ہوس بوٹ زینی کے خاوند کا ہے، وہ نوکری کی تلاش میں سوپور گیا ہے۔ یہ اس الماری میں چینی کے برتن، دو سیٹ، چمچے پرچیں، یہ کھانے کے برتن، دو گیس لیمپ"۔

"اچھا، اچھا، آگے چلو"۔

"یہ سونے کا کمرہ ہے، وہ دوسرا کمرہ بھی سونے کا ہے۔ ان میں پانچ پلنگ آسکتے ہیں، میں اور زینی اُس کمرے میں رہتے ہیں، وہ چھوٹا سا کمرہ، جو کچن کے قریب ڈونگے کے دوسری طرف ہے۔

"اچھا چلو کچن دکھاؤ!"

سب کچھ دیکھ لیا، اس چھوٹے سے دوم درجے کے ڈونگے کو جسے زینی اور عزیزا فخریہ لہجہ میں اپنا ہوس بوٹ کہتے تھے۔ زینی اور عزیزا کے ہونے والے "صاحب" نے جسے پنجاب میں اُس کے سب دوست اس کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے "لگڑ بگڑ" یا "چرخ" کہتے تھے، سب کچھ دیکھ لیا، لیکن زینی کو بار بار دیکھ کر بھی اس کے دل کی پیاس نہ بجھی۔

"زینی!" میں نے اپنی پتلون پر سے مٹی کا ایک خیالی ذرّہ اُڑاتے ہوئے پوچھا "اس ——— زینی، اس ڈونگے کا میرا مطلب ہے اس ہوس بوٹ کا کرایہ کیا ہوگا؟"

زینی نے اپنی باریک آواز میں کہا "کیا صاحب یہیں رہے گا؟"

"ہاں، ہاں، اسی بوٹ میں"

"تب یہ کرائے کے لئے خالی نہیں"۔

"ارے ———" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "وہ کیوں؟"

عزیزا ہنستے ہوئے بولا "صاحب ہمیں وُلر جانا ہے، دراصل ہمیں سوپور جانا ہے، مگر راستے میں وُلر آئے گی جھیل وُلر، اور مانس بل، ہم یہ ڈونگا لے کر سوپور جائیں گے، جہاں زینی کا گھر والا گیا ہے، پھر ہم اس کو لے کر واپس آئیں گے، اگر صاحب کو وُلر دیکھنا ہے، تو منظور، ہم سب کچھ دکھائیں گے اور کرایہ بھی تھوڑا ہوگا۔ اگر صاحب کو ادھر ہی رہنا ہے، تو پھر ہم مجبور ہیں"

میں تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا، عزیزا کا ہنستا ہوا معصوم سا چہرہ بہت

پُر اُمید تھا، گویا وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا، چلو صاحب، وُلر دیکھنے چلو صاحب" میں نے زینی کی طرف دیکھا، زینی کا چہرہ آنچل کی اوٹ میں تھا، کیا وہ بھی اپنے خاوند سے ملنے کے لئے بے قرار تھی، اور تو ۔۔۔۔ اے شاعر مزاج آوارہ سیاح! تو اس خطرناک شغل کو کیوں پورا کرنا چاہتا ہے؟ ہوس کے غلام! کیا تیرے لئے اس دنیا میں کوئی اور کام نہیں؟ کوئی آرزو، کوئی مطمح نظر نہیں؟

لیکن دل کے ساحل پر اس قسم کی لہریں بہت ہی چھوٹی چھوٹی، ہلکی اور لطیف ہوتی ہیں، آئیں اور چلی گئیں، اور ساحل کی ریت اپنے چمکتے ہوئے لاکھوں ذروں کے ساتھ بدستور کسی محبوب کی منتظر رہتی ہے!

میں نے آہستہ سے کہا "اچھا، عزیزا، آج شام کو تم اس ہوس بوٹ کو امیرا کدل کے سامنے ۔۔۔۔ اس گھاٹ پر لے آنا، کل ہم وُلر چلیں گے"

"بہت اچھا صاحب" عزیزا نے پُر مسرت لہجہ میں کہا۔

زینی کا چہرہ بدستور آنچل کی اوٹ میں تھا!

(۲)

ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے رجہاں میں ٹھہرا ہوا تھا) راستہ بھر انسانی زندگی کی حماقتوں پر غور کرتا رہا حسن کیا ہے؟ اور انسان بد صورتی سے بھی زیادہ حسن سے کیوں متاثر ہوتا ہے؟ حسین پھول اتنے مرجھا جاتا ہے تو اسے آپ پاؤں تلے کیوں روند دیتے ہیں، اور کیوں ایک عورت پانچ بچے جننے کے بعد آپ کی تعریفی نگاہوں کی مستحق نہیں رہتی؟ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ ایک تنومند کسان دن بھر ایمانداری اور صدق دلی سے کام کرتا ہوا اور دن بھر خدا کو یاد کرتا ہوا بھی اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے نان و نفقہ مہیا نہیں کر سکتا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے گناہوں اور اوباشیوں کا بار گراں لئے ہوئے میدانوں کی تپتی ہوئی فضاؤں کو چھوڑ کر اس دلفریب وادی میں جنت کے مزے لوٹنے کے لئے آ جاتے ہیں، اور پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں غریب کی جنت ہتیالی، وہ اگلی دنیا میں بھی اس کی جنت نہ چھین لیں گے؟ تقدیر! تناسخ! رضا! اور پھر یہ تو زندگی کی حماقتیں ہیں ان کے بارے میں کچھ سوچا ہی کیوں جائے! کیا یہی کافی نہیں، کہ زینی حسین ہے اور اس کا خاوند سوپور گیا ہوا ہے، اور کل ہم اس کے ڈونگے پر سوار ہو کر وُلر دیکھنے جا رہے ہیں!

جب میں اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو سبھی میری رائے سے متفق نظر آتے تھے، گوربخش اپنی ڈاڑھی کو کلپ لگاتے ہوئے بولا، میں بھی چلوں گا"

بھیا لال بولا "میرے خیال میں آٹھ دس روز تو گذر ہی جائیں گے، اور آخر اب یہاں سری نگر میں رکھا ہی کیا ہے۔ کیوں سرفراز؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

محمود بولا "کیوں بھئی، میں بھی چلوں؟"

اب رہ گئے، اندرا اور رتبل۔ وہ دونوں بند کی طرف سیر کو گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ کشمیر آ کر زندگی کی حماقتوں پر غور کرنا بنفسہ سب سے بڑی حماقت ہے، اور اس کا ازالہ صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ وہ بھی وُلر کی سیر میں باقی احباب کا ساتھ دیں۔

گوربخش نے کہا "آج رات ہم ڈونگے ہی میں بسر کریں گے۔ سب اسباب لے چلو، ہارمونیم، طبلہ، گراموفون، کیمرہ، دوربین، بستر، مٹھائی، انڈے، کیک، پھل، اور ہاں میں بھول گیا تھا، تم لوگ اپنے لئے حجامت کا سامان بھی لیتے چلو، اور ہاں ارے سرفراز، تم وہاں سے اُس کمبخت ڈونگے والے ہی کو بلا لاتے، اُسی سے یہ سامان اٹھوا کر لے جانے کو کہتے"

"کوئی کم بخت آدمی اس ڈونگے کا مالک والک نہیں ہے، بلکہ اس کی مالک تو ایک لڑکی ہے" میں نے کہا۔

"لڑکی" سب نے یکایک چیخ کر کہا۔

"برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن!"

لیکن انہوں نے مجھے شعر پورا نہ کہنے دیا، دوسرا مصرعہ زبان سے ادا ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر وحشیوں کی طرح پل پڑے، "آبے گاؤدی نرے لگڑ بگڑ" "یا چرغ" "اس کا نام کیا ہے؟" "شکل کیسی ہے؟" "کچھ جی بتاتے ہو یا اپنا گلا دبواؤ گے؟"

. . . .

ہمیں سری نگر سے چلے ہوئے سات روز ہو چکے تھے، اور اب ہم اس دریائی زندگی سے بہت مانوس ہو چکے تھے، دن رات کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے سوا اور کیا کام ہو سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی برج کھیلتے اور کبھی کیرم۔ ڈونگا اپنی دھیمی چال سے جہلم کی سطح پر بہتا جا رہا تھا۔ محمود اکثر دوربین لگا اُن دور کے اور بلند سلسلہ ہائے کوہ کی طرف دیکھتا رہتا، جن کی چوٹیاں گرمیوں میں بھی برف پوش دکھائی دیتی ہیں۔ گوربخش ہارمونیم کے پردوں پر ہاتھ رکھے اپنے گلے سے سریلی تانیں نکالتا، اور بھیا لال اپنے دبلے پتلے جسم اور لمبے قد کے ساتھ بار بار ڈونگے کی چھت کو ہاتھ لگا کر ہم کوتاہ قدوں کی تضحیک کر کے اپنی بلند

کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتا ــــــ اور زینی ! لیکن زینی کے تو ہم سب پرستار تھے۔ گو میں اپنا حق سب پر فائق سمجھتا تھا اور یہ بات میں نے اپنے ساتھیوں پر اچھی طرح واضح کردی تھی، لیکن جلد ہی ہر ایک کو معلوم ہوگیا، کہ یہ چڑیا کسی کے جال میں پھنسنے والی نہیں۔ اُس کی ادائیں دلربا تھیں، اس کے گیت دلکش، اُس کی مسکراہٹ دل افروز لیکن اُسے اپنے خاوند سے محبت تھی، اُسے اپنے خاوند پر ناز تھا۔ جو سوپور میں تلاش معاش میں مصروف تھا، جب وہ چپّو چلاتے چلاتے یکایک ہنس پڑتی تو یہ ہنسی ہم میں سے کسی کے لئے نہ ہوتی عزیزا کے لئے بھی نہیں، جو اُسے اتنا پیارا تھا، پھر کبھی چپو ہاتھ سے چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوکر انگڑائی لیتی اور پھر مغرب کی طرف دیکھنے لگ جاتی، جدھر سوپور تھا۔ اُس وقت گوربخش ایک بے سرے لہجے میں چلّا اُٹھتا۔ "دلدار کنداں والے وا ــــــ دلدار!"

بھیّالال نے تو پہلے دن ہی زینی کو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا۔ "شکل و صورت سے تو میں روائتی مجنوں ہوں، لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ لیلےٰ مجھے محبت کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتی، اور اس لیلیٰ پر ہی کیا موقوف ہے۔ دنیا کی کسی لیلیٰ کو بھی میری چاہ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے آے میری پیاری لیلےٰ! "گڈ بائی"۔ لیکن بھیّالال ہی پر کیا منحصر ہے، قریباً قریباً یہی حال ہر ایک کا تھا، شروع شروع میں گوربخش نے زینی کو ایک دو دن سریلے عشقیہ گیت سنائے تھے، اور کچن میں بیٹھ کر مچھلیاں بھونتے بھونتے اسے مچھلیوں کی بھی ایک پلیٹ پیش کی تھی۔ اور کبھی کبھی اندر اور مِتّل پھلوں کے ٹوکروں میں سے سیب اور ناشپاتیاں چرا کر اُسے دے دیا کرتے تھے اور ہاں کبھی کبھی کیک کے ٹکڑے بھی، لیکن اب چند دنوں سے یہ فیاضی بند کردی گئی تھی۔ اور اب سب لوگ زینی کو قریباً بھول گئے تھے۔ اب وہ دن رات کھانا پکانا گانا، ناچنا، جہلم میں تیرنا اور اسی قسم کے کاموں میں منہمک رہتے تھے، ہر ایک چہرہ بشاش نظر آتا تھا، اور ان سات دنوں کے قلیل عرصہ ہی میں ہر ایک کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کا وزن پہلے سے دگنا ہوگیا ہے!

بھیّالال نے اپنی پتلی کمر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، "ارے یار، میں تو سچ مچ موٹا ہو رہا ہوں، اب یہ پتلون مجھے کمر کے گرد چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔"

اندر نے اپنے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے گال اب اُتنے پچکے ہوئے نہیں رہے!"

مِتّل بولا " اب میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے گالوں پر سرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے!"

محمود جو اشتراکی خیالات رکھتا تھا طنزیہ لہجہ میں بولا "ہاں، انقلاب قریب آرہا ہے"!

. . . .

انقلاب تو خیر ایک دور از کار بات تھی، لیکن اس میں شک نہ تھا، کہ سوپور ضرور قریب آرہا تھا، کل وُلر اور پرسوں سوپور، اور پھر شاید زینی کی یہ شوخ ادائیں ہمیں عمر بھر میسّر نہ آسکیں گی، میں کچن کے دروازے پر کھڑا ہوکر زینی کی طرف دیکھنے لگا، جو ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چپّو سے کشتی کا رُخ ٹھیک کر رہی تھی، ڈونگے کے دوسرے سرے پر کہیں عزیزا اپسینہ میں تربتر ڈانڈ چلا رہا ہوگا" میں نے دل میں سوچا بے چارہ غریب گیارہ سال کا لڑکا، لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے، کچن کے عقب میں جو کمرہ تھا۔ وہاں محمود سویا پڑا تھا، اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی، کبھی کبھی ڈرائنگ روم سے ہنسی کی ایک بلند چیخ سنائی دیتی۔ اندر نے برج کھیلتے وقت بلف سے کام لیا ہوگا۔

زینی نے کہا، "صاحب، کل ہم وُلر پہنچ جائیں گے"۔

"جھیل وُلر کیا بہت خوب صورت ہے"؟

زینی سر ہلاتے ہوئے بولی جی صاحب! جدھر نظر اٹھاؤ، پانی ہی پانی، تیرہ چودہ میل تک، چاروں طرف نیلا پانی، اور بیچ میں کہیں کہیں کنول کے لاکھوں پھول کھلے ہوئے اور سری بٹ ناگ . . . "

"سری بٹ ناگ کیا"؟

"بٹ ناگ وُلر کا دیوتا ہے، وُلر کا بادشاہ ہے، وہاں ہر ایک سیاح کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا انگریز، کچھ نذر دینی پڑتی ہے"۔

"اور اگر وہ نہ دے"؟

"تو اس کی کشتی ڈوب جاتی ہے"۔

"اچھا . . . تو کیا جھیل وُلر بہت خوبصورت ہوگی"؟

"صاحب خود دیکھ لیں گے"۔

"تم سے بھی زیادہ خوب صورت"؟ میں نے زینی کے قریب جاکر کہا،

زینی کا چہرہ جو پہلے ایک سیب کے پھل کی طرح تھا۔ اب ایک گلاب کا پھول بن گیا اُس نے شرما کر اپنا منہ موڑ لیا۔

میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا، اور

زینی کے ہاتھ میں دے دیا، اور جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا "یہ لو اسے سری بٹ ناگ کی نذر کر دینا"۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر یک لخت زینی چپو چھوڑ کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا، گلاب کا پھول ایک شعلہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کانپتے ہوئے نوٹ کو زور سے اپنی مٹھی میں مسل ڈالا اور پھر اسے تیزی سے پانی میں پھینک دیا۔ زینی کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں نمدار ہو گئی تھیں، اور بالوں کی ایک لٹ داہنے رخسار پر اتر آئی تھی۔

یہ زینی کی دوسری تصویر ہے جو آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں آج بھی آنکھیں بند کر کے تصور سے اسے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھتے دیکھ سکتا ہوں۔

میں دیر تک کچن کے دروازے کے قریب کھڑا رہا، محجوب اور پشیمان، اپنی شکست کی زندہ تصویر۔ نوٹ چکر کاٹتا ہوا پانی کی سطح پر بہہ رہا تھا۔ آخر اسے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی حصہ میں شفق کی لال گوں لہریں غائب ہو گئیں اور رات کی سیاہ چادر پر تاروں کی افشاں چن دی گئی۔ ان تاروں کی شوخ ہنسی گویا مجھے بار بار کہہ رہی تھی "کیوں، کیا تم زینی کو بھی ایک مچھلی سمجھتے تھے۔ وہ مچھلی جو تمہارے پانچ روپے کے نوٹ کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر چپ چاپ نگل جاتی۔ لیکن وہ پانی کی مچھلی نہیں آدم کی اولاد ہے۔ اسے اپنے بھلے برے کی تمیز ہے، وہ غریب ہے تو کیا ہوا، وہ تمہارے روپوں کی محتاج نہیں، تم اسے نہیں خرید سکتے، کبھی نہیں خرید سکتے"!

دوسرے دن ہم ولر کے کنارے پہنچ گئے، اور ہم نے اپنے ڈونگے کو وہاں بندھوایا جہاں دریائے جہلم جھیل ولر میں داخل ہوتا ہے۔ حدِ نظر تک سمندر کی طرح نیلا پانی پھیلا ہوا تھا، اور دور بہت دور چاروں طرف ایک سلسلۂ کوہ ایک نیلگوں دیوار کی طرح نظر آ رہا تھا، مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھیل کے اوپر پرواز کر رہے تھے، چار پانچ کشتیاں جھیل کی سطح پر بچوں کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے کس سی نظر آ رہی تھیں۔ ہوا ساکن تھی، ورنہ اگر ہوا زور کی چل رہی ہوتی، تو اس جھیل میں بیس بیس فٹ کی لہروں کا پیدا ہونا مشکل نہ تھا، اور پھر پانی کی ان طوفانی دیواروں کے آگے کشتیاں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں،

لیکن گو ہم سارا دن ایک کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں گھومتے رہے، ہوا بالکل ساکن رہی، اور جھیل کی سطح نیلے رنگ کے شیشے کی طرح بالکل شفاف اور غیر متحرک۔ ہم نے سری بٹ ناگ دیکھا، یہ ایک بہت بڑا بھنور تھا جو جھیل کی مغربی سمت میں ایک گول دائرہ بناتا ہوا گھوم رہا تھا، اور بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن ہم نے کشتی کے ملاحوں کے کہنے پر بھی ولر کے اس بے تاج بادشاہ کو ایک پیسہ تک نذر دینا گوارا نہ کیا، اور پھر ہم نے سری بٹ ناگ کا ایک وزیر بھی دیکھا جو ایک چھوٹا سا بھنور تھا، اور پہلے بھنور سے قریباً چار میل کی دوری پر واقع تھا، یہاں البتہ گوربخش نے جو تیز ناکم جانتا تھا، ایک دو ناشپاتیاں وزیر کی نذر کیں، جو خدا جانے کتنے دنوں سے بھوکا تھا۔ کیونکہ ملاحوں کے کہنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ آخری حادثہ آج سے دو مہینہ پیشتر تین انگریزوں کو پیش آیا تھا، جو اس جھیل میں کشتی چلاتے چلاتے ان طوفانی لہروں کا شکار ہو گئے جو فی الفور ایک تیز جھکڑ کے چلنے سے پیدا ہو گئی تھیں۔

سہ پہر کے بعد جب ہم جھیل کی سیر سے لوٹے تو زینی اور عزیزہ دونوں کو زار و قطار روتے ہوئے پایا، پوچھنے پر پتہ چلا کہ زینی کا خاوند سوپور سے پنجاب چلا گیا تھا۔ روزگار کی تلاش میں، ایک آدمی سوپور سے آیا تھا وہ ادھر سے گذر رہا تھا اور اس سے پوچھنے پر یہ سب حال معلوم ہوا۔ ہم نے زینی اور عزیزہ کو جہاں تک ہو سکا تشفی دینے کی کوشش کی لیکن ان کے آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے وہ اپنے آپ کو اب بالکل بے یار و مددگار پاتے تھے، اور بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

طبیعت بہت عرصہ تک کبیدہ رہی، یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں۔ رونے سے کیا ہوتا ہے؟ اور پھر کیا اس بے وقوف کشمیری کو اس کے اپنے وطن میں کوئی کام نہیں مل سکتا تھا! پنجاب میں اسے کیا قارون کا خزانہ مل جائے گا! گدھے، بے وقوف، غریب، ان میں عقل تو بالکل نہیں ہوتی، محض بوجھ اٹھانا جانتے ہیں، خچروں کی طرح، انہیں انسان سمجھنا ہی حماقت ہے، ان کے ساتھ خچروں کا سا ہی سلوک ہونا چاہئے۔ غریب لوگ غریب ہی رہیں تو ٹھیک طرح کام کرتے ہیں، اگر انہیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے لگے تو اکڑ جاتے ہیں۔ غرضکہ طبیعت بہت منغض رہی، ہم سب لوگ اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہے تھے، اور یہ احساس ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد بھیا لال کے لطیفوں سے طبیعت کسی قدر بہلی، گوربخش نے گراموفون پر چند دلکش ریکارڈ سنائے، اور ہماری محفل پھر قہقہوں سے گونج اٹھی۔

(۳)

دس بجے کے قریب جب "برج" شروع کی گئی، تو میں دردِ سر کا بہانہ کرکے اُٹھ آیا، دراصل میں برج کھیلنا نہیں چاہتا تھا، پہلے میں سونے کے کمرے میں گیا، پھر میں نے کچن میں جاکر پانی کا ایک گلاس پیا، لیکن طبیعت میں بے کلی بدستور موجود تھی، میں کچن سے ہوتا ہوا باہر ڈونگے کے کھلے فرش پر آگیا۔

زینی ہاتھ میں چپو لئے جھیل کے نیلے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ ڈونگے کے کنارے پر بیٹھی تھی، اور اُس کے قدموں میں عزیزا لیٹا ہوا تھا، نہیں، وہ رو رو کر سو گیا تھا، اس کی پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے، اس کے لبوں سے اب بھی کبھی کبھی کوئی سینے میں دبی ہوئی سسکی نکل جاتی تھی۔

اور زینی؟ —— وہ کیا سوچ رہی تھی؟ —— کیا اس کی نظر جھیل کی وسعتوں سے پرے پنجاب کے میدانوں تک پہنچ رہی تھی، جہاں اُس ظالم پردیس میں، شاید کسی لکڑی اور کوئلہ کی دکان کے آگے اُس کا خاوند لیٹا ہوا تھا، دن بھر کی محنت مشقت سے چُور —— ایک تھکی ہوئی خچر کی طرح ہانپ رہا تھا، زینی کا چہرہ اداس تھا، اُس کی آنکھیں جیسے خلا میں کچھ دیکھ رہی ہوں۔

"زینی!" میں نے آہستہ سے کہا

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"مجھے بہت افسوس ہے زینی!"

زینی کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا۔

"زینی تم گھبراؤ نہیں" میں نے آہستہ سے کہا

"صاحب، اب ہم کیا کریں گے؟" زینی نے گلوگیر لہجہ میں کہا "اب ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں —— ایک خاوند تھا۔ وہ پردیس چلا گیا"

"عزیزا چھوٹا سا بچہ ہے . . . . .

"میں عورت ذات ہوں . . . . .

"ہائے اب کیا ہوگا"

زینی کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں، میں اُس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا "کیوں گھبراتی ہو۔ زینی! تمہارا خاوند ضرور پردیس سے واپس آجائے گا۔ اور ——"

زینی نے روتے ہوئے کہا "صاحب، میں مرجاؤں گی، اور چھوٹا عزیزا بھی بھوکا مرجائے گا۔ ہائے اُس نے ہمیں دھوکا دیا!"

"مت گھبراؤ زینی، میں تمہارے لئے . . . . میرا مطلب ہے میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہوں، ہاں تم روتی کیوں ہو، میری اچھی زینی، مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے، بے اندازہ محبت۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، . . . ."

یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے شعلے کی ایک بلند لپک پیدا ہوتی ہے، اسی طرح زینی کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک پیدا ہوئی۔ لیکن پھر فوراً ہی بجھ گئی، تیل ختم ہوچکا تھا اور پھر غریبوں کے پاس سرمایہ ہی تھا ہی کہاں ہے۔ زینی ایک ٹوٹی ہوئی بیل کی طرح میری آغوش میں گر پڑی اور اس نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو میرے بازوؤں میں چھپا لیا —— اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی"

چاند کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، ستارے نادم تھے، وہ جہلم کی سطح پر باسی پھولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا کنول کے پتوں کے قریب سے گذرتی ہوئی آہیں بھر رہی تھی، کائنات کا ہر ذرہ سر جھکا کر اداس لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ تم نے ہمیں خرید لیا،

صرف ڈرائنگ روم سے گزبخش کے گانے کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی، وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

کرشن چندر

شعر

عمر اس سوچ میں تمام ہوئی
کیا ہوا اور ہائے کیا نہ ہوا

بسنت سہائے

ستار

حورِ فردوسی کوئی پردوں میں تیرے سوگوار — اپنی نرم آواز میں ہے نوحہ ریز و اشکبار

تیرے ان دھیمے سُروں کی گود میں سو جاؤں میں — خواب کی دنیا کے وِیرانوں میں گُم ہو جاؤں میں

سِحر کی بارش کہیں پریوں کی آبادی میں ہے — آبشارِ نور یا فردوس کی وادی میں ہے

تجھ میں پنہاں ہیں مری سلمیٰ کی سب رعنائیاں — اس کی آوازِ سرور آگیں کی نغمہ زائیاں

صبح کی بیداریاں اور شام کی خاموشیاں — عشق کی رُسوائیاں اور حُسن کی رُوپوشیاں

عاجزی، اصرار، بے تابی، سکونِ عافیت — بے زبانی سے بیانِ نکتہ ہائے معرفت

یہ گدازِ روح یہ سوزِ تمنّا ہائے ہائے

یہ زبانِ شعلہ سے فرقت کا نوحہ ہائے ہائے

اے نکل آ کون اس پردے میں ہے آتش بجاں — اُٹھ رہا ہے تیری آہوں سے مرے دل میں دھواں

کوئی عالم ہے الگ اس عالمِ ادراک سے — تیرے تاروں سے اُبلتے ہیں اُسی کے زمزمے

کوئی دنیا اور ہے دنیائے آب و گِل سے دُور — علم سے دُور آگہی سے دور چشم و دل سے دُور

تو اُسی دنیا کا اک پیغام ہے بے حد لطیف

جو اُٹھا سکتا نہیں الفاظ کا بارِ کثیف

عرشی امرتسری

چھائی کالی رات

چھائی کالی رات جگت میں چھائی کالی رات

(۱) پاپ کی گھر کر آئیں گھٹائیں
لوٹ پھوٹ کی چلیں ہوائیں
کرودھ کی اگنی بڑھتی جائے
ستم کی ناگن سی لہرائے
انسانوں کے روپ میں ڈاکو پھریں لگائے گھات
جگت میں چھائی کالی رات

(۲) اے داتا کیا جادو پھیرا
اُکھڑ گیا سُکھ چین کا ڈیرا
گھر گھر کنگالی نے گھیرا
روگ بھوگ نے کیا بسیرا
سُوکھ سوکھ کر کانٹا ہو گئے کومل۔ سندر گات
جگت میں چھائی کالی رات

(۳) پھنسی بھنور میں جیون نیّا
دکھ ساگر میں کون کھوّیا
بیٹا بیری دشمن بھیّا
کون پتا اور کس کی میّا
پیاری بیوی بھی تو بدھاتا من کی نہ پوچھے بات
جگت میں چھائی کالی رات

(۴) موت کے پھندے جکڑ رہے ہیں
عقل کے اندھے اکڑ رہے ہیں
محل رہے ہیں بگڑ رہے ہیں
آس کے پودے اُجڑ رہے ہیں
ننگی ننگی ٹہنی روویں لٹے پھول اور پات
جگت میں چھائی کالی رات

(۵) بپتا پڑی سروں پر بھاری
زخم دلوں پر ہوئے ہیں کاری
چیخ رہے ہیں نر اور ناری
آنکھوں سے سوتے ہیں جاری
اُلٹے کیا تقدیر کے پانسے جیون ہو گیا مات
جگت میں چھائی کالی رات

اندر جیت شرما

شعر میں اظہار اور ترجمانی

اس مضمون میں ہمیں اس معاملے پر غور کرنا ہے کہ شعر کی ادبی قیمت کامیاب اظہار پر منحصر ہے یا کامیاب ترجمانی پر۔ پہلے ہم دو الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔ اگر شاعر پڑھنے سننے والوں کا تصور کئے بغیر محض اپنی تسکین کے لئے کسی جذبے کو ادا کرنے کی کوشش کرے تو اس عمل کو اظہار کہیں گے اگر شاعر یہی جذبہ نہ صرف ادا کرے بلکہ اسے دوسروں تک بھی پہنچائے تو اس دوسروں تک پہنچانے کے عمل کو ہم ترجمانی پکاریں گے۔ اس سلسلہ میں دو ضروری سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شعر لکھنے سے شاعر کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اظہار یا ترجمانی؟ دوسرا یہ کہ ان دونوں میں سے شعر کو جانچنے کا قطعی معیار کونسا ہے! پہلے اس مسئلہ کو لیجئے کہ شعر لکھتے وقت شاعر کو اپنی تسکین مدنظر ہوتی ہے یا دوسروں کی! وہ شعر اپنے لئے لکھتا ہے یا پڑھنے والوں کے لئے۔ اس کا جواب تو شاعر ہی سے پوچھنا چاہیئے لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ہر وقت کسی پڑھنے یا سننے والے کا تصور سامنے نہیں رکھتا۔ وہ کسی موہوم جذبہ یا گمنام الجھن کے زیر اثر شعر لکھنے بیٹھتا ہے اور اُس کا فوری مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ایک حسین اور واضح صورت میں اُس کے سامنے آجائے۔ اور اس مقصد کا پورا ہو جانا اس کی تسکین کے لئے کافی ہے۔ اگر وہ دوسروں سے داد کا طالب ہو تو بھی اُسے اپنی ہی تسکین مطلوب ہوتی ہے۔ اگر دوسرے بھی اس کے جذبات کو سمجھیں یا اُن سے متاثر ہوں تو وہ اسے اظہار ہی کی کامیابی سمجھتا ہے اس کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر شاعر کو کسی غیرآباد جزیرہ میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ جہاں پڑھنے سننے والے کا وجود نہ ہو تو وہ شاعری کی حرکت سے پھر بھی باز نہیں آئے گا۔

شاید اس پہ یہ اعتراض کیا جائے کہ شاعری کی بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن میں روئے سخن ہوتا ہی کسی سننے والے کی جانب ہے اور بعض نظمیں لکھی ہی اس لئے جاتی ہیں کہ اوروں کو سنائی جائیں۔ مثلاً قصیدے۔ قصے کہانیاں۔ اخلاقی پیغامات وغیرہ یہ بھی کلی طور پر صحیح نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کسی شخصیت، کسی کہانی یا کسی اخلاقی نظریے سے اتنا متاثر ہو کہ محض اپنے تاثر کا اظہار کرنے کے لئے قصیدہ یا کہانی لکھ دے اور لکھتے وقت کسی سننے والے کا تصور نہ کرے۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ اگر شاعر کو ہمیشہ اظہار ہی سے مطلب ہوتا ہے اور ترجمانی محض اتفاقی امر ہے جس کا شاعری سے براہ راست کوئی تعلق ہے ہی نہیں تو اظہار اور ترجمانی کی بحث کو یہیں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اگر ترجمانی شاعر کا مقصد کبھی ہوتا ہی نہیں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ترجمانی اس کا مقصد ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اظہار کا عمل بذات خود ایک ترجمانی ہے۔ جب شاعر کسی پوشیدہ تجربے کو ظاہری صورت میں پیش کرتا ہے تو ارادی یا غیرارادی طور پر اُس کی ترجمانی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ترجمانی اس کی اپنی ذات تک ہی محدود رہے اور دوسرے لوگ اس میں شریک نہ ہو سکیں۔ اب ہم اس سوال پر بحث کر سکتے ہیں کہ اُس کی ترجمانی کو وسیع ہونا چاہیئے یا نہیں اور اُس کے اشعار کی قیمت اس ترجمانی کی کامیابی کا نتیجہ ہوتی ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کاغذ پر چند الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر کہے کہ یہ ہے روضۂ تاج محل، آپ اُس کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اور فرمائیں کہ ہمیں تو یہ اقلیدس کی پندرھویں شکل کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے روضۂ تاج محل کی سی تو اس میں کوئی بات نہیں لیکن وہ شخص اسی بات پر مصر رہے کہ میرے ذہن میں روضۂ تاج محل کا تصور یہی ہے۔ میں نے اپنے تصور کا اظہار کر دیا اور میں اسے کامیاب سمجھتا ہوں۔ اب یہ آپ کے ذہن میں آئے یا نہ آئے میری بلا سے، ان حالات میں آپ دونوں میں سے کس کی بات تسلیم کی جائے اور کس کا معیار صحیح مانا جائے۔ اسی طرح اگر شاعر اپنی نظم میں کسی تجربے کا بزعم خود بخوبی اظہار کر دے لیکن ہمارے پلّے خاک نہ پڑے تو ہم شاعر کو الزام دیں یا اپنے آپ کو؟ ظاہر ہے کہ شاعر شعر کو اپنے معیار سے جانچے گا۔ اور آپ اپنے معیار سے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ ان دونوں معیاروں میں سے آخری اور قطعی کونسا ہے؟ نقاد! لیکن نقاد

بھی تو آخر آپ ہی میں سے ہے اور وہ جو کچھ کہے گا پڑھنے والے ہی کے نقطۂ نظر سے کہے گا۔ آپ کو یا آپ کے نقاد کو کیا حق پہنچتا ہے کہ شاعر کو اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور کرے۔ شاعر کی تسکین ہو یا نہ ہو۔ آپ کا مطلب نکل جائے! اس کا ہم یہ جواب دیں گے کہ اگر شاعر ہمیں شعر سناتا ہے تو ہم اُسے اپنے ہی معیار سے جانچیں گے۔ اگر اُسے یہ معیار پسند نہیں تو اپنے شعر اپنے پاس رکھے اور بڑی خوشی سے پڑیاں باندھ کر ان میں ہاضمہ کا چورن بیچا کرے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارا مغز چاٹے گا تو ہم اس سے معاوضہ بھی طلب کریں گے اور وہ یہی ہے کہ شعر کے تصور اور تخلیق میں جو راحت اس نے محسوس کی ہے اس میں ہمیں بھی شریک کرے۔ اُس نے جو کچھ دیکھا ہے ہمیں دکھائے اور جو کچھ سنا ہے ہمیں سنائے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کے اصول ہمیشہ پڑھنے والے وضع کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک شعر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ شعر کا مضمون اُن تک زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ سے پہنچے۔ پہلی خوبی اس لئے کہ جب تک ہم شعر کو سمجھیں گے نہیں شعر کی باقی خوبیاں ہمیں نظر ہی نہیں آئیں گی۔ شاعر کے تجربہ میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی کیوں نہ ہو اگر ہم واجبی کوشش کے باوجود اس تجربے کو ذہن میں نہیں لا سکے تو شعر کو لازماً ناکامیاب ٹھہرائیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اول تو اس مضمون میں وسعت نہیں ہے اور اگر ہے تو فی بطنِ شاعر ہے فی بطنِ شعر نہیں۔ غالباً دنیا کا کوئی شعر بالکل مہمل اور بے معنی نہیں ہوتا کیونکہ شعر لکھتے وقت شاعر کے ذہن میں کوئی نہ کوئی خیال تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ہم ہر اس شعر کو مہمل کہنے میں حق بجانب ہیں جس میں یہ خیال ہم تک نہ پہنچے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر وہ شعر جو فوراً ذہن میں آجائے اچھا ہے اور ہر وہ شعر جو فوراً ذہن میں نہ آئے بُرا ہے۔ اگر شعر فوراً ذہن میں آجائے تو یہ ایک خوبی ضرور ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ شعر میں اور بہت سی برائیاں ہوں جو اس خوبی کو رد کر دیں یا شعر کا مضمون اتنا پامال ہو کہ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اسی طرح اگر شعر فوراً ذہن میں نہ آئے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر نے شعر میں اتنے تصورات یکجا کر دیئے ہیں کہ ان کا یکدم ذہن میں آجانا مشکل ہے۔ اس صورت میں ہم شعر پر جتنا زیادہ غور کریں گے۔ اسی قدر اس سے لطف اندوز ہوں گے اور ہمیں اس میں ہر بار کوئی نئی خوبصورتی نظر آئے گی۔

اس بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ شعر کی کامیابی اظہار پہ نہیں۔ ترجمانی پر منحصر ہے۔ ہم کسی اظہار کو اس وقت تک کامیاب کہہ ہی نہیں سکتے۔ جب تک وہ دوسروں کے لئے ترجمانی کا حق ادا نہ کرے۔

یہاں ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ شاعر کا کلام باقی رہتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاعر کا کلام اُس کے اپنے عہد کے لوگ نہ سمجھیں لیکن بعد میں آنے والی نسلیں اُسی کلام کو شاعری کا معراج قرار دیں یا کوئی شاعر اپنے عہد میں آسان لیکن آئندہ زمانہ میں ناقابل فہم ہو جائے۔ غالب کو ہی لے لیجے۔ غالب کو ہم بہت بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن سنا ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اُس کا کوئی چرچا نہیں تھا اور لوگ اُسے مہمل گو کہتے تھے۔ اگر شاعر کا مقصد ترجمانی یا اپنے مضمون کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو وہ لوگ بھی سچے تھے اور ہم بھی سچے ہیں اور اس طرح ترجمانی کوئی قطعی معیار تو نہ رہا۔ اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو یہ بات ہے ہی غلط کہ غالب کے زمانے میں اس کے قدردان نہیں تھے۔ غالب کو سراہنے والوں کی اُس زمانے میں بھی کمی نہ تھی اور غالب کو کوسنے والے آج بھی موجود ہیں۔ غالب سے لوگوں کو اختلاف اُس کے مضامین کی وجہ سے نہیں اُسکے نظریۂ شاعری کی وجہ سے تھا۔ آخر ناسخ کی بھی تو قدر ہوئی اور اُستاد ذوق کا کلام بھی زیادہ سلیس نہیں۔ معاملہ اصل میں یہ تھا کہ لوگ لفظی صنعتوں کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔ لیکن غالب اس راستہ سے ہٹ کر خالص جذبات کی مصوری کرنا چاہتے تھے۔ بعض اشخاص کو یہ چیز عجوبہ سی معلوم ہوئی اور وہ اس کی فنی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کل بھی غالب کی عظمت اس کے سلیس اشعار کی وجہ سے قایم ہے نہ کہ مشکل اشعار کی وجہ سے اب بھی غالب کے بعض اشعار ہمیں اتنے ہی مہمل معلوم ہوتے ہیں جتنی کہ ڈاکٹر ٹیگور کی تصویریں۔ پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تجربات اور جذبات نہیں بدلتے اگر شاعر نے ان کی کامیاب ترجمانی کی ہے تو ان اشعار کی قیمت وقت اور مقام کی پابند نہیں۔ اگر یہ سب دلیلیں رد کر دی جائیں تو بھی ہم یہی کہیں گے کہ اگر غالب کو اُس کے عہد میں داد نہیں ملی تو اس وجہ سے کہ لوگ اُس کے اشعار سمجھ نہیں سکے اور اگر ہم اُسے داد دیتے ہیں تو اس وجہ سے کہ ہم اُس کے اشعار سمجھ سکتے ہیں۔ معیار پھر بھی ایک ہی رہا۔ اگرچہ اُس کے دائرہ اور وسعت میں تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس لئے ایک اچھے شعر یا اچھی نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اُس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور برجستگی سے پہنچے تاکہ وہ اِسے سمجھ سکیں۔ اس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہنچائیں۔

فیض احمد

مقصدِ حیات

شاعر

میں نے پوچھا پھول سے یہ ذرا بتا مجھے
تو ہے شادماں تو کیوں تو ہے عیش ساں تو کیوں

گل

بولا پھول ہنس کے یوں خوش نہ ہوں تو کیا کروں
میں خوشی کے واسطے اور خوشی مرے لئے
آفتاب اور قمر نور اختر سحر
سب طرب نواز ہیں عشرتوں کے ساز ہیں
یہ ہے عیش کی بساط زندگی ہے انبساط
زندگی ہے قہقہا اور اس کے ہے سوا

مقصدِ حیات کیا!

شاعر

پوچھا عندلیب سے تو ہی کچھ بتا مجھے
تو ہے اشکبار کیوں! تو ہے بے قرار کیوں!

عندلیب

بولی عندلیب یوں دل ہو خوں تو کیا کروں
لطفِ درد و غم نہ پوچھ لذتِ الم نہ پوچھ
زیست عارضی نہیں یہ غم و خوشی نہیں
زیست کا ہے ساز درد ہے ازل کا راز درد
گر نسیم آہ ہے اس میں کیا گناہ ہے
اشکِ شبنمِ سحر دل ربا ہے کس قدر
یہ نجوم و ماہتاب کرہ ہائے اضطراب
آفتاب و کہکشاں شعلہ ہائے کن فکاں
سب کا ہے پیامِ درد درد ہے، تمام درد
زندگی ہے آہِ سرد
زندگی ہے مرثیہ اور اس کے ہے سوا

مقصدِ حیات کیا!

شاعر

پوچھا میں نے خار سے تو ہی یہ بتا مجھے
تو ہے بے خروش کیوں! تو ہے یوں خموش کیوں!

خار

بولا خار کیا کہوں چپ نہ ہوں تو کیا کروں
ہے سکوت اصلِ زیست ہے سکوت وصلِ زیست
سخت ہوں کرخت ہوں شہر یار بخت ہوں
سب ہے خزاں نہ ہے بہار یہ چمن ہے پائیدار
عیش اک خیال ہے درد و غم وبال ہے
خار لازوال ہے
ہے جہاں، جہاں جہاں زندگی ہے جاوداں
زندگی ہے لافنا اور اس کے ہے سوا

مقصدِ حیات کیا!

شاعر

زندگی ہے قہقہا
زندگی ہے مرثیہ
زندگی ہے لافنا

ہر سہ نقطۂ نظر مختلف ہیں کس قدر
ان میں کیوں تضاد ہے اس سے کیا مراد ہے!
میں نے چیخ کر کہا اے خدا! بتا بتا!!

مقصدِ حیات کیا!

شورِ بازگشت اٹھا آئی غیب سے ندا

مقصدِ حیات کیا!

روشن دین تنویر

نفرت

یہ سلطان اور بتول کی کہانی ہے۔ وہ دونوں تایا چچا کی اولاد تھے۔ لیکن ان دونوں کی کبھی نہ بنتی تھی۔ بچپن میں وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے اور جب وہ بڑے ہوئے تو کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب ان کی ایک آدھ چپقلش نہ ہو جاتی۔ سلطان کو تو یقین تھا کہ اُسے بتول سے قطعی نفرت ہے۔ ادھر بتول نے ایسا موقع جب وہ سلطان بھائی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر سکے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا اور اس کی رائے میں سلطان بھائی جیسا مغرور، تنگ مزاج اور عورتوں کا دشمن دنیا میں کوئی اور شخص نہ ہو گا۔ اُسے یاد تھا کہ بچپن میں جب کبھی سلطان بھائی سے منت کی کہ آؤ ہمارے ساتھ کھیلو، تو اول تو سرے سے انکار کر دیا کرتے کہ میں لڑکیوں سے نہیں کھیلا کرتا اور اگر باقیوں کی منت خوشامد سے مجبور ہو کر آ بھی شامل ہوتے تو پھر کھیل میں کسی اور کی بات نہ سنتے اور وہی کھیل کھیلتے جو انہیں خود پسند ہوتا۔ اگر باقی سب کہتے "آؤ پھول میں ہم آتے ہیں" کھیلیں تو فوراً کہہ دیتے "نہیں ہم سکول سکول کھیلیں گے، اور میں انسپکٹر بن کے تمہارا معائنہ کرنے آؤں گا۔" اور اگر کسی اور نے کہہ دیا کہ بھائی سلطان آؤ سکول سکول کھیلیں تو فوراً انکار کر دیتے کہ نہیں ہم تو ریل گاڑی کھیلیں گے میں گارڈ بنوں گا اور اگر کسی کے منہ سے نکل جاتا کہ چلو آج ریل گاڑی کھیلیں تو کہہ دیتے نہیں میں ڈاکٹر بنتا ہوں۔ تم میں سے کوئی مریض بنے۔ اور جب سب ہی شور مچاتے کہ میں بنوں گا یا میں بنوں گی تو سوائے بتول کے اور کوئی بن جاتے مگر وہ کہنے کو ہوتی تو فوراً کسی اور سے کہہ دیتے کہ تم بنو۔

اب بتول سوچتی تو بہت جھنجلاتی کہ سب ہی ان کی بات کیوں مان لیا کرتے تھے۔ آخر بھائی ارشد بھی تو تھے اور آپا انوری بھی تو اُن سے بڑی تھیں۔ مگر ان کی طبیعت ہی کچھ ایسی نرالی تھی کہ سب کہتے، چلو جانے دو، انہی کی بات مان لیتے ہیں اور کوئی ان سے نہ جھگڑتا اور اگر ایک آدھ دفعہ بھائی ارشد یا آپا انوری نے انہیں چھیڑا کا بھی تو کچھ فایدہ نہ ہوا کیونکہ اگر کوئی ان کی بات نہ مانتا تو یہ الگ ہو جاتے اور پھر کوئی لاکھ سر پٹکتا رہ جائے نہ مانتے۔ بتول کو اب تک یہ سب یاد تھا اور اس بات سے اُسے اور بھی الجھن ہوتی کہ اگر سلطان بھائی اُن کے کھیلوں میں شامل نہ ہوتے تو کھیل ہی پھیکا معلوم دیتا اور ایسے محسوس ہوتا جیسے اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔ یہ نہیں کہ ہمیشہ ہی وہ ایسے تیز مزاج رہا کرتے تھے۔ اگر یہ بات بھی ہوتی تو وہ ایسے نہ چڑا کرتی۔ کیونکہ جب اُن کا خود جی چاہتا تو مسکراتے ہوئے بائیں طرف ہونٹوں کو جھکاتے ہوئے چلے آتے اور بغیر پوچھے کھیل میں شامل ہو جاتے۔ یہ بھی نہ پوچھتے کہ کیا کھیل رہے ہو۔ آتے اور دو ایک منٹ دیکھ کر شامل ہو جاتے۔ اور اس وقت ان کے چہرے سے بشاشت یوں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی کہ کوئی انہیں منع نہ کرتا۔ اور اس سے بتول بہت کڑھا کرتی کہ یہ کیا بے ہودگی ہے اور کوئی کہے تو "میرا جی نہیں چاہتا" اور آپ جب چاہیں تو لاٹ صاحب کی طرح آ شامل ہوں۔ مگر وہ اکیلی کیا کر سکتی تھی، بُڑبڑاتی تو بہت مگر اور لوگ سلطان بھائی کے شامل ہونے سے ایسے خوش ہوتے کہ کوئی نہ کہتا کہ جاؤ میاں، ہم نہیں تمہیں ملاتے۔ تم اپنے ہی آپ میں رہو۔

چنانچہ بتول کو بھائی سلطان کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ ان کی خاموش طبیعت سے اسے ہمیشہ گھبراہٹ ہوتی۔ اُسے یاد تھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ ہر چیز کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور پھر کبھی کبھی اپنے ہونٹوں کو بائیں طرف جھکا کر اس طرح مسکراتے کہ بتول بہت چڑتی۔ کہتے کچھ نہ۔ مگر اس طرح مسکراتے کہ دوسرا شخص شرمندہ ہو جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے اُسے کوئی جرم کرتے پکڑا ہے . . . . .

ان کی یہ عادت اسے مطلقاً نہ بھاتی اور پھر ایک اور بات جو یاد آتی تو اب اس کے خیال سے اسے شرم ہی آتی۔ ایک دفعہ رات کو گھر والے کسی کے ہاں ملنے گئے ہوئے تھے۔ سب نے کہا آؤ آنکھ مچولی کھیلیں۔ سب کسی نہ کسی جگہ چھپ گئے۔ وہ بھی ایک طرف بھاگی۔ اسے شک تو تھا کہ سلطان بھائی کہیں اسی طرف گئے تھے مگر اُس نے پروا نہ کی۔ اسے ابھی چھپے ہوئے آدھا منٹ بھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی

یٖ کھینچا۔ اس نے کہا "سلطان بھائی"۔ بس آواز پہچانتے ہی انہوں نے
ہ نکال لیا۔ جیسے اس کے ساتھ چھونا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

اور اب کتنے ہی سالوں کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنی والدہ
رچھوٹے بہن بھائیوں سمیت بیٹے وطن واپس جا رہی تھی اور سارا راستہ
ہ بچپن کی نہ مٹنے والی یادیں اس کے دماغ میں یکے بعد دیگرے ایک
مسلسل تصویر کی صورت میں آتی رہیں۔ آپا انوری کے بیاہ میں وہ تا یا
ان کے ہاں آئی تھی اور دس بارہ دن تک رہی تھی مگر ان دنوں گھر میں مہمان
ا اتنے تھے کہ وہ بچپن کے ہمجولیوں سے پوری توجہ کے ساتھ نہ مل سکی تھی
پھر چھوٹے سکندر اور الماس کے علاوہ سب ہی ادھر اُدھر کام میں مشغول
تے۔ سلطان بھائی سے تو کسی کو کیا توقع تھی کہ وہ اندر آ کے ایک منٹ بھی
بیٹے اور پھر ماشاء اللہ اب جوان ہوگئے تھے۔ چوڑی چھاتی اور اونچا اٹھا اور
ہی مسکراہٹ خفیف سی، دل کو جکڑ لینے والی پراسرار مسکراہٹ! البتہ
پ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں بھی کونوں کی طرف ذرا سکڑ جاتیں اور
ان میں ایک چمک پیدا ہو جاتی جس سے دیکھنے والا اور بھی شرما جاتا۔ پہلے
ن ہی اندر آکر کچھ دیر بیٹھے، ستمبر کے دن تھے۔ بادامی پاپلین کی کھلے گلے
بر آدھی باہوں والی قمیص پہنے ہوئے تھے اور کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور
ں بکھرے ہوئے! تو گویا بڑے ہو کر بھی بال ٹھیک طرح بنانے کی عادت
ہیں ہوئی تھی۔ آئے تو اماں کو سلام کیا اور پھر پوچھا "چچی جان یہ کون خانم
ں!" جیسے اسے پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ جب اماں نے کہا "بیٹا یہ بتول
ہے"، اور اماں بھی بہت ہی سیدھی ہیں۔ جیسے ان کے سوال کا جواب دینا
وری تھا۔ سن کے مسکرانے لگے اور کہا "بتول؟ اچھا! میں سمجھا کوئی
لنکا کی شہزادی ہیں"۔ بس اس کے بعد دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہی رہے۔
سے کسی مذاق کا لطف اٹھا رہے ہوں۔

بتول کو یاد آیا کہ بچپن میں ماما ہمیں لنکا بادشاہ زادی کی کہانی سنایا
تی تھی اور یہ کہا کرتے تھے۔ "میں بھی لنکا بادشاہ زادی کو ہی بیاہ کے لاؤں
۔ جیسے ہی یاد آیا شرم سے منہ سرخ ہوگیا۔ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکی۔
یال نہ آیا کہ شاید انہیں بچپن کی بات یاد بھی نہ رہی ہو۔ یا شاید "اتفاقاً"
ان کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا ہو۔ مگر غالباً چہرے کی طرف ابھی دیکھ ہی
ہے تھے۔ کہنے لگے "انار کے پھول خوبصورت ہوتے ہیں۔ مجھے تو بہت
سند ہیں۔ چچی جان آپ کو نہیں پسند؟" اماں بے چاری ان کی باتوں کو
یا سمجھیں۔ انہیں کیا پتہ کہ آپ نے بچپن میں ہر ایک کے لئے ایک ایک
پھول مخصوص کر دیا تھا اور کہا تھا کہ بس ابھی فیصلہ کر لو۔ بعد میں نہ کہنا کہ مجھے
اپنا پھول پسند نہیں۔ اور اس کے لئے انار کا پھول آپ نے خود تجویز کیا
تھا بلکہ جب کبھی مہربان ہوتے تو انار کلی کہہ کے بلایا کرتے۔ بس اس دن
کے بعد پھر نہ کبھی اندر ہی ٹھیک طرح آئے اور نہ کبھی زیادہ توجہ ہی دی۔
ایسے شخص سے کسی کو کیا اُنس ہو سکتا ہے۔ اور اب بتول نے خیال کیا
"وہ گھر پہ ہی ہوں گے۔ اب اُن کے پاس بیٹھنا ہی ہوگا۔ پاس تو نہیں۔
کیونکہ انہیں تو کسی کے پاس بیٹھنا ہی گوارا نہ تھا۔ وہ تو تماشائی تھے۔
ادھر آئے اور ادھر گئے لوگوں کی طرف دیکھا، کوئی مذاق کیا، کسی کا خاکہ
اڑایا، کسی کو شرمندہ کیا، کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہی رہے۔ ان کی
طرف کوئی دیکھے ہی کیا اور ان سے کوئی بات کیا کرے! کسی وقت اتنی
بے پروائی کہ الامان! آپا انوری کی شادی میں دس دنوں میں کیا فرصت
کی ایک گھڑی ایسی نہیں مل سکتی تھی۔ کہ آتے اور کوئی بات ہی کرتے، کچھ
پوچھتے ہی۔ آخر لوگ آپس میں ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر آتے تو ایسی
سردمہری سے۔ دیکھتے تو اس بے اعتنائی سے جیسے جان پہچان ہی نہیں۔
جیسے دنیا میں کسی اور کا وجود ہی نہیں۔ ایسے پتھر سے کیا توقع ہو سکتی تھی"۔
بتول نے یہ سوچتے سوچتے فیصلہ کیا کہ اسے اپنے گھر واپس آنے کی ذرا
بھی خوشی نہیں اور یہ امید کہ وہ اسٹیشن پہ لینے آئے ہوں گے بالکل ہی
عبث تھی!

ادھر سلطان کی امی نے گھر میں کہا کہ لطیف کو کون لینے جائے
گا۔ لطیف سلطان کی چچی کا نام تھا۔ اعظم نے کہا امی میں جاؤں گا، مگر
اعظم ابھی بارہ برس کا تھا۔ امی نے کہا "تم لینے گئے تو تمہاری چچی جان ناراض
ہوں گی۔ کسی بڑے کو جانا چاہیئے"۔ مگر سلطان کے کان پہ جوں تک نہ رینگی
آرام کرسی پہ لیٹا سگرٹ پیتا رہا۔ جیسے سنا ہی نہیں، جیسے کسی گہرے خیال
میں غرق ہے۔ امی نے دو منٹ کے بعد پھر کہا "آج شام کو آ جائیں گے
مدت ہو گئی تمہارے چچا جان کی تبدیلیاں ہی ایسی جگہ ہوتی رہیں کہ ملاقات
بھی مشکل ہو گئی۔ خیر تمہارے ابا بھی خوش ہوں گے۔ معلوم نہیں تمہارے
چچا جان کتنے مہینے کی چھٹی لے کے آ رہے ہیں۔ کم سے کم دو ایک مہینے تو
رہیں۔ ان کا مکان تو میں نے صاف کروا دیا ہے"۔ نکہت نے کہا "چلو اب
یہ کھڑکی تو نہ بند ہوگی، مجھے تو اس کا بند ہونا کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ معلوم ہوتا
تھا جیسے چچی جان کا مکان کہیں بہت دور چلا گیا ہے"۔
امی غلاف کاڑھ رہی تھیں اور باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ مگر سلطان

کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ امی نے پھر کہا "تمہارے ابا دفتر سے آنے والے ہیں۔ گاڑی تو شام ہی کو آئے گی تو پھر انہیں سے کہنا ہو گا۔" مگر سب کو معلوم تھا کہ ابا سے کہنا کتنا مشکل ہے۔ جب اس پر بھی سلطان نے کوئی جواب نہ دیا تو امی نے پوچھا "سلطان جی تمہیں تو فرصت ہو گی!"

گھر میں امی کا سلطان جی کہنا کسی کو بھی پسند نہ تھا۔ سلطان کو نہ نکہت کو اور نہ اعظم کو۔ نکہت تو صاف طور پر کہہ دیتی تھی کہ امی آپ سلطان بھائی کو بہت سر چڑھاتی ہیں اور اعظم کو اس لئے کہ اسے سب ارے اعظم، او رُاو اعظم کہتے تھے۔ اگرچہ اس نے دو ایک دفعہ دبی زبان سے یہ تجویز بھی کیا تھا کہ کم از کم لوگ اسے اعظم میاں ہی کہہ دیا کریں مگر کسی نے اس کی تجویز پر غور نہیں کیا تھا اور نکہت تو شرارتاً سلطان بھائی سے جو فقط اس سے ایک سال بڑے تھے یوں مذاق کیا کرتی "سلطان جی آپ کی طبیعت تو اچھی ہے کہیں آج آپ ہنس تو نہیں پڑے"۔ یا "سلطان جی خدانخواستہ آج آپ کا ہم سے بات کرنے کو جی تو نہیں چاہتا" یا پھر اگر سلطان کہیں چپ چاپ بیٹھا ہوتا تو نکہت ذرا اونچی آواز سے چھوٹے بچوں کو للکارتی "ارے شیطانو! اتنا شور نہ کرو سلطان جی کچھ سوچ رہے ہیں" ان باتوں کا اکثر اوقات سلطان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

اگر وہ سن کر مسکرا نہ دیتا تو نکہت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر ایک دو منٹ تک دیکھتا رہتا۔ مگر ایسی نظروں کا نکہت ایسی شوخ مزاج پر فقط یہ اثر ہوتا کہ وہ کہتی "امی نصیب دشمناں آج سلطان جی کے سر میں درد ہے، دیکھو نا آنکھیں تک نہیں جھپک سکتے۔" ادھر امی نکہت کی شرارتوں سے کبھی پریشان نہ ہوتیں۔ وہ اس کی باتوں پر تو ہنس دیتیں اور سلطان کو ایک محبت بھری نظر سے دیکھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ امی کی سرشت میں سکون اور اطمینان کا اتنا حصہ تھا کہ وہ چھوٹی موٹی باتوں سے نہ کبھی مضطرب ہوتیں اور نہ گھر والوں کی چھیڑ چھاڑ سے انہیں کوئی ملال ہوتا۔ سلطان ان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ ان کے خیال میں سلطان جیسا پیارا، تابعدار اور نیک خصلت بیٹا کسی اور ماں کو نصیب نہ ہوا ہو گا۔ اسی لئے اس کے باوجود کہ گھر میں سبھی ان کے لہجہ کی کم و بیش نقلیں اتارتے مگر وہ سلطان سے نہ کبھی کسی بات پر ناراض ہوتیں اور نہ اسے تلخی سے کچھ کہتیں۔ سلطان پر بھی کئی دفعہ امی کی چھوٹی سی فرمائش کا بہ نسبت ابا کے حکموں کے زیادہ اثر ہوتا۔

پھر امی کو یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان کے انکار میں ابہام کا پہلو کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوتا ہے اور در اصل اس میں یہ ٹیڑھا پن موجود تھا۔ کسی کو نہ معلوم ہو سکتا کہ سلطان کو فلاں چیز پسند آئی ہے یا نہیں۔ کیونکہ کئی دفعہ وہ کسی بری چیز کی اتنی تعریف کر دیتا کہ سننے والے حیران ہوتے اور وہ فیصلہ نہ کر سکتے کہ سلطان مذاق کر رہا ہے یا دل سے کہہ رہا ہے او پھر اسے کوئی چیز پسند آ جاتی تو فقط ایک فقرے کے سوا کچھ نہ کہتا اور اس ایک آدھ جملے میں بھی تعریف کم ہی ہوتی۔ گھر میں کوئی بھی قطعی طور پر سلطان کی رائے کے متعلق پیشین گوئی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اکثر اس کی رائے توقع کے خلاف ہی ہوتی۔ جیسے اسے لوگوں کو حیران کرنے میں لطف آتا ہ فقط نکہت کی تیز نظریں ہی کبھی کبھی سلطان کے مطلب کو بھانپ لیتیں۔ امی کبھی غور ہی نہ کرتیں اور اسی لئے انہیں سلطان کی طبیعت کبھی پیچیدہ یا ٹیڑ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

گھر میں البتہ سب کو یقین تھا کہ سلطان کو لڑکیاں پسند نہیں۔ اور و انہیں نامعقول، کج بحث اور خود پرست خیال کرتا ہے۔ سلطان کی بڑ بہن انوری کی شادی ہو چکی تھی اور انہیں دو تین سال سے سلطان ک ذہنی نشوونما کا علم ہی نہیں تھا۔ بڑا بھائی کوئی تھا نہیں۔ اعظم اور سکند اس سے کئی سال چھوٹے تھے۔ فقط نکہت ہی اس کی عمر کی تھی۔ مگر نکہت کو اپنی سہیلیوں سے ہی کم فرصت ملتی تھی۔ پھر بھی گھر میں اگر کسی شخص پر سلط کا رعب نہ تھا تو وہ نکہت تھی۔ یوں نکہت تھی ہی ایسی شعلۂ جوالہ کہ اسے د کی کوئی ہستی مرعوب نہ کر سکتی تھی۔ تعلیم تو اس نے فقط دسویں تک ہی ح کی تھی مگر شاید ذکی اور تیز فہم ہونے کے باعث ہر مسئلہ پر رائے زنی کرنا اس کی عادت میں شامل تھا۔ اور سلطان کی خاموشی اور اس کی گہری سوچیں کم اسے دیر تک چپ نہ رہنے دیتیں۔

اور اب چونکہ امی سلطان بھائی سے اسٹیشن پر جانے کے لئے ک رہی تھیں۔ نکہت نے کہا "امی اعظم اب بڑا ہو گیا ہے آپ اسے ہی کیو نہیں بھیج دیتیں۔ یہ کہہ دے گا سلطان بھائی کسی کام کو گئے ہوئے تھے۔ اس لئے نہیں آئے، ورنہ وہ تو آنے کو بہت کہتے تھے۔ روز یاد کیا کرتے تھے کہ جمعرات کو آئیں گے۔ یہ بھی کہتے آج تین د رہ گئے ہیں اور آج دو" نکہت کے لہجے میں طنز تھی اسے نظر انداز کرتے ہو سلطان نے کہا "تو اعظم ہی چلا جائے۔ مجھے واقعی کام ہے، البتہ یہ ا سازیاں نکہت آرا بیگم عرف سوسن زبان دراز تک ہی رہنے دے" یہ کہہ کر آ باہر چلے گئے۔ مگر نکہت کو یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اسٹیشن پر جائیں گے۔

ادھر جوں جوں اسٹیشن نزدیک آتا گیا، بتول کو یقین ہوتا گیا کہ

اور کوئی لینے آجائے تو آجائے سلطان بھائی تو ٹس سے مس نہ ہوں گے اور اُسے محسوس ہوا کہ بہت سے شخص اگر لینے آجائیں تو بہت الجھن ہوتی ہے۔ آدمی سامان اتروائے یا لینے والوں کی طرف دیکھے۔ پھر ابا جان بھی ساتھ تھے۔ چھوٹے میاں بھی ساتھ تھے۔ پندرہ سال کی عمر کافی عمر ہوتی ہے۔ چھوٹے میاں بچوں میں تو شمار نہیں ہوسکتے تھے۔ گھر کا راستہ وہ سب جانتے تھے۔ گھر اپنا تھا۔ پھر کسی کے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ جب اماں نے کہا بتاؤ تائی اماں نے کسی نہ کسی کو ضرور اسٹیشن پر بھیجا ہوگا۔ شاید سلطان ہی کو بھیجا ہو تو بتول نے بہت تعجب سے کہا "کون؟ سلطان بھائی! وہ تو کبھی نہ آئیں اور پھر ہمیں ان کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم خود بھی تو گھر پہنچ سکتے ہیں"۔ اماں کا سارا دھیان سامان اکٹھا کرنے میں تھا ورنہ شاید وہ بتول سے پوچھ ہی لیتیں کہ کیا تمہیں یہاں آنے کی بالکل ہی خوشی نہیں؟

جب اسٹیشن آگیا تو بتول نے پلیٹ فارم پر پہلا شخص جو دیکھا وہ اعظم تھا۔ مگر اس کی نظر بالکل اعظم پر ہی نہ ٹکی رہی۔ پلیٹ فارم پر بہت سے آدمی موجود تھے۔ سواریاں اترنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ادھر اماں جلدی جلدی کا ورد کر رہی تھیں۔ چنانچہ اترنا پڑا اور پھر ابا جان بھی آگئے مگر ابھی سامان قلیوں نے ٹھیک طرح اٹھایا نہ تھا کہ کوئی صاحب پتلون کی بائیں جیب میں ہاتھ ڈالے ہیٹ ماتھے سے ہٹائے خراماں خراماں ادھر آ نکلے۔ جیسے گھر سے سیر کرنے آئے ہیں۔ بتول کو تو خاص توجہ دینے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اس نے کچھ کہا اور اچھا ہوا کہ اُس نے برقعہ پہنا ہوا تھا۔ ورنہ سلطان بھائی اس کے چہرے کی کیفیت دیکھ کر معلوم نہیں کیا کچھ نہ کہتے۔ کیونکہ یہ تو بتول کو ماننا پڑتا تھا کہ اس کے چہرے کی رنگت اس کے اپنے قابو میں نہ تھی۔ معمولی سے معمولی بات پر سرخی کی لہر اس کی گردن سے لے کر اس کے بالوں تک پھیل جاتی۔ خیر کم از کم اُس نے انہیں دیکھ کر محسوس تو کیا کہ آخر اتنی دیر میں آئے بھی تو کیا آئے۔ اس سے تو نہ ہی آئے ہوتے اور پھر چچا ابا جی سے سلام علیک کر کے وہ متوجہ بھی ننھے اصغر کی طرف ہی ہوئے تھے!

بتول نے تانگے میں بیٹھے ہوئے سوچا کہ معلوم نہیں لوگ گھر جانے کے لئے کیوں بے تاب ہوتے ہیں! چھوٹے میاں کو دیکھو۔ بھائی ارشد تو خیر آئے ہی نہیں، وہ تو اپنی ملازمت پر ہیں۔ باقیوں کو دیکھو، باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ جیسے بہشت مل گیا ہو۔ ہنسے ہی جاتے ہیں، بھائی جان، بھائی جان کے سوا اور کوئی آواز ہی نہیں سننے دیتے اور اُن کے بھائی جان بھی تو شاید غلطی سے اس تانگہ میں آبیٹھے ہیں۔ ورنہ ابا تو انہیں اپنے تانگے میں ہی بیٹھنے کو کہتے تھے اور بیٹھے بھی تو اگلی سیٹ پر حالانکہ پچھلی سیٹ پر وہ خود ایک طرف ہو کر بیٹھی تھی۔ بس معلوم نہیں کیا کرتے رہے کہ چھوٹے میاں پھدک کر آگے اور پاس رفعت کو بٹھا لیا۔ پھر تو آگے ہی بیٹھنا تھا۔ خیر مجھے کیا! اور بیٹھے تو میری طرف ہی مگر اتنا آگے جھک کر کہ کہیں مجھ سے چھو نہ جائیں جیسے مجھے خواہش ہے اُن سے چھونے کی!

گھر پہنچ کر بتول کو آپا نکہت سے گلے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس کی طبیعت اسے ہمیشہ سے پسند تھی۔ اس نے پہلا ہی سوال یہ کیا۔ "سلطان بھائی اسٹیشن پر گئے تھے؟" بتول نے کہا "جی" اس پر انہوں نے کمر میں ہاتھ ڈال کر زور سے اسے بھینچا اور ساتھ ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ بتول کچھ نہ سمجھی۔ مگر ابھی تائی اماں نے اماں سے گلے مل کر بتول کو سینے سے لگایا ہی تھا کہ سلطان بھائی بھی آگئے۔ اس پر نکہت نے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "سلطان جی آپ تھک تو نہیں گئے۔ میں نے سنا ہے آپ کو اسٹیشن کے نزدیک کہیں کام تھا۔ اتنی دور کام! آپ کیوں اتنی تکلیف کیا کرتے ہیں۔ صدقے کیا ایسے کاموں کو۔ میرے چاند سے بھائی کا منہ کملا گیا ہے"۔ اور ہمدردی ظاہر کرنے کی غرض سے اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں اور لبوں کو اس طرح سکڑایا کہ تائی اماں بھی ہنس پڑیں اور سلطان بھائی بھی ہنسنے پر مجبور ہوگئے اور پھر جو آپا نکہت کے پیچھے بھاگے ہیں وہ آگے آگے اور آپ پیچھے پیچھے حمام کے ارد گرد، چارپائیوں کے سرہانے پائنتی، تخت پوش پر سے کود، کرسیوں اور مونڈھوں کو گرا، سامان کو تتر بتر کر ہنستے ہنساتے ایسا اودھم مچایا کہ سب دیکھنے والے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور تائی اماں نے کہا "یہ تمہارے آنے کی خوشی ہے۔ ورنہ سلطان تو کچھ دن سے بہت چُپ چُپ سا ہے"!

دو تین دن ہی میں بتول پر ثابت ہوگیا کہ اس کا خیال بالکل درست تھا۔ اور واقعی گھر سے پردیس ہی بہتر تھا۔ کیونکہ وہاں لوگ دانستہ طور پر تو کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ جگھہ کا تو سوال ہی نہ تھا۔ مگر اس نفرت کی وجہ! جہاں کہیں وہ بیٹھی ہوتی اگر سلطان بھائی آجاتے تو اول تو کوئی معذرت کر کے چلے ہی جاتے اور اگر اماں کے اصرار یا آپا نکہت کے کہنے پر بیٹھ بھی جاتے تو جان بوجھ کر اسی سے بے خبر ہو کر باتیں کرتے رہتے۔ اس تجاہل کا تو ایک ہی مطلب تھا کہ انہیں اس سے نفرت ہے اور اگر نفرت ہے تو ہو۔ آخر بتول کو ہی وہ کب پسند تھے۔ بات کرنی ہوتی تو اس قدر تکلف سے بلاتے

اُدھر آپ تشریف رکھتی ہیں"۔ اچھا تو یہ آپ نے کاڑھا ہے! واللہ ہاتھ میں کتنی صفائی ہے۔ آپ کی تو یہ چیزیں کسی نمائش میں رکھنی چاہئیں۔ چچی جان آپ کی دختر فرخندہ اختر کے ہاتھوں میں تو جادو ہے! کاڑھنے میں کمال کر دیتی ہیں"! اس میں سوائے طنز کے اور کیا تھا! مان لیا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں کو نہائت نرمی سے دباتے اور ہاتھوں کی ساخت کو اچھی طرح دیکھتے، مگر اس سے کہاں ثابت ہوتا تھا کہ انہیں ہاتھ پسند ہی ہیں!

ایک دن آپا نکہت نے کہا آج شام سیر کو چلیں گے۔ سب نے کہا اچھا" مگر سلطان بھائی نہ بولے۔ بتول نے آپا نکہت سے پوچھا "سلطان بھائی تو نہیں جائیں گے؟" نکہت نے مسکراتے ہوئے کہا کوئی اچھی سی ساڑھی پہن کر آؤ، تیار انہیں میں کروں گی"۔ بتول نے کہا" جیسے وہ میرے کپڑوں کی طرف دیکھیں گے ہی" نکہت نے پوچھا "تمہارے پاس آسمانی رنگ کی کوئی ساڑھی ہے؟" بتول نے کہا "جی! جورجیٹ کریپ کی ہے تو اور بارڈر بھی اس پر بہت خوبصورت لگتا ہے۔ بس آپا نکہت نے اصرار کیا کہ پھر وہی پہنو۔ بتول نے بھی دل میں کہا "آخر کسی کو نہ بھی پسند آئے تو کیا ہے؟ مجھے تو اچھی لگتی ہے"۔ اماں سے کہا اور نانی اماں سے بھی کہ آپ بھی چلیں۔ مگر انہوں نے کہا "آج نہیں ہوا تو ہم پھر کسی دن چلیں گے" اور اماں تو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی ہی رہتی تھیں خیر شام ہوئی تو بتول نہا کر کپڑے بدلنے میں مشغول ہو گئی اور ساڑھی پہن کر تیار ہوئی تو آپا نکہت کو آواز دی۔ نکہت اُسے دیکھ کر اتنا خوش ہوئی کہ بے ساختہ دوڑ کر گلے سے لگا لیا اور کہنے لگی" اب دیکھیں گے نا سلطان بھائی کیسے سیر کو نہیں جاتے؟"

جب بتول کی کمر میں ہاتھ ڈالے نکہت اٹھلاتی ہوئی سلطان بھائی کے پاس پہنچی تو سلطان اس وقت حسب معمول سگرٹ پینے میں مشغول تھا۔ البتہ ماتھے پر معمول سے زیادہ تیوریاں پڑی ہوئی تھیں۔ جب ان دونوں کو آتے دیکھا تو لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، وہی طنزیہ مسکراہٹ، وہی پرانا انداز! بتول اکیلی تو شاید سامنے سے ہٹ جاتی مگر آپا نکہت ساتھ تھیں وہ پکڑے ہوئے پاس لے گئیں اور کہا "سلطان بھائی چلو اٹھو اب سیر کو چلیں۔ شام ہو گئی ہے آپ کی شرط تو ہے نا مغرب کے بعد۔ کی آپ کے اٹھتے اٹھتے سورج غروب ہو جائے گا"۔ مگر سلطان نے کچھ جواب نہ دیا فقط بتول کو نیم وا آنکھوں سے دیکھا کیا۔ نکہت نے آخر کہہ ہی دیا" لو اب کافی دیکھ لیا ہے۔ اٹھو"۔ مگر شاید سلطان کو یہ چوٹ پسند نہ آئی، کہا" مجھے تو کام ہے تم اعظم کو اور چھوٹے میاں کو لے جاؤ" اور پھر اس ٹھاٹھ کی میں کہاں تاب لا سکتا ہوں"! یہ کہا اور اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بتول نے آپا نکہت کی پروا بھی نہ کی، وہ کہتی ہی رہیں کہ ٹھہرو، میں جانتی ہوں ان کی طبیعت کو، یہ ان کے نخرے ہیں۔ اوپر تیار ہونے کو گئے ہوں گے۔ مگر بتول نے کچھ نہ سُنا، وہ کھڑکی میں سے گذر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت جتنی اُسے اپنے آپ سے لغزت تھی کسی اور سے کبھی نہ ہُوئی ہوگی۔ اُسے غصہ اس بات پر تھا کہ آخر میں نے اتنا وقت بناؤ سنگار میں جو صرف کیا تو کیوں؟ اس لئے کہ سلطان بھائی مذاق کریں؟ اسے اب اس ساڑھی سے ہی نفرت ہو گئی۔ جی میں آیا کہ پھاڑ کے پھینک دے!

اُدھر نکہت اوپر سلطان کو بلانے گئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگی۔ سلطان بھائی" یہ آپ کی کہاں کی شجاعت ہے کہ کسی کو رلایا اور کسی کو ستایا!" اس نے کہا "کیوں؟" اور وہ واقعی حیران تھا، کیونکہ وہ تو کپڑے تبدیل کرنے میں مصروف تھا۔ آپ کی مذاق کی حس" نکہت نے طنزاً کہا "بہت ہی تیز ہے" مگر آپ مذاق کرتے وقت آنکھیں تو بند نہ کر لیا کیجئے، بتول بے چاری۔ مجھے یقین ہے۔ اس وقت رو رہی ہوگی، سلطان نے جلدی سے پوچھا "کیوں! کیوں کیا؟" نکہت نے جواب دیا "اسے تو میں ایسی سجا بنا کے لائی اور آپ نے یوں اس کے دل کو دکھایا۔ میں اسے روکتی ہی رہی، میں تو آپ کے لچھنوں سے واقف ہوں، وہ کیا جانے آپ کو، مجھ سے ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ اب شرافت اسی میں ہے کہ منا کے لاؤ"!

پہلے تو سلطان کچھ ہچکچایا، مگر نکہت کے مجبور کرنے پر وہ بتول کے کمرے میں جا ہی پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ واقعی بتول بستر پر اوندھی پڑی رو رہی ہے۔ ساڑھی بھی معمولی سی پہنے ہوئے ہے۔ پاؤں کی چاپ جو سنی تو بتول نے سر اٹھایا۔ سلطان کو دیکھا تو پہلے جلدی سے آنسو پونچھے اور پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آیئے مجھے کچھ سر درد ہے" مگر وہ بہت ہی حیران ہوئی جب سلطان نے کہا" مجھ سے ناراض ہو گئی ہو کیا؟" بتول نے کہا "آپ سے؟" اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اس کے بعد بتول کو یاد نہیں کہ کیا ہوا اور کیسے مگر جب اُسے یقین آیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کا سر سلطان کے مضبوط شانہ سے لگا ہُوا تھا اور سلطان کے بازو اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔

اُسے یوں معلوم ہوا جیسے اُس نے بہت دیر کے بعد پوچھا" نانی اماں کیا کہیں گی؟" سلطان نے جواب دیا" ان کی تو مدت سے یہی آرزو ہے"!

سیّد فیاض محمود ایم اے

ساقی نامہ

پلا ساقیا بادۂ ارغواں
زمیں بن گئی رشکِ باغِ جناں

فلک پر ہے سرگرمِ مشقِ خرام
پسِ پردۂ ابر ماہِ تمام

مگر خواہشِ دیدِ حسنِ زمیں
اسے رکھ نہیں سکتی حجلہ نشیں

ردائے سیہ پھاڑ کر بار بار
وہ کرتا ہے نظارۂ روزگار

نگاہوں میں اس کی ہے مینائے نور
زمیں پر بہاتا ہے دریائے نور

فسوں کار ہے کس قدر چاندنی
ستاروں کی ہے ہمسفر چاندنی

خموشی میں گم ہے ادھر شہدرہ
ہوا ہے ادھر سیم بر مقبرہ

وہ مغلوں کی عظمت کا ادنیٰ نشاں
وہ سائے میں جس کے ہے نورجہاں

جہانگیر کی آخری خواب گاہ
جہاں عشق نے آکے چاہی پناہ

چمکتا ہے یوں گنبدِ مرمریں
کہ تھا طور کا جیسے منظر یہیں

در و بام و دیوار ضَو ریز ہیں
غمِ دہر میں عشرت آمیز ہیں

وہ ہے دلکشی سطحِ آب میں
مہ و ابر اُترے ہیں تالاب میں

ضیا پاشیوں کا جہاں ساتھ ہے
عروسِ فلک کہکشاں ساتھ ہے

نہیں رعبِ جلوہ سے تاب بیاں
کھڑا سر کے بل مقبرہ ہے یہاں

کھجوروں کے سائے میں سبزے کا رنگ
درخشاں کناروں سے کرتا ہے جنگ

شبِ تار میں ہے وہ تابندگی
چمک اُٹھے جس سے رہِ زندگی

ہوا ہلکی ہلکی سی چلتی ہوئی
گلوں کے تبسم میں ڈھلتی ہوئی

مگر جس سے جھکتا نہیں خود پسند
سرِ آسماں بوس سروِ بلند

چٹکتی ہیں کلیاں اس انداز سے
کہ پیدا ہوں نغمے سرِ آواز سے

یہ موسم ہو اور زندگانی کا ہوش!
یہ محفل ہو اور ہو مغنی خموش

"قرارِ دلِ بے قرار آگئی
بہار آگئی پھر بہار آگئی
دعائیں ہوئیں میکشوں کی قبول
عروسِ جہاں پر خمار آگئی
گلِ نرم پر برگِ نوخیز پر
جوانی سرِ شاخسار آگئی
بھری ہیں فضاؤں میں موسیقیاں
مغنّیِ فطرت بہار آگئی
گہرہائے شبنم بکھرتے نہ یوں
چمن کی مگر گلعذار آگئی
کیا ہے زمانے کو پابندِ عیش
بہانے سے وہ سحر کار آگئی
نظر آرہی ہیں جو رنگینیاں
گلستاں کی پروردگار آگئی"

مغنّی ستم تو نے ڈھایا یہ کیا
قصیدہ سا مجھ کو سنایا یہ کیا

پریشان کردی طبیعت مری
نہ سمجھا مجھے تو بھی قسمت مری!

قسم ہے تجھے نغمہ بارِ ازل — نہ آتی تھی کیا تجھ کو کوئی غزل
غزل وہ محبت کی پروازگاہ — وہ پامالِ غم دل کی رنگین آہ
بھرا جس میں ہو کیفِ ہجر و وصال — تمنا کا خوں بے کسی کا خیال
ہوئی ہو بیاں عشق کی واردات — بگڑتی ہو پھر جس میں بن بن کے بات
جوانی کا وہ قصۂ دردناک — گریباں کے جس پہنتے ہوں چاک
جہاں بانکپن سے بڑھے سادگی — جہاں لطف دیتی ہو افتادگی
جہاں خامشی حسن تقریر ہو — جہاں غم مسرت کی تصویر ہو
نظر جس میں آئیں وفاداریاں — ستم دوستوں کی اداکاریاں
ٹھہر نا مگر میں یہ کہتا ہوں کیا — کسی اور دنیا میں رہتا ہوں کیا
بیاں میرا کتنا ہے بے ربط سا — محبت کا ہے کیوں مجھے خبط سا
پلا ساقیا ہاں پلا ساقیا — مرے درد کی لا دوا ساقیا
حقیقت سے ناآشنا ہوں ابھی — تمناؤں سے کھیلتا ہوں ابھی
ابھی دیکھتا ہوں رخِ آسماں — ابھی زندگی کا مجھے ہے گماں
ابھی دوڑتا ہے رگوں میں لہو — ہے باقی ابھی موت کی آرزو
ابھی آتشِ عشق دم ساز ہے — ابھی نغمۂ سوزِ غم ساز ہے
ابھی کر رہا ہوں وفاؤں پہ ناز — ابھی دردِ جانکاہ ہے دلگداز
ابھی دشت پیما ہے جوشِ جنوں — کہ ہے کیف زا اضطرابِ سکوں
ابھی حشر ساماں ہے یادِ شباب — ابھی ذرۂ دل میں ہے آفتاب
ابھی چاہتا ہوں محبت کو میں — حسینوں کو نغموں کو وحشت کو میں
تکلف کا پردہ اٹھا مطربا — نہ اب ذوقِ بے حد کو اور آزما
معطر فضاؤں پہ چھائے غزل — دل و روح میں اب سمائے غزل

"اٹھانا غمِ جاں ستاں اور ہے
زمانہ ابھی مہرباں اور ہے
جلا دے گی برقِ جہاں سوز کو
مری آہِ آتش فشاں اور ہے
عبث ہے دوائے جگر چارہ گر
تقاضائے حسنِ بتاں اور ہے
نہ ہوتی ہے مشکل کشا موت ہی
محبت میں جی کا زیاں اور ہے
تڑپتا نہ تھا یوں اسیرِ وفا
قفس میں کوئی امتحاں اور ہے
لبِ جو وہ ساقی وہ ہوش کے ساتھ
بہارِ مئے ارغواں اور ہے
سنے ہوں گے قصے بہت عشق کے
نظر کی مگر داستاں اور ہے"

مغنی یہ دیپک تھا کیا تیرا راگ — بدن میں لگا دی مرے جس نے آگ
مرا شعلۂ عشق بھڑکا دیا — مری روح کو اور تڑپا دیا
مجھے یاد آئے جوانی کے دن — جوانی کے دن زندگانی کے دن
وہ دن جب نہ تھا دل جفا آشنا — محبت کی دنیا سے ناآشنا
فریبِ وفا اس نے کھائے نہ تھے — جفاؤں کے صدمے اٹھائے نہ تھے
نہ روتے تھے اس طرح مجھ کو نصیب — نہ آیا غمِ جانستاں تھا قریب
نہ آنکھوں سے بہتا تھا سیلابِ خوں — نہ دیکھا تھا سامانِ جوشِ جنوں

تمنائیں رہتی تھیں ہر دم جواں　　نہ ملتا تھا اس بے حسی کا نشاں
سمجھتا تھا دنیا کو آرام گاہ　　کہ بربادیوں کی نہ دیکھی تھی راہ
اٹھایا نہ تھا رنج دیوانگی　　کہ دیکھا نہ تھا رنگ بیگانگی
نہ مجبوریاں تھیں نہ رسوائیاں　　نہ شبہائے فرقت کی تنہائیاں
بسر بسکہ ہوتی تھی آرام سے　　غرض تھی مے و ساقی و جام سے

سنو بھر کے ساقی پلانا مجھے　　گرا چاہتا ہوں اٹھانا مجھے
ترے سامنے درد و غم آئے کیوں　　مجھے یاد ماضی کی تڑپائے کیوں
نہیں ہے میسر جوانی تو کیا　　نہیں ہے جنوں کی نشانی تو کیا
جوانی کا دلکش ترانہ سہی　　جوانی کا رنگیں فسانہ سہی
جوانی کا ہر چند خوش کن ہے نام　　مگر ہے بھیانک جوانی کی شام
جوانی کا گو مختصر سا ہے دور　　جوانی کے لیکن نرالے ہیں طور
جوانی کے رہتے ہیں تا زیست داغ　　جوانی سے بھرتا ہے غم کا ایاغ
جوانی کی باتیں جوانی کا جوش　　نہیں چھوڑتے زندگانی کا ہوش
جوانی میں انسان انساں نہیں　　جوانی کا ایمان ایماں نہیں
جوانی کی بربادیوں کا ثبوت　　مری زندگی کا مسلسل سکوت
مگر یہ ستم اور کیا ہو گیا　　جواں سال ساقی خفا ہو گیا
غضب ہو گیا دیکھتے دیکھتے　　بنا بت خدا دیکھتے دیکھتے
نگاہوں کی شادابیاں لٹ گئیں　　زمانے کی آبادیاں لٹ گئیں
نہیں خندۂ گل کا کچھ اعتبار　　رہین خزاں ہو گئی ہے بہار
کرشمہ ہے ساقی یہ کس ذات کا　　بنا جو تبنگڑ مری بات کا
نہ کیوں تلخ ہوتی کہانی مری　　نظر میں تھی اپنی جوانی مری
سنایا ہوا ہوں جوانی کا میں　　اسی گردش آسمانی کا میں

جوانی کی گو ہے شکایت مجھے　　جوانی سے لیکن ہے الفت مجھے
میسر جو ہوتی جوانی مجھے　　رلاتی نہ یوں زندگانی مجھے
بگڑتا نہ ساقی مناتے نہ ہم　　عبث ناز بے جا اٹھاتے نہ ہم
عبث ہے مگر ان کی سب برہمی　　نہیں آج کل ساقیوں کی کمی
گیا وہ پرانا زمانہ گیا　　سنا ہے جہاں نے فسانہ نیا
زمانے پہ چھائی ہے تہذیب نو　　عجب رنگ لائی ہے تہذیب نو
نہیں اب کسی پر کسی کا مدار　　اگر ایک روٹھے تو ساقی ہزار
محبت کے خواہاں ہیں سیمیں بدن　　سکھاتے ہیں خود عشق بازی کے فن
حسینوں کو راس آ گئی دلبری　　ہے ناز میں غرق عشوہ گری
بلند ہو گیا گرچہ معیار حسن　　زمانہ ہوا ہے پرستار حسن
گئے دن کہ نغمہ سرائی تھا عیب　　سر انجمن خود نمائی تھا عیب
نہ تھے بے حجاب اس طرح نازنیں　　کہ سینہ نمودار گم آستیں
جہاں میں جو یوں انقلاب آ گیا　　مرا کیوں نہ واپس شباب آ گیا
مغنی پلا تو کہ گاؤں گا میں　　منا کر جوانی کو لاؤں گا میں
"بہت گردش آسمانی سہی　　بہت حسن کی بدگمانی سہی
محبت میں رہتا ہے کس کا نشاں　　مری موت تیری نشانی سہی
مے زندگی میں سم غم بھی ہے　　مے زندگی ارغوانی سہی
ترا درد ہے میری کل کائنات　　مرا عشق تیری کہانی سہی
مرے شوق کا حوصلہ الاماں　　تمناؤں کی بے زبانی سہی

کیا کیا نظر زندگانی میں اور
خراب محبت جوانی سہی"

قیوم نظر

دیپک راگ

حسنِ صحرا اور پھول

جرمن نسل کا ایک اُردو شاعر

اٹھارہویں صدی کے اواخر اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری شباب پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں شاہ نصیرؔ اور حضرت ذوقؔ کی گرم جوشیوں نے اُردو شاعری کا پایہ بہت بلند کر دیا تھا۔ امراء و رؤسا میں بھی شاعری کا مذاق پیدا ہو گیا تھا اور وہ شعراء کی رفاقت کا دم بھرنے لگے تھے ان کی اعانت و سرپرستی نے اُردو شاعری میں نئی جان ڈال دی تھی۔ جا بجا مشاعرے ہوتے تھے اور باقاعدہ ہوتے تھے۔ بعض مشاعرے بہت کامیاب اور بارونق مشہور تھے۔ منجملہ ان کے نواب ظفریاب خاں المتخلص بہ صاحبؔ کے مشاعروں کی بڑی دُھوم تھی اور مشاہیر شعراء ان میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ "مجموعہ نغز" اور "گلشنِ بے خار" نے ان مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔

"مجموعہ نغز" اُردو شعراء کا وہ قابلِ قدر تذکرہ ہے جس کی بنیاد پر آزادؔ نے "آبِ حیات" کی عمارت کھڑی کی ہے۔ میر قدرت اللہ قاسمؔ نے صاحبؔ کے علاوہ ان کے محبِ خاص اسیرؔ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن آزادؔ نے کسی یورپی نسل اُردو شاعر کو آبِ حیات میں جگہ نہیں دی اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ اُس زمانے کے یورپین اُردو شعراء کو بیشتر شاہ نصیرؔ سے تلمذ تھا اور شاہ نصیرؔ اور حضرت ذوقؔ کے بگاڑ کے باعث شاگردانِ ذوقؔ کو شاہ نصیرؔ اور اُن کے شاگردوں سے للہی بغض ہو گیا تھا۔ اگر آزادؔ نے اس بے توجہی اور جنبہ داری سے کام نہ لیا ہوتا تو بہت سے اُردو شعراء کا نام و کلام مٹ نہ جاتا۔ صاحبؔ کے علاوہ ڈاُس سوبرؔ طوماسؔ، اسیرؔ، فراسُوؔ وغیرہ اُس زمانے کے ممتاز یورپین اُردو شاعر تھے اور اتفاق سے سب شاہ نصیرؔ ہی کے شاگرد تھے۔ آبِ حیات کا ان سب کے تذکرہ سے بالکل عاری ہونا محض سہو پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہی ہو سکتی ہے۔

کپتان فراسُوؔ اپنے زمانہ کے نہایت ممتاز اور باکمال اُردو شاعر تھے اور ان کی اُردو شاعری کی بڑی شہرت تھی۔ ان کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا۔ تصنیف و تالیف کا انہیں بے حد شوق تھا۔ کئی دیوان اور بہت سی دیگر تصنیفات اُنہوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے فراسوؔ کو خیراتی خاں دلسوزؔ کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے اُنہیں شاہ نصیرؔ دہلوی سے تلمذ تھا۔ چنانچہ شورؔ میرٹھی نے اپنی مثنوی میں "دہلی مرحوم" کے بیان میں شاہ نصیرؔ کا بھی ذکر کیا ہے اور اسی سلسلہ میں لکھا ہے ؎

فراسُو بھی شاگرد اُن کے ہوئے
تھے قومِ فرنگی میں شاعر بڑے

فراسُو کے والد کا نام آگسٹین کونس تھا۔ وہ جرمن تھے اور بیگم شمروؔ کے ہاں فوج میں ملازم تھے۔ اُن کی اہلیہ ایک فرانسیسی خاتون تھیں۔ فراسُوؔ سردھنہ ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام فرانسس گاڈلیو کونس تھا اپنے وقت پر یہ بھی فوج میں ملازم ہو گئے اور بہت جلد ترقی کر کے کپتان کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ابتداً ان کی ماموری علیگڑھ میں قلعدار کی حیثیت سے ہوئی ؎ شورؔ

فراسو کپتاں تھے جو عالی وقار
مرہٹہ کی جانب سے تھے قلعدار

خود بیگم شمروؔ ان پر بہت مہربان تھیں۔ چنانچہ ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ ان کو بیگم صاحبہ کے دربار سے انعام و اکرام برابر ملتے رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے دربار میں متعدد یورپین ملازم تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد (۱۸۳۶ء) سرکار انگریزی نے ریاست کو اپنے قبضہ میں لے لیا تو سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔

شورؔ میرٹھی فراسوؔ کے نواسے تھے۔ شورؔ کی پہلی شادی ہنگامہ غدر سے قبل ہوئی تھی۔ شادی کر کے شورؔ سر دھنہ پہنچے تو فراسوؔ نے بہت اعلیٰ پیمانہ پر جشنِ شادی رچایا۔ آٹھ روز تک بڑی رونق اور چہل پہل رہی کوکلا ایک نامی طوائف تھی۔ جتنی غزلیں اُس نے محفل میں گا کر سنائیں، فراسوؔ نے ان سب پر فی البدیہہ غزلیں کہیں۔ اس سے فراسوؔ کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کئی دیوان ان سے یادگار ہیں۔ لیکن اب عرصہ

سے نایاب ہیں۔ اُنہوں نے کثیر التعداد کتب تصنیف کیں۔ جن میں سے بہت سی تو ہنگامہ غدر میں تلف ہو گئیں اور جو بچ گئی تھیں اُن کا زمانہ نے نام و نشان مٹا دیا۔

راقم الحروف کو فراسو کی مندرجہ ذیل تصنیفات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

(۱) نظم انشا مسمّی نسیم دلکشا۔ منظوم رقعات کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔

(۲) مجموعہ قصاید۔ اس میں ۴۱ قصیدے شامل ہیں۔ جن میں تین مذہبی ہیں۔ اخیر میں بہت سے قطعات ہیں جو تمام تر شخصی ہیں۔

(۳) دیوان ہجویات۔ اس مجموعہ میں پنّو، خارشت، بیخوار، ژالہ باری کی ہجویات کے علاوہ سرو دھنہ کی رنڈی چندو کی ہجو، بڈھانے کی بھٹیاری کی ہجو، اور ہجو مکھن لال شامل ہیں۔

(۴) مجموعہ مثنویات۔ اس میں حسب ذیل ۱۴ مثنویاں ہیں۔
۱ کشش عشق، ۲ چراغ خانۂ عشق، ۳ گلشن عشق، ۴ مطلع نور، ۵ افراط نشاط، ۶ سرنامہ ایام، ۷ اندوہ زبا (شراب)، ۸ آتش سودا، ۹ دشت عبرا، ۱۰ شمع انور، ۱۱ عالم شوق، ۱۲ سرمایہ بہار، ۱۳ مجموعہ استہزا، ۱۴ تنبیہ الغافلین (فارسی)

(۵) نظم قطعات باوزانِ دوہرہ۔ بوزن متدارک مسمّی مقطوع رمل مسدس مقصور یعنی فعلن فعلن فاعلن، فعلن فعلن فاعلات۔ اس میں کم و بیش ۰۰۰ فردیات ہیں۔

(۶) مثنوی ظفر الظفر (فارسی) اس میں ہنگامہ غدر کی آپ بیتی بیان کر کے انگریزوں کی فتح و کامرانی کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) دیوان فارسی مع انتخاب فارسی۔ ابتدا پچاس ساٹھ رباعیات، زاں بعد غزلیات و دیگر کلام فارسی مثل مبارکباد وغیرہ۔

(۸) دیوان ہزلیات۔ نہایت گندہ اور فحش کلام ہے۔

(۹) دیوان غزلیات۔ در صنعت تجنیس محرّر مسمی مجمل جوزا۔ قابل تعریف چیز ہے۔

(۱۰) قصیدہ مبارکباد فتح قلعہ بھرت پور۔ "در بیان شجاعت و دلیری صاحبان عالیشان انگریز بہادر دام صولتہ"۔

مذکورۃ الصدر تصنیفات نظم کے علاوہ اُس دیوان کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے جو لالہ سری رام کے کتب خانہ میں تھا۔ معلوم ہوا ہے۔ کہ فراسو کا ایک دیوان علیگڈھ لائبریری میں بھی تھا۔ جس کا مختصر انتخاب مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا ہے مگر اب وہ دیوان لائبریری میں موجود نہیں ہے نہیں معلوم کیا ہوا۔ شور نے "وقائع غدر" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۶۳ء میں مطبع معدن فیض آگرہ میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں شور نے غدر کے عام کوائف قلمبند نہیں کئے بلکہ اُن تکلیفات و مصائب کا ذکر کیا ہے جن کا اُن کے خاندان والوں کو ہرچند پور اور علی گڈھ میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ فراسو ہرچند پور کے نامور رئیس اور زمیندار تھے۔ خود فراسو نے بھی مثنوی ظفر الظفر میں آپ بیتی سنائی ہے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی دوپہر کو فراسو کے ملازمین نے خبر دی کہ میرٹھ اور دہلی کی افواج نے بلوہ کر دیا ہے اور انگریزوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے ہیں فراسو نے ہنس کر ٹال دیا اور چشم نمائی کی کہ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تھوڑی دیر میں چند مسافر وہاں سے گزرے۔ اُنہوں نے ملازمین کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ رستے میں اُنہوں نے کئی لاشیں پڑی دیکھی ہیں۔ اسی اثنا میں ہرچند پور کے نمبرداروں اور زمینداروں نے آکر کہا کہ جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ سننے والوں کے ہوش پرّاں ہو گئے۔

دوسرے تیسرے دن میرٹھ سے صحیح خبریں آئیں۔ تمام ضلع میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ لوٹ مار کی یہ کیفیت تھی کہ پرگنہ باغپت و بڑوت کے جاٹوں اور گوجروں کے گھر بھر گئے اور جب گھروں کے اندر مالِ غنیمت نہ سمایا تو چھپروں پر چُن دیا۔ اس علاقہ میں فراسو کے سوا کوئی اور یورپین رئیس نہ تھا۔ عوام کو یقین تھا کہ ان کے پاس کافی مال و متاع ہے۔ شرارت پسند گروہ ان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ موضع کاٹھ کے بہت سے لوگ فراسو کے قرضدار تھے۔ موضع میں ہزار پانسو آدمیوں کی ایک پنچائت ہوئی جس میں طے ہوا کہ ہرچند پور پر دوڑ لے جا کر شبخون مارنا چاہیئے۔ دوسری طرف سے خبر آئی کہ بڑوت کے جاٹوں اور گوجروں نے بھی فراسو کو تاکا ہے ظاہر ہے کہ یہ تمام خبریں تشویش کو اور زیادہ کرنے والی تھیں۔

فراسو نے اپنے نواسہ جارج پیش شور سے کہا کہ "میرا جامِ عمر لبریز ہو چکا ہے۔ مجھے مرنے کا غم نہیں ہے لیکن تم لوگ اپنی جان و مال کی کی خیر مناؤ۔ بہتر یہ ہے کہ اس مہینے کہیں چھپے رہو۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے"۔ لیکن شور اور اُن کے بھائی جانکوٹن پیش اس تجویز پر کاربند ہونے پر رضامند نہ ہوئے۔ یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ خبر آئی کہ دہلی سے چند انگریز جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ نہایت خراب و خستہ حالت میں موضع کھیکھڑہ میں پہنچے ہیں اور کسی بیراگی کے ہاں پناہ گزیں ہیں۔ فراسو

نے خبر بھیج کر اُنہیں اپنے ہاں بُلایا۔ دوسرے دن بیراگی اُنہیں ایک چھکڑے پر سوار کر کے ہر چند پور لایا۔ اس قافلہ میں چھوٹے بڑے ملا کر ستّرہ نفوس تھے یہ واقعہ ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء کا ہے۔ ان لوگوں کی حالت بہت خستہ تھی۔ ایک ہفتہ تک ان لوگوں نے کھیکڑہ کے ایک شکستہ مکان میں قیام کیا تھا کھانے کو سوکھے ٹکڑوں کے سوا کچھ اور میسر نہ ہوا تھا۔ کئی ان میں زخمی تھے بالخصوص لفٹنٹ فارسٹ کی میم صاحبہ کی یہ حالت تھی کہ نشست و برخاست دشوار تھی سے

غم کی تپش سے زخمِ جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائرِ دل جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

دو ایک روز میں دو انگریز افسر ایک فوجی جمعیت کے ساتھ ہر چند پور آئے۔ سب سے ملاقات ہوتی ساپنے دُکھ درد کی کہانی ایک دوسرے کو سنائی۔ آدھی رات تک اکل و شرب کا لطف رہا۔ رات کو ان لوگوں نے بھی فراسو کے یہاں قیام کیا۔ اس موقع پر شورؔ کو خوب سُوجھی۔ خیال کیا کہ یہ لوگ کل میرٹھ چلے جائیں گے۔ اگر ان سے کوئی تحریر مل جائے تو کیا عجب کہ کسی وقت فائدہ بخش ثابت ہو۔ چنانچہ شورؔ نے کاغذ و قلم پیش کر کے درخواست کی کہ اگر اپنی ممنون بخشی کے بارے میں دو حرف لکھ دیجئے گا تو ہم پر احسان ہوگا۔ اُنہوں نے بڑی خوشی سے یہ درخواست منظور کی بعد ہاتھ میں قلم لے کر کچھ ایسا لکھا کہ آگے چل کر سرکار نے چار گاؤں گنجا اُنشی بصیغۂ الگذاری مرحمت کئے۔ دوسرے دن انگریزوں کا قافلہ میرٹھ کو روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ فراسو نے اپنے معتمد ملازم خدا بخش کو روانہ کر دیا۔ اور دس پانچ آدمی اور بھی ساتھ کر دیئے۔

۲۷ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کے کوارٹر ماسٹر مسٹر ٹامس بالنڈ مجروح و تباہ حال ہر چند پور پہنچے۔ ان کے ساتھ بہلسوہ (پرگنہ علی پور) کا ایک جاٹ مسمیٰ امراج بھی تھا۔ بالنڈ صاحب کی مناسب مہمان داری کی گئی۔ ان کو صاف کپڑے پہنائے گئے۔ پشت پر تلوار کا خفیف زخم تھا اُس کی مرہم پٹی کی گئی۔ روانگی کے وقت اُنہوں نے بھی ایک پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا۔ ان کے لئے بھی سواری کا انتظام کیا گیا اور ملازمین کے ساتھ ان کو بھی میرٹھ بھیج دیا گیا۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کو ایک اور صاحب تشریف لائے۔ ان کا نام ڈاکٹر بیٹسن تھا۔ اُنہوں نے جوگیوں کا بھیس بنا رکھا تھا۔ گلے میں کئی مالا ہاتھ میں تونبا، کاندھے پر مرگ چھالا۔ کرتا اور دھوتی شنگرفی۔ ڈاکٹر بیٹسن ہندوستان کی کئی زبانوں سے واقف تھے۔ کہیں کشمیری پنڈت بن گئے اور کہیں بیراگی۔ فراسو کے یہاں انہوں نے بھی کھل کر باتیں کیں حسب موقع ان کی بھی خاطر و مدارات ہوئی اور چلتے وقت انہوں نے بھی ایک سارٹیفکٹ عطا کیا۔

تمام علاقہ میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ فراسو نے برادری و قومیت کے پاس سے کئی انگریزوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور بعد ازاں اُنہیں صحیح و سالم میرٹھ تک پہنچا دیا۔ سب لوگ فراسو کی جان کے دشمن ہو گئے۔ حتّٰی کہ جو لوگ اُن کے ٹکڑوں پر پلے تھے اُنہوں نے بھی نمک حرامی پر کمر باندھ لی۔ موضع بھروَلی (پرگنہ بڑوت) کا جاٹ شاہ مل بیٹھے بٹھائے باغی بن کر اُٹھ کھڑا ہوا اور گرد و نواح کے ہزار بارہ سو بے فکروں کو جمع کر کے جا بجا غارتگری کرنے لگا۔ گاؤں والے اس کے مظالم سے تنگ آ گئے فراسو نے متعلقین کو جیسے تیسے میرٹھ بھیج دیا۔ خود اور بائی صاحبہ دونوں ہر چند پور میں رہ گئے (فراسو نے اپنے زمانہ شباب میں ایک جے پوری عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا۔ جو عام طور پر "بائی صاحبہ" کے نام سے مشہور تھی۔ کم و بیش ساٹھ برس تک دونوں کا ساتھ رہا)

بالآخر ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو شاہ مل نے ہر چند پور پہنچ کر فراسو کا گھر لوٹ لیا۔ فراسو کوٹھے پر چھپ گئے تھے۔ اُنہیں اور بائی صاحبہ کو باغیوں نے سخت اذیتیں دیں۔ ضعیفی و ناتوانی کے باعث دونوں اتنے پست ہو گئے کہ کہیں ایک ماہ کے بعد ان کی حالت قدرے درست ہوئی۔ اس موقع پر اُن کے دو ملازمین عظیم الدین اور خدا بخش نے اُن کا بہت ساتھ دیا۔ اس واقعہ کے تیسرے دن شاہ مل بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ انگریزی فوج اُس کے تعاقب میں تھی۔ ایک موضع میں اُسے جا لیا۔ اُس کا تو تلوار سے کام تمام ہوا اور اُس کے ساتھیوں کو توپ و تفنگ سے اُڑا دیا گیا۔ جولائی کے آخر میں فراسو اور بائی صاحبہ دونوں میرٹھ پہنچے اور قیامِ امن کے زمانہ تک وہیں مقیم رہے۔

فراسو کی وفات کے بارے میں شورؔ نے وقائع غدر میں تحریر کیا ہے۔

...... ناگاہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۱ء کو مسٹر فرانسس کزنس صاحب نے بباعث کبر سنی دنیائے دوں کو بدرود فرمایا۔ برکت و رونق خانہ فیض کاشانہ اپنے کو یک قلم اُٹھایا۔ اگرچہ مناسب کو برحق اور جینا بے یادِ الٰہی ناحق ہے۔ وے ایک امیر کا انتقال فرمانا چشمۂ فیض کا بند ہو جانا ہے۔

صاحب مرحوم اپنے دم قدم سے مجموعہ سخاوکرم بالخصوص تھے اور ملک الشعراء بھی مشہور تھے ... قبل از دو سال وفات اپنی کے تمامی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ازاں جملہ ایک لاکھ روپے کی تھی مع چار دیہات دیگر عطیہ سرکار فیض آثار بائی صاحبہ زن غیر منکوحہ بھی بذریعہ وصیت نامہ مصدقہ عدالت عطا فرما گئے۔ حق تلفی جمیع وابستگان اپنے کی کر گئے دس بارہ آدمی جو انعام میں عزا کر ان کو خاک میں ملا گئے ؎

دل بھی تھا اپنے تھے آشنا سو وہ درد و غم میں چھپا گئے
ہمیں جن سے چشم امید تھی وہی صاف آنکھیں چرا گئے

فراسو کی وفات کے بعد شور نے بڑے جوڑ توڑ کئے۔ تب کہیں وہ جائیداد بائی صاحبہ کے قبضے سے نکل کر خاندان میں منتقل ہوئی۔

شور کے چوتھے دیوان (مطبوعہ ۱۸۸۸ء) پر نواب محمد اشلت علی خاں صاحب رئیس قدیم شہر میرٹھ متخلص صدق نے تقریظ لکھی ہے۔ اس کے ضمن میں کچھ فراسو کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مسٹر فراسو گونس صاحب ان کے نانا بڑوت وغیرہ ضلع میرٹھ کے تحصیلدار تھے۔ حاضر و غائب خیرخواہ سرکار تھے۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء میں بجلا دے خیر سگالی تین[1] گاؤں سالم نسلاً بعد نسلاً سرکار انگریزی سے اُن کو عطا ہوئے۔ خیر خواہی میں نامزد جابجا ہوئے ماسوا اس کے شاعر نامی گرامی، شگفتگی ان کے کلام کی مشہور دور و دور ہے، "تذکرہ گلشن بے خار" میں مذکور ہے۔"

فراسو کا کلام اگرچہ عام طور پر کمیاب و نایاب ہے۔ لیکن راقم کو اُن کا کلام کافی مقدار میں فراہم ہو چکا ہے اور اُس کے مطالعہ سے اُن کے مستند و قادر الکلام شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کے کلام میں دلچسپی اور دلکشی غایت درجہ موجود ہے۔ ہر شعر ناخن بدل نظر آتا ہے۔ زبان بہت صاف اور شستہ اور بے تکلف لکھتے ہیں۔ ذیل میں اُن کے کلام (غزلیات) کا مختصر انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

چھپتا ہے کیا ہی تجھ کو لے یار مسکرانا ٭ تک واسطے خدا کے یک بار مسکرانا
غنچوں کو اے ستمگر تیرے دہن کے آگے ٭ ہنسنا تو یک طرف ہے دشوار مسکرانا

———

ہمارا یار ہم سے جب تلک باہم نہ ہووے گا
جو دل میں درد ہے، ہرگز دوا سے کم نہ ہووے گا

———

دم خفا مجھ سے ہوا، اور میں خفا دم سے ہوا
رفتہ رفتہ یہ مرا حال ترے غم سے ہوا

———

سر بدن سے ہو جدا اور ہاتھ شانے سے جدا
پر نہ سر میرا ہو تیرے آستانے سے جدا

———

بیعت کروں نہ کیونکر پیر مغاں کی زاہد ٭ ہے دستگیر مستاں مشکل میں جام و مینا

———

دیکھا ہے جب سے پیرہن اُس نوبہار کا ٭ دامن نہیں ہے ہات میں صبر و قرار کا

———

دیکھا ہر اک طرف کو محفل میں اے فراسو ٭ بیٹھے تھے ہم جدھر کو اُس نے اُدھر نہ دیکھا

———

ایسا تو کوئی ہم نے سنگیں جگر نہ دیکھا ٭ ہم مر گئے تڑپ کر تم نے اِدھر نہ دیکھا
دیر و حرم کے گھر میں گھر ہے بشر کا لیکن ٭ گھر میں خدا کے ہم نے انساں کا گھر نہ دیکھا

———

جو آپ کی دوری میں دل پر مرے غم گزرا ٭ فرہاد پہ کم گزرا، مجنوں پہ بھی کم گزرا
تھا رات فراسو کا میہمان وہ شیریں لب ٭ کیا کہئے مزا اُس سے جو کچھ کہ بہم گزرا

———

ضعف پیری نے سرِ راہ بٹھا کر مجھ کو ٭ کوکبِ چرخ سے بھی آنکھ لڑانا سیکھا
اپنا ہی قصہ جانسوز فراسو تو لکھ ٭ یک قلم لکھنے سے کیوں ہاتھ اُٹھانا سیکھا

———

چاہیئے بیمار تیرے لعل لب کو چوس لے ٭ وقت مرون ہے ستی کو پان کا کھانا روا
کون بچتا ہے فراسو ہاتھ سے اِس موت کے ٭ عاقبت سوئے عدم انسان کو جانا ہے روا

———

گُل کھلاتے کھاتے سینہ یہ رشکِ چمن ہوا ٭ جو داغ دل اُٹھا وہی لعلِ یمن ہوا
رو کر اُڑھائی چادرِ آبِ رواں مجھے ٭ مردہ کوئی جو آگے مرے بے کفن ہوا
تا حشر رکھا مجھ کو امانت زمین نے![2] ٭ میلا مرا نہ ایک بھی تارِ کفن ہوا
اک پل زدن میں چشموں کے چشموں کو بھر دیا ٭ دریائے اشکِ چشم کا جب موجزن ہوا

[1] سرکار سے چار گاؤں عطا ہونے تھے مگر ایک گاؤں شورش کے جز ترش کی نذر ہو گیا تھا۔

[2] امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک — نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا۔ آتش۔ (ادارہ)

داغِ وفا کا سکہ یہ عاشق جما گیا　　بازارِ عشق میں جو وفا کا چلن ہُوا
ہمراہ ہے فراسو کے اک لشکرِ طفول[۱]
مشہور اُس کا وادی میں دیوانہ پن ہُوا

———

مت میری لاش کو چمنِ یاسمیں میں داب　　اے رشکِ گُل تو اپنی گلی کی زمیں میں داب
ابرو کماں کے تیرِ ستم میں نے سیکڑوں　　رکھے ہیں تودۂ دلِ اندوہ گیں میں داب
رو رو فراسو کھول کے دل بزمِ یار میں!　　تا چند غم کو رکھو گے جانِ حزیں میں داب

———

گاتے ہیں قولِ معرفت مرغِ چمن علی الصباح　　ملتے ہیں آکے وجد میں سروِ سمن علی الصباح
جھولے فراسو عقل و ہوش محو ہُوئے بیک نگاہ　　آج سُنے جو رشکِ مہ تیرا سخن علی الصباح

———

رکھ اُس کے تصور میں سدا دیدۂ تر بند　　لازم ہے کہ کاشانۂ خلوت کا ہو در بند

———

رُوٹھ کر پھاڑو گریباں تم ہمارا کھینچ کر　　ہم منا لیں گے تمہیں دامن تمہارا کھینچ کر
اپنے تو بختِ سکندر پر فراسو مت اکڑ　　دیکھ ذلت مر گیا آخر کو دارا کھینچ کر

———

ہو کیوں نہ مہر و ماہ کا دماغ آسمان پر　　دن رات جبہ سا ہے ترے آستان پر
قامت ہے مثلِ سرو، دہن غنچہ، رُخ چمن　　کیا ہی بہارِ حُسن ہے اُس نوجوان پر

———

حیرت رہی نہ دیدہ مہتاب کو فقط　　تکتے رہے تمام ستارے پلنگ پر
پڑتی نہیں ہے کل کسی کروٹ ذرا مجھے　　پھرتا ہُوں لوٹتا ہُوا سارے پلنگ پر

———

اے دلِ مضطر تو زیرِ خاک نالوں کو نہ چھیڑ　　چین لے اب تو عدم کے سونے والوں کو نہ چھیڑ
کیوں وبالِ جاں کیا چاہے ہے ناصح زندگی　　تیرہ بخت! اس زلف کے آشفتہ حالوں کو نہ چھیڑ
اے فراسو سُن بقولِ شخص کیا ہے فائدہ!　　دم میں خوش دم میں خفا ہو جانے والوں کو نہ چھیڑ

———

بیٹھے ہیں غیر یُوں مرے دلبر کے آس پاس　　ہر خار جس روش سے گُلِ تر کے آس پاس

———

گئی نہ دل سے تہِ خاک الفتِ معشوق　　برنگِ خار ہوں بے جاں بدولتِ معشوق

———

آہِ سوزاں کا مری ہرگز اثر ہوتا نہیں　　لگیو اے بیدرد اس تیرے دلِ پُرفن میں آگ

یار سے دور ہو گئے ہیں ہم　　سخت رنجور ہو گئے ہیں ہم
رات کوچہ میں یار کے سو بار　　نا بمقدور ہو گئے ہیں ہم
جلتے دل کی فراسو کر کے سیر　　مُوسیٰ طور ہو گئے ہیں ہم

———

ساتھ اپنے سدا لشکر ہے گریہ و نالہ کا　　شوکت اسے کہتے ہیں حشمت کے یہ معنی ہیں
ہم خاک ہُوئے تو بھی در سے نہ ٹلے تیرے　　اُلفت اسے کہتے ہیں چاہت کے یہ معنی ہیں

———

اب کی جو ملے مجھ سے تو یار ہے اور میں ہُوں
اس وعدہ خلافی کی تکرار ہے اور میں ہُوں
وہ دل مرا مانگے ہے، میں وصل کا طالب ہُوں
انکار ہے اور وہ ہے، اقرار ہے اور میں ہُوں
وہ دن گئے جب تیرا دیدار تھا اور میں تھا
اب در و آنکھوں کے دیوار ہے اور میں ہُوں

———

خوب نہیں اس قدر حُسن پہ کرنا غرور　　لے لے کے انگڑائیاں دیکھو ہو پرچھائیاں
تم جو فراسو سے یوں رہتے ہو ناخوش سدا　　کس نے یہ باتیں تمہیں سچ کہو سکھلائیاں

———

پڑے ہیں کاٹنے پیری میں اب عذاب کے دن
وہ نوجوانی کہاں اور کہاں شباب کے دن
کہوں میں دل کے تڑپنے کی کیا حقیقت آہ
خدا کسی کو دکھلائے نہ اضطراب کے دن

———

کیوں نہ دل میرا کرے اب اضطراب آغوش میں
ایک شب بیٹھا نہ وہ خانہ خراب آغوش میں

———

نہ تختِ روم کی خواہش نہ ملکِ شام لیتے ہیں
تمہارے نام کو ہم صبح سے تا شام لیتے ہیں

———

رُوئے روشن ہے ترا، پیش نظر دیکھیں تو　　آنکھ کرتے ہیں اُدھر شمس و قمر دیکھیں تو
خانۂ چشم تو اشکوں نے بہا بھی ڈالا!　　آئے کیا خاک نظر، نورِ نظر دیکھیں تو
چشم سی چشم ہے دیکھیں تو تجھی کو دیکھیں　　تو ہی پھر آوے نظر ہم کو جدھر دیکھیں تو

———

۱؎ بجائے اطفال ——— ؟ (ادارہ)

چشمِ عالم میں ہو خورشید قیامت بے نور حشر کے روز مرے داغِ جگر دیکھیں تو
زلف و رُخ کا ہے تمہیں دھیان فراسو کب تک روؤ گے تم شام و سحر دیکھیں تو

میں تو بیٹھا ہوں دربان سے اُن کو کچھ فرمانے دو
بھوکا تھا اس ناز کا میں بھی گالیاں مجھ کو کھانے دو

آباد ایک روز نہ دیکھا کبھو اُسے کیا ہے کے بیں سردار دل خانہ خراب کو

ملا ہے تم نے بھی کیا کیا مضائقہ کیا کام دوستی میں کیا کیا منہ نائقہ
آنکھوں سے جو نہ دیکھا نہ کانوں سے تھا سنا دکھلا ان آنکھوں نے وہ دیا کیا مضائقہ
دل کی تپش کو نہیں کے مرے اضطراب کو تم نے تو آزما تو لیا کیا مضائقہ
خوشنود اس کو رکھا فراسو نے جان دی اُلفت کا پاس اُس نے کیا کیا مضائقہ

دردِ پیرِ غم ہے ناتوانی ہے مرگ کا نام زندگانی ہے
یہ جو دشمن غمِ نہانی ہے یہ بھی ایک اپنا دوست جانی ہے
غافل ہم اُس سے دور رہے ہیں عمرِ رفتہ کی قدر دانی ہے
سوزِ دل اس طرح زباں پہ آئے اب بت نامہ وشی بیزبانی ہے
وہ تو تعمیر کر چکے ہیں بہت منزل گور اب بنانی ہے
اور بھی اک غزل فراسو پڑھ اب یہ ہنگام شعر خوانی ہے

درِ جاناں پہ گر اپنی جبہ سائی ہوتی دیر و کعبہ میں ہماری نہ رسائی ہوتی
پُشت پا مار کے ہم تخت سے دور ہو جاتے جو میسر ترے کوچے کی گدائی ہوتی
غم و درد و الم، اندوہ و فغاں کا ہے ہجوم ایک دل اس میں بھی کس کس کی سمائی ہوتی
اپنی تقصیر نہیں یار زمانہ ہے بُرا کرتے ہم جس کا بھلا اُس سے بُرائی ہوتی
عاشقی میں نہ خلل تیری فراسو آتا آنکھ ناصح کو اگر تو نے دکھائی ہوتی

آہ و فغان و گریہ و سوز و تپاک و درد کیا ہم بھی ساتھ اپنے یہ سر انجام لے چلے

فلک پر ہے جو میزان اُس کے دونوں پلے ہیں خالی
مرے تن کے وہاں بھی جھکتے ہیں پلے ترازو کے
خیالِ چشمِ موتی[1] پرو ہیں جب دم میں روتا ہوں
دُرِ خوش آب سے آتے نظر ہیں قطرے آنسو کے

بطرز زور و بل[2] خم ٹھونکتا ہے بزمِ شعرا میں
کبھی مضموں فراسو کو جو ہاتھ آتے ہیں بازو کے

کیوں اُتر جائیں بھلا ہم خاطرِ دلدار سے اُس کا مطلب مجھ سے اور میرا ہے مطلب یار سے
بندش رشتہ ہے ہم کو اک بُتِ عیار سے کب مسلمانوں کو ہے عار ہے زنار سے
یاس و غم کے ہوں مضامیں جس میں وہ پڑھتے غزل
ہم تو ہوتے ہیں فراسو خوش ترے اشعار سے

شگفتہ زخم ہے داغِ جگر سے مرا سینہ بہارِ بے خزاں ہے
خدا پنہاں ہے اور بندہ ہے ظاہر نہاں بھی چشمِ بینا میں عیاں ہے
پڑی ایڑی پہ آ کر اُس کی چوٹی ! زمیں کے سر بلائے آسماں ہے
کہاں سے آئی اور جاتی کدھر ہے یہ جوں ریگِ رواں عمرِ رواں ہے
زمینِ شعر بالا ہے فراسو زمینِ شعر سے پست آسماں ہے

دل اُس کے دم میں نہ آتا وہ یار کس کا ہے کسی کے دل پہ بھلا اختیار کس کا ہے
نگاہِ ناز نفس میں یہ ناخنِ مضراب کہو یہ پردے میں بجتا ستار کس کا ہے
کرو نہ نالہ و گریہ سدا فراسو تم
وہ بے وفا ہے صنم غمگسار کس کا ہے

اس مختصر انتخاب سے ناظرین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ حضرت فراسو کو اپنے جذبات کے اظہار پر کہاں تک قدرت حاصل تھی۔ محاورے اور ترکیبیں، الفاظ کی بندش، مضامین کی لطافت، زبان کی صفائی اور روزمرہ ـــ غرض ہر لحاظ سے اُن کا کلام اُس زمانہ کا بہترین کلام ہے۔ ایک ایک شعر متانت و پختگی کا نمونہ اور اُن کے کمالِ سخن کا شاہد ہے۔ شوخی اور بے ساختہ پن کی چاشنی موجود ہے۔ پھر حشو و زوائد سے پاک اور محاسنِ صوری و معنوی سے لبریز و مملو۔ اور جب اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ یہ کلام اُس شخص کا ہے جس کو دنیا سے رخصت ہونے پر ایک صدی گزر چکی ہے۔ تو اُس کے کمالِ فن اور قدرتِ کلام کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

دیگر اصنافِ سخن میں فراسو کا وہ دیوان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو صنعتِ تجنیس میں محرّر ہے۔ آج کل تو کلام میں ایسی صنعتیں

---

[1] فارسی اضافت کا ایسا استعمال ناپسندیدہ ہے۔

[2] زور و بل ـــ "بطرز شور و غل" ؟ ادارہ

مفقود ہیں۔ اور پُرانے شعرا میں بھی بعض نے ایک ایک دو دو غزلیں کہی ہیں۔ لیکن فراسو نے اسی صنعت میں پورا دیوان کہا ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

دوسری قابلِ ذکر چیز دوہرہ کے انداز میں فردیات ہیں۔ ان میں ہر قسم کے مضامین نظم کئے ہیں۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

بادِ ہوائی زیست ہے آئی اور چلی　　دولہ کی سی برات ہے چھائی اور چلی

بے مرضی اللہ کی ہووے کب کچھ اور　　وہ چاہے تو آن میں ہووے سب کچھ اور

دل لینا کچھ اور ہے دلداری کچھ اور　　سر دینا کچھ اور ہے سرداری کچھ اور

جینے سے مرنا بھلا ہم تو مرتے ہیں　　ایسا جینا کیا کریں دُکھ ہی بھرتے ہیں

ابرو اُس کی قتل پر میرے مٹک چلی　　مُنہ میں نے موڑا نہیں گردن ڈھلک چلی

چھاتی پر اپنے کھلے سر کے بال نہ ڈال
یہ بے ریشہ آم ہیں ان کو پال نہ ڈال

فراسو کے باب میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں حمد و نعت میں بھی کلام موجود ہے اور افراط سے ہے۔ کئی مسلسل نظموں کے علاوہ وہ تقریباً تمام مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ بعض مثنویوں میں ساقی نامے ہیں۔ وہ بھی بالکل مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دیگر یورپین شعراء اُردو کے یہاں نعتیہ کلام قریب قریب مفقود ہے۔ صرف چار پانچ شعراء کے یہاں ایک آدھ نعتیہ غزل ہے اور بس۔ ہاں شور کے یہاں نعتیہ کلام کی کمی نہیں۔

(حقوق محفوظ)

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

رباعیات

(۱)

صد شکر کہ ہوئے آج نوازش فرما
صد شکر کہ ہو بالیں پہ جب جلوہ آرا
کیا تجھ سے کہوں درد کہاں اے دوا
جب جا کے ترا ہاتھ نہیں ہے اُس جا

(۲)

پہلو میں محبت کو چھپا رکھا ہے
سینے میں ترے غم کو لگا رکھا ہے
میرے دل مضطر میں نہیں شیشہ ہو دوست
آئینے کے گھر میں اور کیا رکھا ہے

سعید احمد اعجاز

فردا کی اُمید

پھر حُسن بزمِ شوق میں جلوہ نما ہُوا ۔۔۔ خاموش ہو گیا، یہ مرے دل کو کیا ہُوا

رازِ بقا سمجھ نہ سکا جب بقیدِ زیست ۔۔۔ فردا کی اک امید پہ انساں فنا ہُوا

تیری وفا پہ نقشِ وفا کا تھا انحصار ۔۔۔ تو بے وفا ہُوا تو جہاں بے وفا ہُوا

اُس نے بھلا دیا تجھے، تھی یہ بھی مصلحت ۔۔۔ لیکن تُو اُس کو بھول گیا، یہ بُرا ہُوا

سامانِ بے خودی ہی خودی کا تھا اہتمام ۔۔۔ لے آئے تم جو ہوش میں ہم کو تو کیا ہُوا

محفل میں اور کوئی نہیں اپنا راز داں ۔۔۔ ہم سوز اک دیا ہے سو وہ بھی بُجھا ہُوا

دل جس نے آدمی کو دیا آرزو نصیب
غم بھی تو اے ضیاؔ ہے اُسی کا دیا ہُوا

ضیاؔ فتح آبادی ایم اے

تجلّیات

(۱)

ہے اگر دردِ آشنا کوئی — مرے حق میں کرے دعا کوئی
لطف سے جور سے تغافل سے — لے گیا دل کو خوش ادا کوئی
ہجر میں مشغلہ نہیں دل کا — آپ کی یاد کے سوا کوئی
پھر ہے محجوب وُہ نگاہِ ناز — پھر ہے بے تابِ مدعا کوئی
دردِ دل کی دوا ہو تم شاید — اور اُس کی نہیں دوا کوئی
نالۂ دل میں پھر ہوئی تاثیر — مائل لطف پھر ہُوا کوئی

اُس نے پوچھا جو حالِ دل اکبر
کچھ نہ بن آئی رو دیا کوئی

(۲)

حضرتِ دل نہ ہو گلا کوئی — ورنہ ہو جائے گا خفا کوئی
حاصل آہِ سرد کچھ بھی نہیں — کیجئے نالۂ رسا کوئی
دل رُبائی کا لازمہ تو نہیں — سخن تلخ و ناروا کوئی
ہوتے ہو بات بات پر برہم — کیا کرے تم سے اِلتجا کوئی
ظلم ہر آن، جوُر ہر لحظہ — یہ بھی ظ[illegible] ہوئی ادا کوئی
مجھ پہ طعنے ہیں بے وفائی کے — اِس [illegible] کرے وفا کوئی
یا خفا مجھ سے بے سبب نہ رہو — یا بتاؤ مری خطا کوئی

رُوٹھتا ہے تو رُوٹھنے دے جلال
وہ بت آخر نہیں خدا کوئی

جلال الدین اکبر

من کی من میں

مادھو کی بیوی کو لوگ کلکارنی پکارتے تھے۔ اگرچہ بہت کچھ چوکنا نہیں تو یہ نام گلتارنی سے ہی تو بگڑا کر بنا تھا۔ مطلب کل کی رڈوبتی ہوئی نیا کو پار لگانے والی۔ یہ پیارا دلارا نام نہ صرف کل کو لاج لگانے والی سے اختلاف ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کا کچھ اور بھی گہرا مطلب ہے جتنے میرے سوا کوئی کم ہی جان سکتا ہے۔ گلتارنی یا کلکارنی کے کچھ اور معانی نکل بھی تو نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نام ہوتے ہی کچھ گورکھ دھندے سے ہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیوں بعض وقت جنم کے اندھے کو نین سکھ اور جنم کے اگیانی کو ودیا ساگر کہتے ہیں۔

کئی دفعہ کوئی بھولا بھالا بچہ اچانک اپنی ماں سے سوال کر دیتا ہے کہ میں اس دنیا میں کہاں سے آیا تو ماں گھبرا کر جواب دیتی ہے بیٹا! نرالی پورنما کے روز اندر بھگوان نے بہت سا مینہ برسایا۔ اس وقت بہت سے بچے آکاش سے گرے تھے۔ ان میں سے ایک تم تھے۔ مجھے بہت من موہنے لگے۔ اور میں نے تمہیں صحن میں سے اٹھا لیا۔ یا کہتی ہے تمہارا باپ ایک سو بیالیس گھنڈیوں والا جال لے کر رام تلائی یا شاہ ملور کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑنے گیا۔ وہاں نہ مچھلی تھی نہ کچھوا صرف جونکیں تھیں ایک ننھا سا مینڈک عمرو جولاہے کے گھر کے سامنے روئی کے ایک گالے پر آرام سے بیٹھا ہوا برسات کی خوشی میں گا رہا تھا۔ وہ تمہیں تھے۔ تمہارا باپ تمہیں اٹھا لایا اور ہم نے پال لیا۔ کچھ ایسی ہی بات ہم نے مادھو کے متعلق بھی سنی تھی کہ وہ چکنی مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا ——— ادھر ندیا میں طغیانی آنے پر مٹی کے ایک ڈھیلے نے رام تلائی کے مندر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو چھوا۔ مٹی پانی اور ہوا تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ آکاش اور آگ ملی تو بچہ بن گیا اور یہ سب کچھ ٹھاکر جی کی دیا سے ہوا ——— گلاب گڑھ کے تمام پرائمری پاس یا مڈل فیل آدمی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ بھلا وہ اس بات کا جواب تو دیں کہ سیتا جی کس طرح کھیت میں دبائے ہوئے ایک گھڑے کو ہل کی ٹھوکر لگ جانے سے پیدا ہو گئیں؟ کان جی کس طرح کنتی جی کے کانوں کی میل سے بن گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کش کو کشا یعنی گھاس سے کیسے بنا لیا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا پھر بھی اُسے مٹی کا مادھو نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ ایک بہت سمجھ دار آدمی تھا۔ اگر گھر کے آدمی اُسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا کرتے گھر میں جوگی کس کو بھایا . . . . گھر والوں کو تو وجہ شکایت یہی تھی نا کہ مادھو گھر کا کام کاج کرنے کی بجائے دوسروں کا کام کر کے زیادہ خوش ہوتا تھا اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق۔ قد کا گٹھیلا تھا اور جسم کا اکہرا عمر یہی کوئی چالیس بیتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر کے چیچک کے داغ گورے رنگ سے گھل کچھڑی ہو رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھیں تو رسیلی تھیں ہی۔ مگر مادھو کی زیادہ دو رنگ مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو ابھری ہوئی تھیں اتنی ابھری ہوئی کہ سوتے میں در فتنہ کی طرح ہمیشہ نیم باز رہتیں گلاب گڑھ کے پرائمری سکول کے منشی بھائی کریب داس جو کبھی کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ ردی سی فلم کے نظارے سے مستفیض ہو آیا کرتے تھے۔ مادھو کی آنکھوں کو پیا ملن کی آس مارکہ آنکھیں کہا کرتے تھے اور اُن کے ہونہار شاگرد اپنے اُستاد کے ارشاد پر تضمین کرتے۔ یا بالکل تجدید کرتے ہوئے مادھو کو ہمیشہ گاڈر نینا کہتے تھے!

کلکارنی زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تاریک پہلو کو دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں ایک دلچسپ مگر خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر اُن کی آپس میں ایک آدھ جھپٹ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس

درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اُسے بازار میں ملتا تو بجائے جے رام جی کی یا صاحب سلامت کے کہتا۔

"کہو بھئی مادھو ——— من کی من میں رہی؟"

فنا کا نمایندہ اور قنوطیت کا علمبردار فی الفور ایک گہری ٹھنڈی سانس لیتا اور کہتا۔

"ہاں . . . بھائی ——— من کی من ہی میں رہی!"

اور اس قسم کا طریقۂ تخاطب کلکارنی کو سر سے پاؤں تک جلا دینے کیا کرتی وہ؟ گلاب گڑھ کے لوگ تو اُس کی شادی سے پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں مخاطب کرنے کے عادی تھے انہیں روکنا اُس پودے کو موڑنے کے برابر تھا۔ جو ایک خاصا تن آور درخت بن چکا ہو۔ بہر حال وہ بہت ہی جھلاتی اور جو کوئی مادھو کو یوں مخاطب کرتا۔ اگلے روز اُس کی بیوی، ماں یا بہن سے کلکارنی کی لڑائی ہوتی اور کلکارنی جواب طلب کرتی۔ "آخر اس من کی من میں رہی کا مطلب کیا ہے؟"

مادھو کلکارنی کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ دفلی بجاتا اور کہتا۔

"میری زندگی کلکارنی کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالانکہ نہ اُسے ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب . . . . ارے تین مہینے سے تو پیٹ رہی ہے۔"

ایک دن میں نے مادھو کو یک بیک فلسفی بنتے دیکھا۔ منشی گریب داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروت کو سراہ رہا تھا ——— کنگرو کی فلاسفی سے زیادہ عجیب، بھدّا اور دیہاتی انداز میں . . . اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اُس کا اشارہ کلکارنی کی طرف ہے۔ اُس کے لفظ تھے۔

"بھائی گریب داس . . . . اگر دنیا عورت کی بجائے آدمی کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دنیا پریم اور نرمی کا نام ہی نہ رہے۔ عورت آدمی کو اپنی کوکھ سے جنم دے کر اس کے اکھڑپن کو دور کر دیتی ہے۔"

کتنا حقیقت سے لبریز تھا مادھو کا عملی فلسفہ۔ ایسی لاکھوں کی ایک سن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو کہے کیا وہ خود مٹی کا مادھو نہیں ہے؟

(۲)

برج والے کنوئیں کی بیڑ، جھرکل، ڈھول یا لٹھ ٹوٹتی ٹوٹ جائے گی۔ مگر مادھو اس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوڑی سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر اور کم سے کم چارہ ڈال کر اس کے مزارعے دو دو سکے کے بیلوں کی جوگ کو ایسی ناکارہ بنا دیں گے۔ کہ گلوشاہ کے بھرے میلہ میں اُن کی قیمت پچاس پچاس روپے سے کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی غمی کے موقع پر مادھو سے کسی قسم کی مدد کی توقع بے کار ہو گی۔ مگر وہ دوسروں کی مدد کے لئے کتنی جلدی لنگر لنگوٹا کسے گا . . . . گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبو رہتی تھی۔ زلیخا، اُس کے خاوند کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔ اُسی روز سے بیچاری اپنی عزت کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اگر اُسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بے چاری کبھی کی تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح کے بہتان تراشتے۔ طرح طرح کی باتیں بنا کر معصوم مادھو اور بدنصیب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو وہ خود دینے سے ہچکچاتی ہے۔ اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ امبو کی مدد پر لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی اور اس مخالفت میں کلکارنی سب کی پیشوائی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ سماج کے دائرہ میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ کے رہے سہے گوشت و پوست کو نوچ نوچ کر کھانا کوئی پاپ نہیں!

ایک دن مادھو کہیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"مجھے بیس روپے دو گی ——— کارنی؟" مادھو نے گاڑھے کی چادر کو شانے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے اتنے روپوں کو؟"

مادھو کو اسی سوال کی توقع تھی۔ کارنی کو اس بات کا وہم رہتا تھا۔ کہ مادھو اپنی پُر سخاوت طبیعت کی وجہ سے بجا و بے جا روپیہ خرچ کرتا رہتا ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپ کھایا سو کھایا جو کھلایا سو گنوایا وہ روپیہ جمع بھی کرتی تو اس لئے کہ زندگی میں کبھی کام آئے گا۔ گویا وہ ہمیشہ جیتی ہی رہے گی ——— اتنی لمبی آس ——— اور شرادھ میں گئے گذروں کے نام پر وہ بہت سا روپیہ دان بھی کرتی مگر اس قسم کے دان سے مادھو متفق نہیں تھا۔

"کیا کرو گے ان روپوں کو؟" اس سوال کا جواب مادھو نے پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔

"چند دن ہی ہوئے تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لئے کہہ رہی تھی . . . . میں باہر جا رہا ہوں۔ بنوا لاؤں گا۔"

کلکارنی اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کے لئے کون بیس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی ہانسلی اٹھا لائی اور بیس روپے کے بچیس مادھو کی کمر میں بندھوا دیئے اور بولی۔

"سنو کل سنگرانت ہے۔ ۔ ۔ مکر سنگرانت تمہارے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار ہوگا۔ ہو سکے تو سنار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آنا۔ ۔ ۔ پل کی پل پہن لوں گی۔ جلدی آنا میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے"۔

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی ہانسلی پر ایک چست سی صدری ڈالی اور چل دیا۔

سنگرانت بھی آ گئی اس دن سورج دھن راسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے۔ اس لئے اسے مکر سنگرانت کہتے ہیں۔ سنگرانت کی دیوی نے سوائے مادھو کے پاپ کے گلاب گر ہ تو گیا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سبھی دیہی عورتیں تل، گڑ، بیر، امرود اور گنڈیریاں بانٹ رہی تھیں۔ پریم کے اس تہوار کو 'اوٹی بھرن' کہتے ہیں۔ یوں اوٹی بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری زندگی میں ایک روح پھونک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔ دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو"

چونکہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیوہار تھا۔ دونوں کو صحن کے وسط میں ایک دھوتی اور ایک لنگوٹی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔ جسم پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور دولہا کی بہن نے دولہا کو بھیلے گاتے ہوئے نہلایا۔ پھر انہیں خوبصورت کپڑے پہنائے گئے۔ صحن کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چند پرانے سے ناقوس اور نفیریاں بجائیں۔ دف پر چوٹ پڑی۔ کلکارنی نے سیندور، مصری اور ناریل بانٹا۔ اس وقت مادھو کا دھاتی لینے کے لئے وہاں ہونا لازمی تھا۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکارنی کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر مادھو کو کوستی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو ساڑھی کے پلوؤں سے چھپاتی۔ ۔ ۔ کلکارنی جان گئی کہ سنار نے ہنسلی بناتے ہوئے دیر لگا دی ہوگی۔

کبھی کبھی اُسے خیال آتا۔ شاید مادھو میری زیادتیوں کی وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مکر سنگرانت کے دن روٹھے منائے جاتے ہیں۔ مگر سیدھا سادا مادھو اتنے چھل بل کہاں جان سکتا تھا ——

سنار کے پاس آدمی دوڑایا گیا۔ تو پتہ چلا کہ مادھو وہاں پہنچا ہی نہیں۔

مادھو کی ڈھنڈیا پٹی۔ کوئی کچھ تھوڑے ہی تھا کہ راستہ بھول جاتا۔ کلکارنی کی تشویش بڑھی۔ اُس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔ اس بات میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کلی طور پر کلکارنی سی ہوشیار عورت کو سونپ رکھا تھا۔ مگر اتنا بے مہر نہیں تھا کہ اپنے بہو بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگن منانے سے احتراز کرتا۔

شام تک نہ مادھو پہنچا اور نہ کلکارنی کی ہنسلی اور پازیب۔ کلکارنی کا غصہ اور فکر دونوں سرعت سے بڑھنے لگے۔

جب شام کو دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا کان برابر کی خاموشی کو پا کر شائیں شائیں کرنے لگے۔ اس وقت کلکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پڑوسی بنجارہ کہہ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔

"کہو بھائی۔ ۔ ۔ ۔ مادھو! من کی من میں رہی؟"

جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی۔ "ہاں بھائی! من کی من ہی میں رہی!"

اب تک تو کلکارنی کی فکر اس کے غصہ پر غالب تھی۔ اب مادھو کو بے آنچ پہنچے اور پھر برس کے برس، 'دن من کی من ہی میں رہی' کے الفاظ کہتے سن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک راکھ ہی تو ہو گئی بجلی کی مانند لپکی، صحن میں آئی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دی ننگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا۔ اس اثنا میں مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ پوہ ماگھ کی سردی جگر تک پہنچتی ہے۔ کانپتے ہوئے مادھو نے کلکارنی سے دروازہ کھولنے کے لئے منت کی۔

اندر سے آواز آئی "ہٹ جاؤ —— باہر ہی رہو۔ اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے! جدھر منہ اُٹھائے ہو اُدھر چلے جاؤ —— اُترتے ہو تو اُتر کو دلہن ہے تو دلہن کو۔ ۔ ۔ ۔ گھر کیا ہے ہنسی کھیل بنا رکھا ہے۔ بڑی سونٹھ کی جڑ تلاش کرنے گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی نہیں سوجھتی گھر میں خوشی ہے۔ ۔ ۔ پرمیشر نے چاہا تو یہ من کی من میں ہی رہے گی۔ ۔ ۔ ۔ واویلا کیوں کرتے ہو؟"

مادھو کچھ دیر کے لئے ٹھٹک گیا۔ پھر بولا "دروازہ تو کھولو ——

کارنی، دیکھو سردی کے مارے اکڑ رہا ہوں۔ تمہاری ہنسلی اور پازیب ہی تو بنوانے گیا تھا۔"

"میں جانتی ہوں تمہاری تو پرچھائیں تک سنار کے پاس نہیں پھٹکی . . . سچ سچ کہو کیا تم اُس میری سوت کے پاس نہیں گئے تھے؟"

"کون سوت؟"

"امبو —— اور میری سوت کون ہوگی؟"

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلکارنی کے سامنے اس بات سے انکار کرنے کی اُسے جرأت نہ پڑی۔ اور وہ انکار کرتا بھی کیوں؟ بولا۔

"ٹھیک ہے کارنی —— امبو بہن نے کہلا بھیجا تھا۔ ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دو دو اور دو دو کے تین تین بنا لئے ہیں . . . اور میں نے بیس روپے تم سے در اصل اسی لئے مانگے تھے۔ تمہاری ہنسلی میں اپنے پیسوں سے بنوا دوں گا جو ڈاک گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو۔ دروازہ تو کھولو۔"

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلکارنی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"برس دن بعد ایک آدھ دن خوشی کا آتا ہے . . . . اُس میں بھی دکھ ہی ملتا ہے . . . . بہو بیٹے کا تہوار روز روز آئے گا نا . . . . سہیلے روز روز گائے جائیں گے نا . . . . ایسے موقع پر خوشی کو دبا کر کون دِق مول لے . . . . یہ ہیں کہ . . . ."

مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

"کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے تو مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے!"

کلکارنی نے دروازہ نہ کھولا . . .

مگر اُسے نیند کہاں آئی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اُس نے آہستہ سے کواڑ کھولے تو دیکھا۔ اس کا مجازی خدا دروازہ کی چوکھٹ پر سر ٹیک کر اونگھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے لگ رہے تھے۔ کلکارنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس سے اُس نے مادھو کا شانہ ہلایا۔ بولی۔

"میں کہتی ہوں . . . ."

". . . ."

"جی میں کہتی ہوں . . . . چلو گے! اندر . . . ."

مادھو نے آنکھیں ملتے ہوئے سر اٹھایا۔ اور بولا۔ "ہاں . . . چلوں گا!"

مادھو اندھیرے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ سردی میں ہاتھ سن ہو رہے تھے۔ یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ اُس کے اپنے نہیں ہیں۔ کلکارنی نے جلدی سے انگیٹھی جلائی۔ مادھو کے اکڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر دیر تک روتی رہی —— اور یہ رونا دھونا کاہے کا . . . مادھو کو تو ذرا بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس ہوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کراہتا رہا۔ کلکارنی نے گھی گرم کر کے جائفل کوٹ کر مالش بھی کی۔ مگر مادھو کا دُکھ بڑھتا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے اُس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دور نزدیک سے سیانے لائے گئے۔ مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اُس کے دونوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔ کارنی کہتی تھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ امبو بہت گنڈے تعویذ جانتی ہے۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا اگر وہ گذشتہ شب کے واقعہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا قصور مان لیتی تو وہ دیوی سے کم کیا ہوتی مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

ایک پہر بعد مادھو کو کچھ افاقہ ہوا۔ اس نے کارنی کو بلایا۔ اور بولا۔

"میں نے سنا ہے . . . کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔ صبح جب وہ میری خبر لینے کے لئے آئی تھی . . . کیوں؟"

"نہ جانے کیوں۔"

"تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں . . ."

"ہاں . . . مگر میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی۔ تمام دنیا میرے پیچھے کُتے لگائے گی . . . جانتے بھی ہو دنیا کو . . ."

"جانے دو دنیا کو" مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد کی ایک ٹیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اب جبکہ میں مر رہا ہوں۔ مجھے دنیا کی پرواہی کیا ہے . . . میرے پاس تو اتنے بول بھی نہیں کہ میں امبو بہن اور اس کے ساتھ اپنے رشتہ کی پاکیزگی کا دعوے کر سکوں . . . ہائے . . . تم اپنے مرتے ہوئے پتی کو بچن دو کہ تم اپنی زندگی میں اُس غریب کی ایسے ہی خبرداری کرتی رہو گی . . . اُسے اپنے پاس بلا لو گی . . . کہو تو . . ."

"میری خبرگیری کون کرے گا؟ . . . تمہارے دشمنوں کو . . ."

کلکارنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا دی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ مگر کارنی دنیا سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لئے بھی اثبات میں سر نہ ہلایا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح تڑپتا رہا جس کے دل میں بہت سی خواہشیں ہوں۔ مگر موت اُس کا گلا آدبائے۔ ۔ ۔ کچھ دیر بعد مادھو کا درد ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد مرحوم کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر یاد آتی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی "کسی بھائی بہن کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں۔ نہ گائے جائیں گے"!

(۳)

ہمارے ملک میں تہوار تہوار ہی تو ہیں اور ہے ہی کیا! کاش یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا۔ رانڈیں اور یتیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار مکر سنکرانت آگئی۔ پھر سورج دھن راسی سے مکر راسی میں داخل ہوا۔ سنکرانت کی دیوی نے سماج کے کلنک یعنی امبو کے پاپ کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی بیخ کنی کے لئے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں کو پھیلا اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوٹی بھرن کرتے ہوئے دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو"!

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ایک ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مناتی۔ ایک رلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اُس سے روٹھ گیا تھا ہائے! رلیا اور مادھو ایسے روٹھنے والے کوئی ماننے کے لئے تھوڑے ہی روٹھے تھے!

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لیپ پوت یوں کیا گیا تھا۔ جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا عجب جو کہیں گھومتا پھرتا رلیا ہی آجائے۔ نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکارنی اور اس کی بہو بیٹیاں خاص طور پر اُس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیونکہ اُسی نے تو مادھو کو کوئی جنتر منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اُس نے ایک کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، بیر اور گنڈیریاں وغیرہ رکھیں تاکہ مادھو کی بہو کو دے آئے۔ اپنی پھٹی ہوئی ساڑھی کے ایک پلو سے اُس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چلی۔

امبو کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ ہوتی تھی۔ آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"لو بہن ـــــ وہ رہی تمہاری سوت"!

کلکارنی اُسے دیکھ کر جل بھن گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "مرتی بھی نہیں کمبخت ۔ ۔ ۔ مرے تو میں آٹے میں لوبان اور گھی ریندھوں ۔ ۔ ۔ ۔ دودھ کا کٹورا پیوں ۔ ۔ ۔ گنگا نہاؤں۔ نہ جانے کیا کیا کروں"!

جب امبو بالکل نزدیک آگئی تو کلکارنی اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی بولی۔

"آؤ بہن! ۔ ۔ ۔ ۔ میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو"!

ایک عفت مآب بیوہ کو کسی کی سوت کہنا اور میٹھا میٹھا بولنا!

ـــــ یہی تو دنیا ہے۔ کلکارنی اور اُس کی بہنوں کی دنیا۔

امبو نے اُن دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑتے ہی اس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا "بھیا کہاں ہیں"؟

دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

"پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسل گیا۔ کلکارنی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے بھی پچھلی سنکرانت یاد آگئی۔ ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجہ نکال لیا تھا۔ مگر وہ اس سنکرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔ صرف اُسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے "کسی بہن بھائی کو دکھی دیکھ کر مجھ سے مدن اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں نہ گائے جائیں گے"!

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر اوٹی بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسری کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکارنی کی بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔ رام رام ۔ ۔ ۔ کارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا۔ بولی۔

"دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے . . . ."

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اُس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر سب کی نظریں اُسی کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا۔ مگر وہ رو بھی تو نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا! کارنی جان ہی تو نکال لے گی! مگر رونا برس کے برس روز، اور عام دن میں کوئی بھی تمیز نہیں کرتا۔ وہ آپی آپ آجاتا ہے بلکہ یتیم اور بیوہ کو رونا برس کے برس دن ہی آتا ہے۔ اسی دن مرے ہوئے بالکل نزدیک آجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اُٹھتے ہیں۔ ساتھ ہی بیٹھتے ہیں۔ ہنسو تو ہنستے ہیں۔ روؤ تو روتے ہیں اور گلے بل بل کر روتے ہیں۔ کوئی انہیں دیکھتا ہے کوئی نہیں دیکھتا!

پڑوس کی بنجارن امبو کے پاس سے گذری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنانے لگی ——"پتی برتا کا ایک ہے و بھارن کے دو ئے!"

—— اور پھر سگانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی . . . "میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا بولو!"

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سما جائے۔ اس گومگو کی حالت میں کلکارنی نے اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دُنیا سے چھٹی ہوئی تھی اور مادھو کے آخری الفاظ کا اُسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے "نہ جانے امبو کہاں چلی گئی۔"

سماج کے ماتھے پر سے اس کلنک کو کلکارنی نے ہی تو دھویا تھا۔ لوگ اُس سے خوش تھے۔ اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے "بھئی کلکارنی نے اپنے نام کی لاج رکھ لی"۔ تو سوکھا سا منہ بنا کر بھائی گریب داس ایک ٹھنڈی سانس لیتا اور کہتا۔

"——آہ! مگر غریب مادھو کے من کی من ہی میں رہی!"

راجندر سنگھ بیدی

رباعیات

(۱)

ہر موجِ صبا ہے عیشِ فانی ساقی!
ہے سینہ بہ سینہ یا جوانی ساقی!
ازبس ہے، لا بادۂ گلرنگ صراحی سے انڈیل
ہے وقتِ حیاتِ جاودانی ساقی!

(۲)

کیا خوب ہو مینا نہیں آخر ہو حیات
بیگانہ تر از خیالِ ابنائے ممات
اس زندگی کی روحِ حقیقی سے آشنا ہو کے
پائی ہو سکے مغاں جس نے وفات

سعید احمد اعجاز
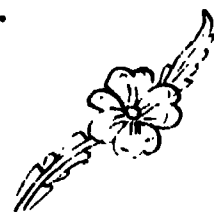
غزل

وقتِ آخر کفر کام آ ہی گیا لب پر اُس کافر کا نام آ ہی گیا

ساقیٔ کیف اہتمام آ ہی گیا جام بر کف مے بجام آ ہی گیا

رازِ پنہاں کھُل کے کہنا ہی پڑا موقع شرحِ تمام آ ہی گیا

کوئے جاناں کا پتا مل ہی گیا سر سے چلنے کا مقام آ ہی گیا

میں کہ کل تک طائرِ آزاد تھا آج اچانک زیرِ دام آ ہی گیا

جام بھی گردش میں آ ہی جائے گا ساقیٔ صہبا بہ جام آ ہی گیا

بے بقا دنیا میں بھی تیرے طفیل
کچھ نہ کچھ لطفِ دوام آ ہی گیا

حکیم آزاد انصاری

حرم کے باغیچے میں

غزل

تری یاد میں ہوا جب سے گم، ترے گم شدہ کا یہ حال ہے
کہ نہ دور ہے نہ قریب ہے، نہ فراق ہے نہ وصال ہے

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے، تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے

اس ادا سے کون یہ جلوہ گر سرِ بزمِ حسنِ خیال ہے
جو نفس ہے مستِ بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے

نہیں ضد ہے عرضِ وصال سے، مجھے شوقِ عرضِ وصال ہے
وہی اب بھی اُن کا جواب ہے، وہی اب بھی میرا سوال ہے

تری بزم خلوتِ لامکاں، ترا آستاں مہ و کہکشاں
مگر اے ستارۂ آرزو، مجھے آرزوئے وصال ہے

میں بتاؤں واعظِ خوشنوا، ہے جہان و خلد میں فرق کیا
یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حسنِ خیال ہے

وہ خوشی نہیں ہے وہ دل نہیں، مگر ان کا سایہ سا ہمنشیں
فقط ایک غمزدہ یاد ہے، فقط اک فسردہ خیال ہے!

یہی دادِ قصۂ غم ملی کہ نظر اٹھی نہ زباں ہلی
فقط اک تبسمِ شرمگیں مری بے کسی کا مآل ہے!

ہیں وطن میں رہ کے بھی بے وطن کہ نہیں ہے ایک بھی ہم سخن
ہے کوئی شریکِ غم و محن تو وہ اک نسیمِ شمال[1] ہے

کہیں کس سے اخترِ بے نوا ہمیں بزمِ دہر سے کیا ملا
وہی ایک ساغرِ زہرِ غم جو حریفِ نوش کمال ہے

اختر شیرانی

(دہندی باغ، ٹونک، ۲۳ دسمبر ۱۹۳۳ء)

[1] پنجاب

سنت تُکارام

(اس ڈرامے کے جملہ حقوق فلمی اور سٹیائی حقوق سمیت محفوظ ہیں)

افرادِ تمثیل

تُکارام	
اوالائی	اُس کی بیوی
اُن کے بچے	
رامیشور	ایک مغرور برہمن
اُس کے دو چیلے	
تین ہمسائے	
خداوند وٹھوبا	وِشنو
رکمنی	اُن کی بیوی
خُدام	سیواجی کے ملازمین
لوگوں کا ہجوم	

تُکارام کا گھر

منظر۔ تُکارام اپنے بچوں کے ساتھ مل کر بیٹھے ہوئے پر مناجات گا رہا ہے۔

مناجات

میرے ہری کا نام ہے اِک پیڑ کی طرح،
ڈالیں ہیں جس کی پھیلی ہوئی دور دُور تک،
میرے ہری کا نام ہے اِک پیڑ کی طرح،
پھیلی ہے جس کی چھایا عدم سے نمو تک۔

دیکھو تو کس طرح سے ہیں شاخیں جُھکی ہوئی
پختہ پھلوں کے بوجھ سے پھولوں کے بار سے
اور میرا دل کہ ایک پرندہ تھا مضطرب،
بیٹھا ہے یک شاخ پہ صبر و قرار سے۔

وہ شاخ جو ہے نام خدا سے ہری بھری
اُس پہ ہے میرے دل کا ہمیشہ سے آشیاں
وہ دل جو نورِ حق سے چمکتا ہے رات دن
چمکیگا اور رہے گا قیامت تلک جواں۔

(تُکارام کی بیوی ایک بھلی عورت جو سالہا سال تک افکار و مصائب کا شکار رہنے کے باعث خستہ حال ہو رہی ہے۔ داخل ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن ہے)

اَوالائی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ مرتبان تمہارے سر پہ پھوڑ دوں۔ یہ نگوڑا سر ہے یا مٹی کی اُلٹی ہنڈیا جس میں سے تمہارے ہری کا نام میلے پانی کی طرح رس رس کر ٹپکتا رہتا ہے۔ اور یہ زبان ہے کہ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بس جس دن یہ ہری جاپ بند ہوئی اُسی دن

سے سُورج کا نکلنا بھی بند ہو جائے گا۔

تُکا رام۔ پھر تو سارا جگت اندھیرے میں ہاہا کار کرا اُٹھے گا۔

اوالائی۔ میرے تو کان پک گئے ہیں تمہارے بھجن سُن سُن کر۔ دن چڑھے سے ایک رُوں رُوں جو شروع ہوتی ہے تو شام تک تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

پہلا بچہ۔ ماں! کیا ہوائیں اور بادل اور ستارے بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کے گیت نہیں گاتے۔

دوسرا بچہ۔ ہاں تو کیا اُن کے گیتوں سے تمہارے کان پک جاتے ہیں۔

اوالائی۔ (دونوں کو چپتیں رسید کرتے ہوئے) میں دن بھر تمہیں پیٹتے پیٹتے ہار جاتی ہوں۔ لیکن تمہاری ڈھٹائی میں فرق نہیں آتا۔

پہلا بچہ۔ کیونکہ ہم بھی ستاروں۔ بادلوں اور ہوا کی طرح ہیں۔

دوسرا بچہ۔ اور ام چیزوں کی طرح کبھی نہیں بدلتے۔

تُکا رام۔ (شاعرانہ انداز میں) ہم اُس نہ بدلنے والی ہستی کے پریمی ہیں۔ اور ہمارے جسم جواہرات کے مرتبان ہیں جو اُس کے پریم کے سپنوں کے مدھ سے بھرپور ہو رہے ہیں۔

اوالائی۔ اگر میں تمہاری بیوی اور ان ٹرٹر کرنے والے شیطانوں کی ماں نہ ہوتی تو ایک موٹی سی ایندھن کی لکڑی لے کر تمہاری پیٹھوں کی ایسی تواضع کرتی کہ تمہارے ہیرے جواہرات کے مرتبان مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکرے بن جاتے۔

تُکا رام۔ تمہاری مُردہ لکڑی اگر ہماری پیٹھوں سے چھو جاتی تو اس میں پھول پتے نکل آتے۔

اوالائی۔ لکڑی تمہیں چھو جانے سے ضرور پھول پتے لے آتی جب کہ تم خود لکڑی سے زیادہ مُردہ ہو۔ ساری نگری تمہیں نام دھرتی ہے اور تم پر پھٹکار بھیجتی ہے مگر ایک تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

پہلا بچہ۔ میرے پتا آکاش کی طرح چُپ چاپ ہیں۔

دوسرا بچہ۔ اس لئے وہ ایک مہاتما ہیں۔

اوالائی۔ مہاتما کیا ہیں خاصے پگلے ہیں۔ پگلے ہی سارا سارا دن کالے کالے منکوں کی مالا جپتے اور ایک ہی نام کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔ مُورکھ اپنے گلوں میں موٹے موٹے پیلی لکڑی کے منکے پہن ماتھوں پر پیلی مٹی سے رنگ رات رات بھر ناچا کرتے اور سونے والوں کی نیند اپنی جھانجھوں اور کرتالوں کے شور سے حرام کر دیتے ہیں۔

تُکا رام۔ (گاتے ہوئے)

بائیں ہاتھ میں جھانجیں لے کر۔ دائیں میں ہر جوت
انگ ہمارے آپی ناچیں۔ ناچیں دن اور رین!
ساجن ناچیں دن اور رین

اوالائی۔ (نقل اُتارتے ہوئے)

بائیں ہاتھ میں کھڑکھڑ لے کر دائیں میں کچکول!
انگ تمہارے لاج اُتارے ناچیں دن اور رین
پگلے۔ ناچیں دن اور رین

اور یہ بھگتی ہے کیا! کام کاج کرنے اور روٹی کمانے کو جی نہ چاہا تو بن گئے سنت مہاتما۔ نرک میں جائیں یہ سارے سنت۔

تُکا رام۔ پھر تو نرک بھی نرک نہیں رہے گا۔

اوالائی۔ یہ دُنیا ہی ان سنتوں کے کارن نرک بن گئی ہے۔ جو آتما آتما کی پکار لگا کر پڑوسیوں کی روٹی پر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

تُکا رام۔ (گاتے ہوئے)

جب پاپ دُھلے من مندر سے اور سُندر اِس کا رُوپ ہوا
تب سنت اور پاپی ایک ہوئے بیری اور ساتھی ایک ہوئے
بس امرت بن کر تن کو لگی۔ دل پتھر کا تارے سے ملا!
جو گھ۔ بکتا تھا تھنی کر دہ پھول میں بن کر رنگ کھلا!

کہتا ہے تُکا بس ہرِ کی دیا من پریم لگن سے بھرتی ہے
جب ہر نے پکارا دونوں کو چیتا اور بکری ایک ہوئے

(تیسرا بچہ داخل ہوتا ہے)

بچہ۔ ماں ماں! مجھے بھوک لگی ہے۔

اوالائی۔ (اس کے کان کھینچتے ہوئے) جا! اپنا پیٹ اپنے باوا کے پوتر بھجنوں سے بھر۔ اور اُس کتاب جتنا موٹا ہو جا۔ جس میں وہ رات دن اپنے بھجن لکھتا ہے۔ سُنا تو نے، بھگت باوا کے بھگت پُوت!

(بچہ روتا ہوا باہر چلا جاتا ہے اور اس کے پیچھے دوسرے دونوں بچے بھی چل دیتے ہیں۔ اوالائی گھر کی طرف چند آدمی آتے دیکھتی ہے)

لو! وہ آ گئے۔ سنسار بھر کے بھکاری۔ جو آتما رام کا بہروپ بھرے پھرتے ہیں۔

تُکا رام۔ (گاتے ہوئے)

بھکت ہری کے تم ہیں اور بھگوان کے اوتار
دیکھ ان میں بھگوان کو - بس تیری نیا پار
کہے تکا یہ سوچ - سو جنموں میں سو بار

اوالائی۔ یہ تو تکا کا اپنا پر تکا کی استری جسے اپنی بات سنانے کا ویسا ہی حق ہے کچھ اور کہتی ہے

(گنگناتی ہوئی آہستہ سے گاتی ہے)

جگت میں کیسے شہر گئے ہیں سب بیکلے سار
من میرا پرسن ہو جیسے جو ان کو مار
اوالائی کا یہ کہنا سن لے سب سنسار

تم کیا جانو کہ جب میں چکی پیسنے بیٹھتی ہوں تو اس طرح کے کتنے گیت میرے سر میں چکر کاٹنے لگتے ہیں۔ اگر تم انہیں سن لو تو اپنے سارے بھجن وجن بھول جاؤ اور پھر سوتے میں بھی میرے ہی گیت گایا کرو۔ اور یہ "تکا کہے تکا کہے" تمہارے من کے پتھر سے اس طرح پھسل جائے جیسے کنول کے پتوں سے پانی کی دو بوندیں۔

(رامیشور ایک مغرور برہمن، اپنے دو چیلوں سمیت داخل ہوتا ہے)

تکارام (ان کو جھک کر پرنام کرتے ہوئے) آئیے آئیے مہاراج! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔

اوالائی۔ بس پتھر اور اپلے کافی ہیں۔ ایک اجاڑ گھر کے رہنے والے اپنے مہمانوں کی اور کس چیز سے سیوا کر سکتے ہیں۔

تکارام۔ بیٹھئے مہاراج! ایک بھکاری کے گھر کا نصیبا آپ کے چرنوں کی دھول سے جاگ اٹھا۔

رامیشور۔ دور ہو جا میرے سامنے سے دشٹ بہروپئے۔ بڑا بھگت بنا پھرتا ہے۔ چور۔ نشے باز۔ الو کا پٹھا کہیں کا۔

اوالائی۔ ذرا ہوش میں آئیے سرکار۔ یہ آپ اپنے آپ یا اپنے باپ یا اپنے دادا سے تو بات نہیں کر رہے۔ آپکا سبھاؤ ہے یا لال لال آنکھوں والا مکار چیتا جو نیچے سکیڑ کر اپنے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔ اور جیبھ ہے یا بے لگام گھوڑی جو زرک کو بھاگتی ہوئی کچے راستوں پر اپنے کھروں کے نشان چھوڑتی جاتی ہے۔

تکارام (نہایت نرمی سے) ناری! ایک بڑے مہاتما کا اپمان مت کرو۔

اوالائی۔ کیا کہا مہاتما! بھگوان اپنے آپ کو اور ہمیں ایسے مہاتما سے بچائے جو لال لال آنکھیں نکالے۔ تم پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہا ہے۔ تم پر جسے بھگوان اس پریم سے چاہتے ہیں جو پربھات کا مدہم اجیالا بن کر آکاش میں اڑنے والے پکھیوؤں کے جھنڈ کو اپنے سونے کے سے رنگ سے رنگ دیتا ہے اور جو شام کے جھٹ پٹے میں تاروں کی سہاگ سبھا میں چمکتا ہے۔

تکارام (رامیشور کو نہایت لجاجت سے مخاطب کرتے ہوئے) کیا میں نے کبھی آپ کو اپنی کسی بات یا کام سے دکھ دیا ہے۔

رامیشور۔ تمہارے جیسے میں کوئی ایسی بات ہے جسے دیکھ کر مجھے غصہ آجاتا ہے

اوالائی۔ نیکنامی کا تاج۔ مہاکوی کے مان کا چمکتا ہوا مکٹ اپنی چمک سے تمہاری آنکھوں کو کالا اندھا کئے دیتا ہے۔ تم میرے کوی کے گیتوں سے جلتے ہو۔

رامیشور (جھوٹی ہنسی ہنستے ہوئے) میں جلتا ہوں؟ کس سے؟ اس سے ہو رہا کے اس کوڑے سے کسی طرح بہتر نہیں جسے ہم اپنے پاؤں تلے روندنا بھی نہیں چاہتے۔ (یہاں وہ تکارام کو از راہ حقارت اپنے پاؤں سے چھونے کی کوشش کرتا ہے)

اوالائی۔ میرے بچوں کے باپ۔ اٹھو اور اس موئے کو للکارو۔ میرا من یہ دیکھ کر کرودھ سے بھرپور ہو رہا ہے کہ تم ایک شانت دیوتا کی طرح دیا کے آسمانی کنارے پر چپ چاپ بیٹھے ہو۔

تکارام۔ بچوں کی ماں۔ کیا تو اس لئے خفا ہو رہی ہے کہ میرے دل میں غصے کا نام نہیں رہا، دیکھ تو ہی میں نے پھولوں کی اس سیج سے جس پر میرا بھگوان دن رات آرام کرتا ہے، پاپ اور دکھ کے کانٹے دور کر دیئے ہیں۔

اوالائی۔ اس نے تمہیں اپنے پاؤں سے چھونا چاہا۔

تکارام۔ ایک مہاتما کا پاؤں چھو جانے سے جنم مرن اور کال کرم کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ (رامیشور سے) مہاراج مجھے معاف کر دیجئے۔

اوالائی۔ تم اس لال بھبھکے سے کشما مانگتے ہو؟ اسے تو تمہارے چرنوں میں گر کر تم سے معافی مانگنی چاہیئے۔

رامیشور۔ تجھے معاف کروں؟ نیچ جاتی کے ملیچھ! تجھے یاد نہیں کہ تیری ماں ذات کی ویش تھی۔

اوالائی۔ اُسے یاد نہیں کہ تیرا باپ برہمن تھا۔ کیونکہ تیرے لچھن نیچ سے نیچ لوگوں سے بھی بُرے ہیں جن کے کارن تیرا اونچا جنم چھپ گیا ہے۔ مُورکھ! تیری ڈھٹائی اب پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کہ میرا پتی تیرے پاؤں پڑ رہا ہے۔ اگر تجھے پریم کی سنہری ریتوں کا ذرا سا بھی گیان ہوتا تو تیری آتما لاج کے مارے پانی پانی ہو جاتی۔

رامیشور۔ ایک دو کوڑی کے بنئے کے ذلیل بیٹے۔ تیرے ہاتھ جو لال اور ہری مرچیں اور مٹی کے پیلے پیلے دانے تولنے کے کام کے تھے اب بے تکے گیت اور بھجن لکھنے جوگ ہو گئے۔ ایسے گیت جن میں رس نام کو نہیں ہوتا اور جو ان گاؤں کی آواز سے ملتے جلتے ہیں جو کسی گائے کے مرنے پر اکٹھی ہو کر ڈکراتی ہیں۔ تو نہیں جانتا۔ کہ برہمن ہی کے ہونٹوں سے پرمیشور اور بھگتی اور پریم کے گیت نکل سکتے ہیں اور برہمن ہی کے ہاتھ آتما اور پرماتما کے بھجن لکھ سکتے ہیں تو اپنی حد سے گزر گیا۔ اور ایسی بے تکی ہانکنے لگا جسے ایک طوطا بھی دُہرانا پسند نہ کرے۔

اوالائی۔ اس نے گیت پر گیت لکھے اور اپنے مرنے سے پہلے لاکھوں اور لکھ ڈالے گا۔ مگر تجھے اس سے کیا؟ تجھے یا تیرے باپ دادا کو اس سے کیا دُکھ پہنچتا ہے۔ تیری جاتی کے بلوانوں نے گیت اور بھجن لکھنے کا ٹھیکہ کب سے لے رکھا ہے۔ اور تجھے یہ وِدیا کس لمبے کانوں والے برہمن دیوتا نے سکھائی ہے۔ کہیں اُ[illegible] نے تو نہیں جس سے تو نے اپنی ٹانگوں کی وہ مستانی چال سیکھی تھی جو تُو نے ابھی ابھی ہمیں دکھائی ہے۔

تکارام۔ تمہاری زبان پر کانٹے کیوں اُگ رہے ہیں؟

اوالائی۔ (رامیشور کو اپنی بھینچی ہوئی مٹھیاں دکھاتے ہوئے) تمہاری گیدڑ بھبکیاں میرے پتی کے کانوں میں اس طرح پڑتی ہیں۔ جس طرح کسی شُودر کے آنگن میں کسی مُرغی کے پَر۔ وہ لکھتا چلا جائے گا اور میں بھی لکھوں گی اور ہمارے بچے بھی اب جلد لکھنا شروع کر دیں گے۔

رامیشور۔ (طنز سے) ہاں ہاں یہی کھاتوں کے لکیر دار صفحوں پر جو چاہے لکھتے رہنا۔

اوالائی۔ ہمارے بھانڈے برتنوں میں تیری برہمنی آتما سے زیادہ بھجن بھرے پڑے ہیں۔ اور جتنی وِدیا تیرے جیو میں ہے۔ اس سے کہیں بڑھ کر ہمارے مٹی کے دیئے اور کاٹھ کی ڈوئی میں ہے۔

رامیشور۔ تمہیں یہ باتیں بہت مہنگی پڑیں گی۔ ایک برہمن کا سراپ وہ بجلی ہے کہ جب بادلوں بھرے آکاش سے کڑکتی ہوئی اُترتی ہے تو ساری دھرتی کانپ اُٹھتی ہے۔

اوالائی۔ مُورکھ منش۔ میرا پتی ہمالیہ کی چوٹی کی طرح اونچا اور شانت اور گیان میں مگن ہے۔ تیرا برہمنی سراپ کیا ہے۔ ایک کھوکھلی ڈینگ، جس کی بجلی جگنو کی ایک چمک اور جس کی کڑک پتنگے کے پر کی آواز سے بڑھ کر نہیں۔

تکارام۔ (گاتا ہے)

جیون تو اِک ساگر ہے اور من ہے اس کی نیّا
لوبھ کرودھ کی لہریں اُٹھیں۔ ہر کا نام کھویا
ساجن۔ ہر کا نام کھویا
کام کی آندھی۔ کپٹ کی اگنی۔ پل پل بہتی جائے
کہے تکا۔ جو نام رٹے اُس کا نیّا پار لگائے
ساجن نیّا پار لگائے

رامیشور۔ بیچارہ پانڈورنگ جس کے تم پجاری ہو۔ دیوتاؤں کے دربار کا ٹھٹھا سا مسخرہ ہے اور جب اُس کا کوئی پُھسپُھسا سا ٹھٹھا دھرتی تک پہنچتا ہے تو تمہارا روپ دھارن کر لیتا ہے اور پہلے سے بڑھ کر پھسپھسا ہو جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے ٹھٹھے اب پرانے ہو کر گل سڑ گئے ہیں۔ اور چونکہ یہ گلے سڑے گھاس پات کی طرح اس سُندر سنسار میں گندگی پھیلاتے ہیں۔ اس لئے گھاس کی طرح انہیں جڑ سے اُکھیڑ پھینکنا ضروری ہے۔ (اپنے چیلوں سے) گاؤں کے مُکھیا کو اس منحوس گھاس کا جو ہوئے ہوئے ہماری پھلواریوں کو کھائے جا رہی ہے، پتہ دے دینا۔ اور اس سے کہہ دینا کہ جتنا جلد ہو سکے اسے یہاں سے اُکھیڑ پھینکے۔ (تکارام سے مخاطب ہو کر تُندی سے) دیکھو جی! کل تک اس گاؤں کو چھوڑ دو اور ہمارے ساتھ والی پوتر نگری سے بھی پرے چلے جاؤ۔ وہ تمہاری بیہودہ کتاب کہاں ہے۔

تکارام۔ (کتاب لا کر رامیشور کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) یہ رہی۔

اوالائی۔ یہی وہ کتاب ہے جس نے تمہاری نیند حرام کر دی ہے۔

رامیشور۔ (کتاب اپنے چیلوں کے حوالے کرتے ہوئے) میں نے ندی کی لال پیلی

مچھلیوں کو جل پری سے اس کتاب کے بھجن سننے کی پرارتھنا کرتے سُنا ہے اب اُن کی آشا پوری ہوجائے گی۔ اور شام کے سمے اب سے میں ندی کی گہرائیاں اِن بھجنوں سے گونج اُٹھیں گی۔ اور تب ہاں کون جانتا ہے کہ تب جل پری پانی سے نکل کر تمہیں اپنی ٹھنڈی ہری بھری دنیا کا کوئی مان لے اور تمہارے سر پہ کوئی مکٹ رکھ دے۔ ارے شیو۔ اپنے چیلوں سے بہت چلا جاتا ہے۔

اوالائی۔ ہائے۔ ہائے اوہ تمہارے گیتوں کا ستیاناس ہو۔ دیکا۔

تکارام۔ گیت امر اور سندر پنچھی ہیں جو کال کے اندھیرے ساگر پر کبھی نہ تھکنے والے پروں سے اُڑتے رہتے ہیں۔ کوئی کو مارا جا سکتا ہے لیکن اُس کے گیتوں کا ناش نہیں کیا جا سکتا۔

اوالائی۔ دھن ہے تمہاری سہار۔ جو راستے کے اس پتھر کی سہار سے بھی بڑھ کر ہے جو راستہ چلنے والے کی ٹھوکر چپ چاپ کھا لیتا ہے اور ٹھوکر مارنے والے کو کچھ نہیں کہتا۔ مگر میری سہار تو کسی جھیل کے پانی کی طرح ہے جو ذرا سی ہوا چلنے پر بھی بے چین ہو جاتی ہے۔ تمہیں ایسی سہار کس نے سکھائی۔

تکارام۔ اُس نے جس نے سورج۔ چاند۔ ہواؤں۔ وں اور بادلوں کو وہ سہار سکھائی جس کے بل پر وہ اپنے اتنے بڑے بڑے کام پورے کرتے ہیں جسے اُس نے سہار سکھائی جو آپ سراسر سہار ہے جو اکیلا چپ چاپ کھڑا اس ٹوٹتے پھوٹتے سنسار کو دیکھتا ہے۔ اس سنسار کو جسے اُس نے بے انت پریم اور درد سے بنایا تھا۔ پھر وہ اُن اندھے انسانوں کو جو اُس کی دنیا کو بگاڑتے رہتے ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُن کو اپنے پریم کی دھار سے جو ہر دھار سے تیز ہے۔ چیر کے لگاتا ہے۔

اوالائی۔ تب تو مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اسے ہم سے بہت پریم ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں ہر گھڑی اپنے نہ مٹنے والے پریم کی کٹار سے چیرکے لگاتا رہتا ہے مگر میں تو یہ چاہتی ہوں کہ وہ ہم سے پریم نہ کرے کیونکہ پھر ہم چرکوں سے تو بچ جائیں گے۔

تکارام۔ ہری ہری!

اوالائی۔ وہ تمہاری پکار کی پہنچ سے بہت دُور ہے۔

تکارام۔ وہ ہمارے اتنا پاس ہے جتنے ہم آپ بھی نہیں ہیں۔

اوالائی۔ ہائے میں تمہارے اس ڈھنگ سے کتنی دُکھی ہوں۔ جس ڈھنگ سے تم ایشور سے ملاپ چاہتے ہو۔ تم اپنے بال بچوں کو جن کا پالنا تمہارا دھرم ہے بالکل بھول جاتے ہو۔ مہینوں تمہارے بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ اُن کے لئے تمہارے من میں پریم کے پٹ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ اور تم ایسے رنگا رنگ کے سپنوں میں مگن رہتے ہو جو ہمیں روٹی کبھی نہیں دلا سکتے

تکارام۔ جو بن کی چڑیا۔ تیتر اور سارس کو روزی دیتا ہے۔ وہ ہمیں بھی دے گا۔

اوالائی۔ اُس کی بات نہ کر، جو اپنے من کی موج میں ہم بندوں سے الگ تھلگ بیٹھا اس جگت کے دکھوں کا کبھی حساب نہیں کرتا مگر ہم جھوٹی آشائیں نے اُس کی دیا کے کواڑ اپنے کمزور ہاتھوں سے کھٹکھٹاتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی سُنائی نہیں کرتا اور ہماری ہتھیلیاں چُور چُور ہو جاتی ہیں۔ میری کمر اس بے انت دھتکار کے بوجھ سے ٹوٹ چکی ہے۔ میں مرجانا چاہتی ہُوں۔

تکارام۔ مرنا ہی تو سچ مچ جینا ہے۔ جب من کی چیخ پکار ختم ہو جائے گی تو آتما کا سُندر اور سادہ گیت سُنائی دینے لگے گا۔ ہمارے جھوٹے مان ہم سے الگ ہو جائیں گے۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ اُجلوں کا اُجالا آجائے گا۔ جو سب چیزوں میں چمکتا ہے۔ پھر جب ہم آپ ہی سب چیزیں بن جائیں گے تو ہمیں کس کی تلاش رہے گی؟ آؤ ہم اُس جوت کی طرف بڑھیں جو دور سے ہمیں بلا رہی ہے۔

اوالائی۔ میرے مالک۔ اپنا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟

تکارام۔ گھر کیا ہے؟ چھپنے کی ایک سُنسان جگہ!

اوالائی۔ نہیں نہیں ہمیں پھر اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تم پہلے بھی ہمیں کئی بار چھوڑ کر پہاڑی کی چوٹی پہ جا بیٹھے ہو جہاں تم نے مہینوں ایکانت اور دھیان میں کاٹ دیئے۔ اور میں ہر روز تمہارے لئے کھانا پانی لے کر پتھریلے پہاڑی راستوں پر چلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں میرے پاؤں میں ایک نوکیلا کانٹا چُبھا اور میں راستے ہی میں بے سُدھ ہو کر گر پڑی۔ تب تم نے مجھ پہ دیا کی اور میرے لئے اپنی کُٹیا کو چھوڑ کر اپنے گھر اور اپنے بال بچوں میں لوٹ آئے۔ میں اب تمہارے یا تمہارے

ایشور کے بارے میں کوئی بُری بات مُنہ سے نہیں نکالوں گی۔ اور نہ اُس کے پریم پر شک کروں گی نہ تمہارے پر۔ میں ایک اچھی استری کی طرح تمہارے بھجن یاد کر لُوں گی اور پھر ہم دونوں تاروں بھرے آکاش کے نیچے اُنہیں گائیں گے۔ اور میں اپنا سینہ ایشور کے پریم کی سفید چمکدار کٹار کا گھاؤ کھانے کے لئے کھول دُوں گی۔

تکارام۔ میری آتما میں ہری کی جوت کا اُجالا بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اور اس کی چُپ چاپ بن سے ایک اکیلی آواز نکلتی ہے جو ہماری آتما کی چُپ چاپ ہے۔

دُوسرا منظر

(تاروں بھری رات۔ تُکارام کے گھر کا صحن۔ تُکارام اور اوالائی تُلسی کے پودے کے پاس جو ایک چوکور چبوترے پر اُگ رہا ہے۔ بیٹھے ہیں)

تکارام۔ (گاتا ہے)

یہ آتما ہے کہ اِک جاتری ہے اے پیارے
ترے شریر میں جو جاترا کو آیا ہے!
جو چاہے تُو کہ ملے کامنا سے چھٹکارا
(وہ کامنا جو کہ جیون کی تیرے مایا ہے)
تو ہر کے نام سے بو بیج اپنے کرموں کا
کہ جس نے بیج یہ بویا پھل اُس نے کھایا ہے
ہری کے نام بِنا ہے یہ جیون اِک اگنی
جو اُس کے پاس گیا پھر نہیں وہ آیا ہے

ہری کا دینا ہے جو ہم کو اُس کے بوجھ تلے
دبا ہی رہنا یہ کس نے ہمیں بتایا ہے؛
تو آ وہ کھول دیں ہٹ اپنے دوار کے اُس پٹ
وہ اپنا لینا جو ہے اُس کو لینے آیا ہے،
ہمارے پاس ہی کیا ہے جو اُسکی بھینٹ کریں
جو اُس نے ہم کو دیا ہے اُسی کی مایا ہے؛
یہ دے دلا کے اُسی کو نچنت ہو جائیں

کہ جس کے پریم کی سر پہ ہمارے چھایا ہے

اوالائی۔ تمہارا گیت تو بہت میٹھا ہے پر ہم کو تو کسی کا کچھ دینا نہیں ہے۔

تکارام۔ ہمیں کسی آدمی کا تو کچھ دینا نہیں۔ مگر اُس پرماتما کا تو دینا ہے جس نے ہمیں آنکھیں دیں جو بن کے اُجالے سے روشن ہوتی ہیں۔ کان دیئے جو آکاش کے پنچھیوں کے میٹھے میٹھے راگ سنتے ہیں۔ ہونٹ دیئے جن سے پریم کے گیت نکلتے ہیں۔ جھم جھم کرتی ہُوئی آتما دی جس نے سنسار کی سُندرتا کو چار چاند لگا دیئے۔ کیا اُس نے ہمیں اپنی سب چیزوں سے انوکھا نہیں بنایا۔ کیا اُس نے ہمارے لئے گھاس کی ہریالی اور پربھات کے من موہنے رنگوں کی میلا نہیں بنائی۔ پھر ہم اتنا دھن کہاں سے لائیں گے جس سے گھاس کی ایک سبز پتّی اور نیلی روشنی کی ایک کرن کا مول بھی اُسے دے سکیں؟

اوالائی۔ ہمیں اُس کا اُدھار اُتارنے کی ایسی کیا پڑی ہے کیا ہم اپنے آپ کو سنسار کے کسی اندھیرے کونے میں نہیں چھپا سکتے؛

تکارام۔ ہم اُس سے چھپ کے کہاں جائیں گے جو آپ اس جگت کے ذرّے ذرّے میں پہلے ہی سے چھپا بیٹھا ہے۔ سُندری! اس دھرتی اور آکاش کے درمیان جو چیز ہے اُس کی پیامی ہے۔ ڈال ڈال پھاند والی گلہری، پربت کی گود میں چُپ چاپ لیٹی ہُوئی جھیل۔ جھیل کے کنارے کا سارس۔ پہاڑی کے دامن کی نیلاہٹ۔ پیڑوں کے جھُنڈ اور اُن پر اُڑنے والے پنچھی اور وہ اُجلے اُجلے بادل جنہوں نے چُپ رہنے کا پرن لے رکھا ہے۔ یہ دھرتی اور آکاش کے بسنے والے سبھی اُس کے پیامی ہیں۔ جو ہمارا ہر جگہ کھوج لگائیں گے۔ اور اگر کبھی تھکن سے ان کی آنکھ لگ جائے اور یہ راستے سے چُوک جائیں تو خود تمہاری پرچھائیں جگت کے اندھیرے کونوں تک تمہارا پیچھا کرے گی اور ہری کے سنگھاسن کے سامنے تمہاری سب کتھا کہہ سنائے گی۔

اوالائی۔ آہ! ہم تو بن کے نربل مکوڑوں کی طرح ہیں۔

تکارام۔ ہاں! مگر اُسی گھڑی تک جب تک ہمیں اپنی چھوٹی شکتی پر گھمنڈ ہے مگر جب ہم اس گھمنڈ کو ہری کے ہاتھوں میں سونپ دیتے ہیں تو یہی مکوڑا آسمانی پر لگا کر اُڑنے لگتا ہے۔ اور اپنی چمک سے جگت میں اُجالا کر دیتا ہے۔

اوالائی۔ اچھا تو ہری نے جن ہاتھوں سے سُندر پھول بنائے تھے اُنہیں سے ہمارے جیون کے دُکھ اور روگ کیونکر بنائے۔

تکارام۔ پھول بھی اس دھرتی کے بے زبان دُکھ ہیں۔ اور ہم بھی اگر دھرتی جیسی سہار پیدا کر لیں۔ تو اپنے دُکھوں کو پھولوں جیسا سُندر بنا سکتے ہیں۔ اے میرے بچپن کی ماں! آ کہ ہم بھی اپنے من میں دھرتی جیسی سہار اور سُندرتا پیدا کریں۔ اور اُس آکاش جیسے ہو جائیں جو اپنے کبھی نہ سونے والے تاروں کی سُونی راتیں ہری کے چرنوں میں اَرپن کرتا ہے۔ سُندرتی کی یہ سارا سنسار ایک بہت بڑا بلیدان اور ایک بہت بڑی قربانی ہے۔ بیج اپنا آپ مٹا کر پھول پیدا کرتا ہے۔ اور پھول کے مٹنے سے ڈال میں پھل آتا ہے۔ دیا اپنا تیل دیتا ہے تو جوت جنم لیتی ہے اور جوت اپنے آپ کو جلاتی ہے تو اندھیرے کا پیٹ بھرتا ہے۔ ہماری آتما پرماتما کا ہی بلیدان ہے اور ہماری قربانی خود پرماتما کا رُوپ دھارن کرتی ہے۔

اوالائی۔ بے بھکت۔ پیارے بھکت۔ تم تو پہلے ہی سے میرے من کے آنگن پر بلیدان کے سُر بجا رہے ہو۔

تکارام۔ ہم اپنا سب کچھ بھگتوں اور سنگتوں کو دے ڈالیں گے اور اپنے من کی آشاؤں کو خاموش کرا دیں گے۔ اور جب ہمارے پاس کچھ نہ رہا تو ہمیں کسی چیز کی کمی نہ رہے گی۔ کیونکہ پرماتما بھکشو کے ہاتھ پر دھن کی وہ لکیر ڈال دیتا ہے۔ جس کے سامنے بڑے سے بڑے راجہ کے ہاتھ کی لکیر ماند پڑ جاتی ہے۔ آؤ آؤ چلو اُس جوت کی طرف چلیں جو دُور سے ہمیں اپنے من موہنے اشاروں سے بُلا رہی ہے۔

(وہ بھجن گاتا ہے اور اوالائی سر جھکائے پُر سمن خاموشی سے سنتی ہے)

دھن اپنا ہر کے نام پہ گر ہم لُٹائیں گے
راجاؤں سے بھی بڑھ کے دھنی خود کو پائیں گے
اے آتما کہ سوئی ہوئی ہے تُو بے خبر
اپنا شریر دے کے تجھے ہم جگائیں گے
مندر کو من کے کرودھ سے کر دیں گے پاک ہم
آشا کی بھینٹ چرنوں پہ ہر کے چڑھائیں گے
کُوڑا نکال پھینکیں گے لوبھ اور کام کا
اور آتما کی آگ میں اُس کو جلائیں گے
پریم اور دیا کی مٹی کو گوندھیں گے پریت سے
سُندر سی ایک مُورتی اُس کی بنائیں گے
کہتا ہے یہ تکا کہ جلا کر ہری کی جوت
مندر میں اپنے من کے اُسے لا بٹھائیں گے

منظر (وہی تکا رام کا صحن۔ اوالائی کی ہمسائیاں اس سے باتیں کر رہی ہیں۔)

پہلی ہمسائی۔ تمہارا پتی تو ایک بھگت ہے۔

دوسری۔ تم نے اپنے پچھلے جنموں میں اس کے لئے بڑی پُوجا اور پرارتھنا کی ہوگی۔ تبھی اس جنم میں ایسا پتی ملا۔

تیسری۔ دھن بھاگ ہیں تیرے بہن۔ گاؤں میں ہر جگہ اس کے کیرتنوں کی پوتھی کی چرچا ہے جو کل شام ندی کی تہ سے اُبھر آئی۔

پہلی۔ اور رامیشور کی بھگتی کی تو اچھی طرح قلعی کُھل گئی ہے۔

دوسری۔ اُس کے چیلے بھی تو اُسے چھوڑ کے چل دیئے ہیں اور اب تو اُسے گالیاں دے رہے ہیں۔

تیسری۔ اب تکارام کا نام ساگر کی چڑھتی ہوئی لہر کی طرح سب لوگوں کے من پہ چھا رہا ہے۔

اوالائی۔ اچھی ہمسائی! اُن کا نام لے کر مجھے بپتا اور دُکھ کے تھکا دینے والے دن اور بے چین راتیں یاد نہ دلاؤ۔

پہلی ہمسائی۔ تم اُس کا نام اس طرح کیوں لیتی ہو۔ جب کہ اُس کے گیتوں کا چرچا سارے جگت میں پھیل رہا ہے۔

اوالائی۔ اگر تم کسی لوبھی کی پتنی ہوتیں تو مجھ سے یہ نہ کہتیں۔ تم نہیں جانتیں کہ کسی کوی کی پتنی ہونا کتنا بڑا دُکھ ہے۔

دوسری ہمسائی۔ کوی کی پتنی تو ایک رانی ہوتی ہے۔ جس کے دن رات آنند کی سُندر جوت سے چمکتے رہتے ہیں۔

اوالائی۔ کوی کی پتنی ایک بھکارن ہوتی ہے۔ جس کے دن رات نہ ہوت اور غریبی کی جھلسا دینے والی گھڑیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔

تیسری ہمسائی۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔

اوالائی۔ آہ اُس نے اس گھر کو ایک اندھیری بھوت نگری بنا رکھا ہے۔ جس کے کواڑوں کو موت کی آندھیاں پیٹتی رہتی ہیں۔ اور جہاں ہماری گھڑیاں ہمیں بھوکے گیدڑوں کی طرح تاکتے ہوئے گذرتی ہیں۔ ہمسائی! تم کیا جانو کہ ایسے پتی کی پتنی ہونا کتنا بڑا دُکھ ہے جو اُس سمے آتما کے گیت گائے جب اُس کے چاروں طرف بھوکے پیٹ روٹی کے سُوکھے ٹکڑوں کے لئے ترس رہے ہوں۔ کوی کا گھر پربت کی چوٹی کی طرح ہے۔ جو دُور سے سُندر دکھائی دیتی ہے

موجِ رقصاں

مگر اُس کے پاس جاؤ تو پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جیون کتنا کٹھن ہے

پہلی ہمسائی۔ ہم تمہارے ہمسائے ہیں اور ہم تمہارا، تمہارے بچوں اور تمہارے گھر کا سب حال جانتے ہیں۔

دوسری۔ اور اچھی ہمسائی! ہم سے تمہارا تاروں بھری رات میں اپنے آنگن میں تلسی کے پودے کے پاس اپنے بچوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا اور گیتوں کا آنند لینا بھی چھپا ہوا نہیں۔

تیسری۔ تمہاری ہمسائیاں بڑے لمبے کان رکھتی ہیں۔ ہم نے کوی جی کو ساری ساری رات اُس آکاش کے تلے تمہیں آنند اور سکھ کے گیت سُناتے دیکھا ہے جس کے تارے اسی طرح چمکتے ہیں جیسے اُن کے میٹھے میٹھے بول۔

اوالائی۔ اُس نے سب جھوٹ کہا۔ تاروں بھرے آکاش تلے مجھ سے جھوٹ بولا۔ اُس نے کہا کہ جب ہم اپنا سب کچھ بھگوان کے لئے دے ڈالیں گے تو وہ ہمیں سب کچھ دے دیگا۔ اور میں نے اس کی بات مان لی۔ اور سویرے سویرے اُٹھ کر میں نے راہ چلتوں کو بلایا اور اُنہیں اپنے گھر کی سب چیزیں، برتن بھانڈے کھاٹ بچھونے، کپڑے لتے، گائے بچھڑے سب کچھ دے ڈالا۔ پھر جب وہ سب کچھ لے جا چکے تو میں نے اپنی سُونی رسوئی کے ایک کونے میں بیٹھ کر پرمیشور کو تین بار بلایا۔ مگر وہ تو یہی جانتا ہے کہ جب کبھی ہم اپنے بڑے بڑے دُکھوں میں اُسے بلائیں تو آکاش کو اپنی لوہے جیسی سخت اور چمکتی ہوئی ہنسی سے بھر دے۔

(تکارام کو آتے دیکھتی ہے) لو وہ آگیا۔ ہری کا پگلا داس۔

پہلی ہمسائی۔ پتنی کو اپنے پتی کی پرچھائیں ہونا چاہیئے۔

دوسری۔ ٹھیک ٹھیک تمہیں اپنے کوی کا سایہ بننا چاہیئے۔

تیسری۔ اور کوی کا سایہ کیسا سُندر ہوتا ہے۔

(چل دیتی ہیں)

(تکارام ایک بھجن گاتے ہوئے داخل ہوتا ہے)

سادھو تو اِک گنّا ہے تم جتنا اسے دباؤ
اُتنے رس کے میٹھے میٹھے گھونٹ تم اِس سے پاؤ
جتنا کاٹو گے تم اِس کو بڑھے گا اِس کا مول
ساجن، بڑھے گا اس کا مول
چھیل چھلا کے بنے گنڈیری۔ کنجڑا بیچے تول
ساجن کنجڑا بیچے تول!
پیل کے رس جب آگ پہ رکھے موہن کھانڈ بنائے
پیارے موہن کھانڈ بنائے
جتنا کوئی اس کو پیلے اُتنا لابھ اُٹھائے
ساجن، اُتنا لابھ اُٹھائے
سادھو تو اِک گنّا ہے مول اِس کا بڑھتا جائے
میٹھا اُتنا جگ کو دیوے جتنا دُکھ یہ پائے
ساجن، جتنا دُکھ یہ پائے

بھئی! تمہاری آنکھیں کیوں اتنی لال ہو رہی ہیں؟ کیا ہری کا نام لے لے کر سُندر نیر بہاتی رہی ہو؟

اوالائی۔ یہ اُس آندھی کا لال رنگ ہے جو ہری کا نام سننے سے میری آنکھوں میں چڑھ جاتی ہے

تکارام۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ ہری سے ناراض ہو۔ ہری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

اوالائی۔ ہری نے میرا کیا بگاڑا ہے! کیا تمہارے آنکھیں نہیں ہیں؟ تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ اُس نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ آج دن چڑھے وہ راہ چلتوں کا روپ دھارن کرکے ہمارے گھر میں آیا اور جو کچھ اِس سُونے دوارے میں تھا لے گیا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جس گھڑی ہم اپنا سب کچھ ہری کو دے ڈالیں گے وہ ہمیں سب کچھ دیدیگا۔ میں نے تمہاری بات مان لی۔ مگر میں اب جان گئی کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ سچ کہتی ہوں میں تمہاری جھوٹی باتوں سے تنگ آگئی ہوں

تکارام۔ ہماری غریبی ہی تو پربھو کا دھن ہے۔

اوالائی۔ وہ ہمیں لوٹ لوٹ کر آپ مہاراجوں کا مہاراجہ بنتا ہے۔ اُس کے ہاتھوں نے میری منکوں کی مالا چھین لی۔ اور اب میرے ننگے گلے کو لاج لگانے کے لئے وہ تاروں کی مالا پہنے بیٹھا ہے۔ ہم روٹی کپڑے کو ترستے ہوئے ایک ہٹیلے آکاش کے تلے کھڑے ہیں۔ جو اُس آنکھ کے ڈھیلے کی طرح ہمیں ٹکر ٹکر دیکھے جاتا ہے جس پر سے پپوٹا اُتار لیا گیا ہو۔

تکارام۔ (گاتا ہے)

ہری کا نام ہی پیارا ہی ہمارا ایک ہیرا ہے
یہی موتی کی مالا ہے یہی من کا کلیرا ہے!
ہے جتنا دھن زمینوں میں سمندر کے خزینوں میں

نہیں مول ایسے ہیرے کا یہ ایسا ایک ہیرا ہے
نہ چوری کا اسے کھٹکا نہ رہزن کا اسے دھڑکا
مبارک جگ کو دھن اُس کا بس اپنا ایک ہیرا ہے
جو سُورج لاکھوں جائیں اور اس کے سامنے آئیں
چمک ایسی کہاں پائیں یہ ایسا ایک ہیرا ہے
تکا کے ہاتھ میں پیاری بسنت کے چاندنی ہاری
جگت کے مال پر بھاری - ہمارا ایک ہیرا ہے

سُندری! یہ ہیرا ہمارے ہاتھ میں چمکتا ہے اور اس کے نام کا گیت ہماری زبان پر ہے۔

اوالائی - جھینگر کے گلے سے جو راگ نکلتا ہے وہ اس گیت سے سُندر ہے جو جھینگر کے بنانے والے کے نام میں ہے۔ تمہارے ہری کے نام کا ہیرا بانا - میں ایک خرگوش کی گلابی آنکھ سے بڑھ کر مُول نہیں پاسکتا۔ میں تم سے اور اُس ہری سے تنگ آچکی ہوں جس نے ہمارے گھر کا ناش کر دیا۔ میں اب اُس سے اس کا بدلہ لوں گی۔ اُس کے مندر میں جاؤں گی۔ اور اپنے من کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے اُس کی مُورتی کے پاؤں توڑ دونگی۔ (وہ آنگن میں سے ایک بڑا سا پتھر اُٹھاتی ہے اور جانے لگتی ہے تکا رام اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہے)

تکارام - ناری! تم کہاں جا رہی ہو۔

اوالائی - (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے) مجھے جانے دو!

منظر (وشنو کے مندر کے سامنے۔ مندر کا دروازہ کُھلا ہے۔ اور مندر میں وشنو اور رُکمنی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں)

رُکمنی - تم ایک مچھیرے کی ناؤ کی طرح جو سمندری ہوا کے تھپیڑے کھا رہی ہو کیوں کانپ رہے ہو؟ تم کانپ رہے ہو۔۔۔ تم جو اتنے شکتی مان ہو کہ جب چاہو سنسار کا کوئی رُوپ دھارن کر لو۔ کیا تم نے مچھلی بن کر سنکھ کے راکشس پر جیت نہیں پائی تھی؟ اور کیا تم نے ایک بہت بڑے کچھوے کا رُوپ بھر کے مندر چال کے پربت کو اپنی پیٹھ پر نہیں اُٹھا لیا تھا؟ کیا تم وہ سماں بھول گئے جب تم نے ایک بڑے سانبھر کے بھیس میں اپنی سفید تھوتھنی پر اس دھرتی کو رکھ لیا تھا اور جب آدھے آدمی اور آدھے شیر کی شکل میں تم ایک راجہ کے محل کے تھم سے نکل پڑے تھے۔ تم جو اس مہا سنسار کے چودہ جگتوں سے یوں کھیلتے ہو، جیسے شطرنج کا کھلاڑی اپنے مہروں سے۔ وہ کیا کارن ہے جس سے تم ایک مچھیرے کی ناؤ کی طرح جس کا پتوار طوفانی سمندر میں ٹوٹ گیا ہو یوں تھر تھر کانپ رہے ہو۔

وشنو - تکارام کی استری مجھ سے ناراض ہے!

رکمنی - وہ تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟

وشنو - میرے پجاری مجھے اپنی انگلی کے گرد ایک انگوٹھی کی طرح گھما سکتے اور ایک نگاہ سے مجھے راکھ کا ڈھیر بنا سکتے ہیں - میرے پجاری مجھے ایک سوکھی ٹہنی کی طرح توڑ سکتے ہیں۔

رکمنی - مگر تکارام کی استری تمہاری پجارن نہیں۔ وہ تو تمہارا نام بھی ایسے اپمان سے لیتی ہے۔ اور اپنے پتی کو اسی لئے اچھا نہیں جانتی کہ وہ تمہارا بھگت ہے۔

وشنو - صرف وہی لوگ میرے پجاری نہیں جو مجھ سے پریم اور شردھا رکھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جنہیں مجھ سے بَیر اور دشمنی ہے۔ آخر یہ پریم اور بیر، شردھا اور دشمنی کیا ہیں - پردے ہیں جو ہر ایک من میں میری سُندرتا کو چھپائے رکھتے ہیں؛ لو وہ تکا کی استری تکا کے پربھو سے خفا ہو گئی۔

رکمنی - وہ تمہارا کیا کرے گی؟

وشنو - وہ ایک بھاری سا پتھر اُٹھائے چلی آ رہی ہے جس سے میرا پاؤں توڑے گی۔

رکمنی - تو تم ایک پکھیرو بن کر آکاش میں اُڑ سکتے ہو۔

وشنو - اس کے کرودھی نیر میرے پروں کو گیلا کر دیں گے اور میں نیچے گر پڑوں گا۔

رکمنی - مگر اب تم کانپ نہیں رہے۔ تم پھر سے شانت اور بلوان ہو گئے ہو۔

وشنو - میری شانتی کا کارن بل نہیں۔ ایک دُکھ دینے والی سوچ ہے

رُکمنی - وہ کیا سوچ ہے سوامی!

وشنو - یہ کہ اگر تکارام آ کر گرنے والے پتھر اور میرے پاؤں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا تو پتھر میرے پاؤں کے بدلے اُس کے دونوں پاؤں کچل دیگا اور میرا دل اُن کچلے ہوئے پیروں کو کیسے دیکھ سکے گا جو برسوں میرے نام کے رس سے مگن ہو کر ناچتے رہے ہیں؟

رکمنی - سوامی! آپ بھی کیسی بھولی باتیں کرتے ہیں - پتھر آپ کی دیا سے

ناری کے آنسوؤں کی دھارا بن کر اُس کے پتی کے چرنوں پر گریگا۔
اور اُن پیروں کو دھوئیگا جو تمہارے مندر کے سامنے ناچتے
رہتے ہیں۔ لو وہ آرہے ہیں۔ میں مندر کے پٹ بند کئے دیتی
ہُوں۔

(رُکمنی مندر کے پٹ بھیڑ دیتی ہے۔ اوالائی مندر کے آنگن میں پتھر
لئے داخل ہوتی ہے۔ تکارام ابھی تک اسے باز رکھنے کی کوشش
کررہا ہے)

تُکارام۔ اوالائی۔ پاگل مت بنو۔ جس دم تمہارے من میں بھگوان کو دُکھ
پہنچانے کی سوچ آئی تم نے تبھی اُسے دُکھ پہنچادیا۔ اس سے بڑھ
کر تم اور کیا دُکھ دے سکتی ہو؟

اوالائی۔ اُس نے تو ہمیں جنم بھر دُکھ دیئے۔ وہ اس جگت کا پُرانا ٹھور ہے
جو دن بھر کوڑے لگا لگا کر ہمارا خون پسینہ ایک کئے رکھتا
ہے۔ اور دن ڈھلے ہمیں اپنے دانی ہاتھوں سے مزدوری میں دُکھ
بانٹتا ہے۔ اور ہم چُپ چاپ یہ مزدوری لے کر جھکے ماندے
اپنے سنسان گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔

تُکارام۔ نہیں نہیں۔ تم جو کچھ اس سے مانگو گی وہ تمہیں دیگا۔

اوالائی۔ ہائے! تم مجھ سے سدا یہی کہتے رہتے ۔ دیکھو! دیکھو! وہ
اتیاچاری کس طرح مندر کے پٹ بند کئے چھپا بیٹھا ہے۔ اور جس
طرح ایک بچہ ڈر سے اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ اُس نے بھی
مندر کے پٹ بند کردیئے ہیں۔

تُکارام۔ تم جو کچھ اُس سے مانگو گی وہ تمہیں دے گا۔

رُکمنی کی آواز۔ (مندر کے اندر سے) ناری واپس چلی جا۔ جو کچھ تو چاہتی ہے
تجھے اپنے گھر میں ملیگا۔

تُکارام۔ ہائے ہائے افسوس! افسوس! تم نہیں جانتیں دیوی کے اس سندیسے
کا کیا مطلب ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ ناری تیری بھُو کی آنکھوں
نے سیپ کو چاہا اور وہ تجھے مل گیا۔ مگر جو موتی اُس میں چھپا
تھا اُسے تُو نے کھودیا۔

منظر (تکارام کا گھر۔ تکارام طنبورے پر ایک بھجن گا رہا ہے)

جو نام کائنات میں سب سے ہے سربلند
اپنے گلے کی تان میں ہم نے کیا ہے بند
کس چیز کی تلاش میں چھوڑیں ہم اپنا گھر
پرمیشور کھڑا ہے ہمارے دوار پر!
دیکھو تو وہ کھڑا ہے یہاں ہاتھ باندھ کر
بل جس کا چھا رہا ہے زمین آسمان پر
وہ بے نشاں کہ جس کا نہیں ہے کوئی نشاں
سُندر سے ایک رُوپ میں آیا ہے وہ یہاں
لاکھوں جگت نکھار دیئے جس کے نور نے
سپنے پجاریوں کو وہ آیا ہے پُوجنے
کہتا ہے یہ تکا کہ جو ٹھکرائیں کام کو!
اور کامنا کے پاس جو پھٹکیں نہ نام کو
کرودھ اور کپٹ کو من سے اگر وہ ہٹائینگے
اپنے میں ہر کے بل سے بڑا بل وہ پائیں گے

(ساوتری تکارام کا بڑا بیٹا اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لئے داخل ہوتا ہے)

بڑا بچہ۔ پتاجی! پتاجی! ماتا نے رسوئی کی جھاڑو بڑے زور سے میری پیٹھ پر
ماری۔ پر کیسے اچنبھے کی بات ہے کہ مجھے لگی ہی نہیں۔

چھوٹا بچہ۔ اور ماتا جی کی آنکھیں تو دیکھو رسوئی کی آگ کی طرح گرم اور لال لال
ہیں۔

بڑا۔ ماتا جی رسوئی کی چوکھٹ پر بیٹھی اُڑتے ہوئے بادل کو تکتے دکھا رہی
ہیں۔ جیسے وہ کوئی گلابی پیروں والا اُڑتا سانپ ہے جس کے پر
توڑ کر وہ اسے زمین پر گرادیں گی۔

چھوٹا۔ میں نے سُنا تھا کہ وہ پرمیشور کو جھوٹا کہہ رہی ہیں۔

(اوالائی داخل ہوتی ہے بچے چپکے سے چل دیتے ہیں)

اوالائی۔ تمہارا ہری سدا سے جھوٹ بولتا آیا ہے اور وہ اس جگت کو ایک
جھوٹ کے گرد گھمائے جارہا ہے۔ جب اُس نے پہلے پہل چاند
سُورج بنائے اور انہیں کال کے ساگر میں بہنے کے لئے اکیلا
چھوڑ دیا تو اُس نے اُنہیں بچن دیا کہ انہیں ساگر کے دُوسرے کنارے
پر پہنچادے گا۔ اور اُنہوں نے اُس کی بات پر وشواس کرلیا۔ یہ بہت
دیر کی بات ہے پر اب وہ سب کچھ جان گئے ہیں۔ کال کا کوئی انت
نہیں۔ پرمیشور یہ تب بھی جانتا تھا جب اُس نے اُنہیں کال کے ساگر
میں بہنے کے لئے چھوڑا تھا۔ مگر اُس نے اُن سے جھوٹ بولا۔
اسی طرح اُس نے اس جگت کی ساری سُندرتا کو بچن دیا کہ

اُسے یلدن کال کے گول چکر سے مکتی مل جائے گی۔ پرکال کا کوئی
انت نہیں اور دنیا اس جھوٹ کے گرد پرمیشور کے اس پراچین
جھوٹ کے گرد گھومے جا رہی ہے اور گھومتی چلی جائے گی۔

تکارام۔ یہ زندگی بے شک ایک بڑی بھاری مایا ہے۔ لیکن پرماتما جو
سب کے پیچھے ہے ایک بے انت سچائی ہے۔

اولائی۔ میں جانتی ہوں! سب کچھ جانتی ہوں۔ اس جیبھ کا سب جھوٹ سچ
جانتی ہوں جو مجھے ایسی باتیں سناتی ہے۔ پر یہ کون آ رہا ہے!۔
تمہارے ہی دو بھکاری شکل جان پڑتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ
جھاڑو سے ان کو مار مار کر بھگا دوں۔

تکارام۔ مہمان کی سواگت اسی طرح کرنی چاہیے جیسے خود پرمیشور کی سواگت

اولائی۔ تمہارا پرمیشور یہاں آئے تو اُس کی سواگت میں اس جھاڑو سے
کروں گی۔

(دو آدمی سروں پر خوان اُٹھائے جن پر سرخ اور نارنجی ریشم کے
سرپوش پڑے ہیں داخل ہوتے ہیں۔ یہ نوکر ہیں جو شیواجی کے
محل سے آئے ہیں)

تکارام۔ آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟

پہلا خادم۔ ہمیں راجہ نے بھیجا ہے۔

اولائی۔ آکاش کے راجہ نے تو نہیں بھیجا نا!

دوسرا خادم۔ ہم مہاراجہ شیواجی کے نوکر ہیں۔

پہلا۔ جس نے یہ مہاتماجی کے لئے معمولی سی سوغاتیں بھیجی ہیں۔

اولائی۔ آؤ آؤ۔ میں تین بار تمہارا سواگت کرتی ہوں۔

(نوکر طشتوں پر سے سرپوش ہٹا دیتے ہیں۔ طشت جھلملاتے ہوئے
جواہرات سے بھرپور نظر آتے ہیں)

اولائی۔ ہائے ہائے کیسے سُندر نگینے ہیں۔ مجھے تو ان کی اگنی میں جلا دو۔
مجھے ان میں دبا دو تاکہ میں انہیں کی سُندر اگنی میں ہولے ہولے بھسم
ہو جاؤں۔

تکارام۔ لے جاؤ۔ لے جاؤ۔ ان جواہرات کو راجہ کے پاس واپس لے جاؤ۔

اولائی۔ نہیں نہیں! ..... انہیں یہیں رہنے دو۔ کیونکہ ان سے میرے
من میں اُس پرماتما کا پریم اور مان اور وشواس پیدا ہوتا ہے جس
نے یہ سنسار بنایا۔ نہ بھیجو۔ سوامی انہیں واپس نہ بھیجو۔ یہ ہمیں پرماتما
نے بھیجے ہیں۔ یہ میری اُس پرارتھنا کا پھل ہے۔ جو میں نے اُس

سے بار بار کی۔ ہائے پرمیشور کیسا سُندر ہے۔

تکارام۔ یہ پتھر کے ٹکڑے جنہیں تم نگینے کہتی ہو۔ اپنی اندھیاری جوت سے
آتما کے نگینے کی جھلملاتی ہوئی جوت کو چھپا دیتے ہیں۔

اولائی۔ آتما کیا ہے! ایک کہانی جسے بچے سن کر خوش ہو جائیں۔

تکارام۔ نہیں۔ یہی تو ایک سچ مچ کی چیز ہے۔ آتما پرمیشور کی انگوٹھی کا نگینہ
ہے۔

اولائی۔ ہاں جس کی پیلی پیلی جوت آپ جیسے گیانی ہی کو دکھائی دیتی ہے۔ (راجہ
کے نوکروں سے) مہابلی راجہ کے اچھے سیوکو۔ ان کی باتوں پر دھیان
نہ دو۔ یہ بھگت لوگ تو نرے پاگل اور بے سُدھ ہوتے ہیں۔

(جواہرات کو ایک ایک کر کے اُٹھاتی ہے)

(اپنے آپ سے) میرا من نگینوں کے اس تھال کو دیکھ کر کیسا پرسن
ہو رہا ہے۔ سر سے پیر تک تھر تھر کیوں کانپ رہی ہوں۔ کہیں میرا
دل اُچھل کر سینے سے باہر تو نہیں آ جائے گا۔ یہ ہیرے ہیں کہ
ایک کنواری کے ٹپکتے ہوئے آنسو۔ اور یہ لال جیسے کسی پہاڑی
پر چھپنے والی سورج کی لالی کھیل رہی ہو۔ اور نیلم! آکاش کے نیلے
اُجالے جیسے ---- اور یہ پکھراج جیسے سمندر کی تہ کی ہریالی۔
اور یہ جھمجھماتے ہوئے پنے جن میں دھنک جھانک رہی ہے
اور یہ موتی۔ سمندر کے پیارے پیارے بچے۔

تکارام۔ ناری! انہیں میرے من کی جوت میں دیکھ۔ ہیرے ایسے سفید
جیسے کسی کوڑھی کی ٹانگیں اور لعل ایسے سرخ جیسے کسی قاتل کی
آنکھیں۔ اور نیلم جیسے کسی پیالے میں گھلی ہوئی زہر۔ اور زمرد
ایسے سبز جیسے کسی بچے کی قبر۔ اور یہ جھلملاتے ہوئے پنے جیسے
کسی پاتر کے گھر کا دیا۔ اور یہ موتی ایسے زرد جیسے ایک مردہ ناری
کے پیلے پیلے ہونٹ۔ لے جاؤ۔ لے جاؤ۔ انہیں راجہ کے پاس واپس
لے جاؤ۔

خدام۔ ایک بھگت کی آگیا مہاراج کی آگیا سے زیادہ ہے۔ جسے ہمیں
ماننا ہی پڑے گا۔

(طشت لے کر چلے جاتے ہیں)

اولائی۔ ہائے اتیاچاری۔ یہ تُو نے کیا کر دیا؟

تکارام۔ مردار خور گدھوں کا ایک جھنڈ۔ جن کی آنکھیں ہیرے۔ لال نیلم
اور زمرد کی آنکھیں تھیں۔ ہمیں کھانے کو جھپٹا تھا۔ لیکن ہم اُن سے

بچ گئے۔ اُن کا نوالہ ہونے سے بچ گئے۔

اوالائی۔ پر تمہیں وہ بڑا گِدھ دکھائی نہیں دیتا۔ جس کی پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور جس کی مٹیالی آنکھوں کی کھا جانے والی چمک ہمارے گھر پر چھا رہی ہے اور تم اس کی منحوس چھایا تلے بیٹھے اپنے گیت گایا کرتے ہو۔ دیوتاؤں کی سُندر آنکھوں کا رُوپ ہمارے گھر میں آیا۔ اور تم نے اِسے لَوٹا دیا۔ اور ہم پھر بھکاری کے بھکاری رہ گئے۔ پرمیشور تو آکاش کا پراچین جھوٹا ہے۔ جو سنسار کو ایک بہت بڑے جھوٹ کے گرد گھمائے جا رہا ہے۔ تو ہر گھڑی ہمیں دم دیئے جاتا ہے۔ اور ہمیں تو اپنے کھیل کے ٹھیکروں سے بڑھ کر نہیں جانتا۔ تو بار بار اپنا بچن توڑتا ہے۔ اور ہم یہ جانتے ہُوئے بھی تجھ پر پھر وشواس کر لیتے ہیں۔

تُکارام۔ بلیدان ہمیں پرماتما کے پاس لے آتا ہے۔

اوالائی۔ ارے مُورکھ! مُورکھ! پرماتما ہے کہاں؟

منظر (اندرائنی ندی کا کنارا۔ مردوں اور عورتوں کی بھیڑ تُکارام کے گرد جمع ہے اور تُکارام جھانجھوں کے ساز پر ایک بھجن گا رہا ہے)

تُکارام۔ (گاتا ہے)

دن ختم ہُوئے دن بیت چُکے، اس دھرتی سے اب چل دینگے،
اب جنم مرن کے بندھن کو ہم بھائی! پل میں توڑیں گے!
ماٹی کی نیند سے جاگیں گے، دھرتی کی گود میں پہنچیں گے،
یہ جیون دُکھ کا سپنا ہے، اس سپنے سے اب چونکیں گے!
اب سب سے جُدائی ہوتی ہے، ہم اس دھرتی سے جائیں گے،
اُس بستی کو جانا ہے جہاں سے لوٹ کے ہم کب آئیں گے؟
جو گیت یہاں گانے تھے ہمیں وہ گیت یہاں ہم گا بھی چکے،
جو بات بتانی تھی جگ کو، وہ ساری بات بتا بھی چکے۔
اب انت دکھائی دیتا ہے اِس جنم مرن کے پھندے کا،
اب جاتے ہیں اِس دھرتی سے، بنتا ہے کوئی ساتھی اپنا،
کہو میرے ساتھ کون چلتا ہے؟

ایک بوڑھی عورت۔ ہم سب چلیں گے۔

ایک آدمی۔ مگر کہاں؟ —— ہمیں بتاؤ کہاں؟

تُکارام۔ بیکنٹھ کو۔

ایک بوڑھا آدمی۔ اس نام سے تو ہم جاتری لوگ اس دُنیا کے ہر تیرتھ کو پکارتے ہیں۔

تُکارام۔ نہیں نہیں۔ میں تو اس دھرتی سے دُور ایک ایسے سُندر تیرتھ کو جا رہا ہُوں جو جاتریوں کے سپنوں سے بھی پرے ہے۔

ایک اور آدمی۔ سپنوں سے بھی پرے؟ جاتری یہ تیرتھ تو بہت دُور ہوگا تم اتنی دور کیسے جاؤ گے۔ اس کے دھیان ہی سے تمہارے پاؤں چُور چُور ہو جائیں گے۔

تُکارام۔ (گاتا ہے)

ہم سنت نگر کو جائیں گے	ہم پریم نگر کو جائیں گے
ہم بن کے بھکاری جائیں گے	اور ہاتھ سے خالی جائیں گے
وہ بستی آنکھ سے اوجھل ہے	اور دل سے دور اک منزل ہے
ہر بات نئی اُس بستی کی	ہر ریت انوکھی، اَن دیکھی
اِس جگ سی کوئی بات نہیں	واں دن بھی نہیں اور رات نہیں
اُس بستی کی دھرتی پہ سدا	ہر سُو ہریالی چھائی ہے
ہریالی میں ہے اُجیالا	کیا سندر جوت جگائی ہے
واں پاک پوتر سنت سبھی	جب پہنچوں گا، وہ آئیں گے
دیکھیں گے ہاتھوں کو خالی	اور بھکشا ہمیں دلائیں گے
وہ سنت ہیں راجوں سے اُونچے	دھن اُن کا ہر کی مالا ہے
ہیں پریم دیا کے سب ہیرے	اور موتی من سُکھ والا ہے
لو دیکھو سنت سب آئے ہیں	اور پریم کی بھکشا لائے ہیں
یہ دنیا من سے بھلائیں گے	اور سنت نگر کو جائیں گے

ہم سنت نگر کو جائیں گے
ہم پریم نگر کو جائیں گے

دیکھو دیکھو وہ آ رہے ہیں۔ کیا تمہیں وہ آتے دکھائی نہیں دے رہے۔

ایک عورت۔ ہمیں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

ایک اور عورت۔ ہمیں تو بس سنسان آکاش دکھائی دیتا ہے جو ایک نیند کے ماتے پھول کی طرح ندی کے کنارے پر جُھک رہا ہے۔

ایک اور عورت۔ ہمیں تو بس ایک اُجلا سا بادل دکھائی دیتا ہے جو ایک سنت کے سپنے کی طرح ندی میں سے ابھر رہا ہے۔

ایک آدمی۔ ہمیں تو آکاش کے نیل کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔
تُکارام۔ لو وہ آ گئے سانولے شیام کے سُندر پیامی۔
ایک بڑھا آدمی۔ ہمیں تو کوئی پیامی ویامی نظر نہیں آتے۔
تُکارام۔ وہ ایک پھولوں کی ناؤ میں بیٹھے ہیں جو آکاش کے نیلے اُجالے
میں تیرتی ہوئی ہماری طرف بڑھ رہی ہے اور اپنے پیچھے ایک سپہلی
لکیر چھوڑتے آ رہی ہے۔ اس کے پروں کی چپّو کی پھڑپھڑاہٹ
کانوں کو کیسی بھلی لگتی ہے۔ کون چلے گا میرے ساتھ۔
مجمع۔ ہم سب چلیں گے۔ مگر پہلے ہمیں پھولوں کی ناؤ اور آکاش کے
راستے کا نقشہ تو دکھاؤ۔
تُکارام (اپنے بیٹے سے) مہادیو! جاؤ اپنی ماں کو بلالاؤ۔
(مہادیو چلا دیتا ہے)
بھائیو! تمہاری آتما اُس چیدا ہے لڑکے کی طرح ہے جو ساری دوپہر
کسی گھنے پیڑ کی چھایا میں سوتا رہتا ہے۔ اور جب دن ڈھلے جاگتا
ہے تو دیکھتا ہے کہ اُس دن کے سورج کا سُندر روپ ہمیشہ کے
لئے چھپ گیا۔ تمہاری آتما شریر کے پیڑ کی گھنی چھایا میں سو رہی ہے
اُس سنہری دوپہر میں جس کا کوئی مول نہیں۔ اور جب یہ اُٹھے
گی تو سورج چھپ چکا ہوگا۔ اور یہ انمول دوپہر کبھی ہاتھ نہیں
آئے گی۔ (گاتا ہے)
پانڈورنگ کا نام[1]
سمرن کرے ۔۔۔۔۔ سدا رہے یہ کام۔
پانڈورنگ کا نام۔
اگنی میں بھڑکیں انگارے،
ویسے جھلمل جھلمل کرکے
من میں تیرے ۔۔۔۔ نت چمکے یہی نام۔
پانڈورنگ کا نام
پھلواری میں کلیاں چٹکیں
ویسے تیرے تن اور من میں
کھلتا جائے ۔۔۔۔ پُشپا روپی نام۔
پانڈورنگ کا نام۔

---

[1] سری کرشن مہاراج

ہمیں وٹھوبا آج بلائیں! ۔ ہم اُن کے چرنوں میں جائیں
آئے اچانک گھڑی سہانی ۔ ساگر اور دریا کا پانی!!
اہنکار کر دونوں چھوڑیں ۔ مل کر گائیں میٹھی بانی
ہم ایسے ہیں جیسے دریا
اور وہ ہے ساگر امرت کا
ویسے ساگر ہمیں بلائے ۔ جب ساگر دریا کو پائے
دریا پھر کیسے لوٹ آئے۔ تُکا یہی اِک بات بتائے
بھول نہ جانے ۔۔۔۔ دیگا مکتی نام
پانڈورنگ کا نام
(اولائی ہاتھ میں گوبر کی بنی ہوئی ایک ٹوکری اُٹھائے داخل
ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایندھن کے لئے اُپلے
تھاپتی رہی ہے)
تُکارام۔ تو تم آ گئیں۔
اولائی۔ تُم نے مجھے کیوں بُلا بھیجا ہے۔
تُکارام۔ میں نے تمہیں نہیں بلایا۔ اُس آکاش کے مالک نے بلایا ہے
جس نے اپنی پھولوں سے بنی ہوئی ناؤ میرے لئے بھیجی ہے۔
اولائی۔ پھولوں کی ناؤ اسے لوٹا دو اور اُس سے کہو کہ وہ اس جگت کے بکھیڑوں
میں نہ پڑے اور اپنے آپ کو سُدھارے۔ تمہیں بھی سیدھا راستہ دکھائے
تُکارام۔ آؤ ہم اپنی آخری جاترا پر بیکنٹھ کو چلیں۔
اولائی۔ تم جیسا نکما آدمی ہی ایسی جاتراؤں کے سپنے دیکھے۔ مجھے تو پھولوں
کی ناؤ میں بیٹھنے اور ایسی جاتراؤں پر جانے سے کچھ بڑھ کر دھندے
یہاں کرنے ہیں۔
تُکارام۔ اب کونسا کام کرنے کو رہ گیا ہے۔
اولائی۔ ابھی تو سو کام باقی ہیں۔ مجھے گائے کی کوٹھڑی کا فرش صاف کرنا
ہے۔ رسوئی میں جھاڑو دینی ہے۔ برتن مانجھنے ہیں۔ دیوں میں
تیل ڈالنا ہے۔ پھٹے کپڑوں کو سینا ہے۔ آگ جلانی ہے۔ رات
کا کھانا پکانا ہے۔ اناج پھٹکنا ہے۔ چکی پیسنی ہے۔ دودھ بلونا ہے
تم یہ جان کر بھی کہ مجھے بیسیوں دھندے کرنے ہیں۔ مجھ سے
پوچھتے ہو کہ کونسا کام کرنے کو رہ گیا ہے؟
تُکارام۔ بیکنٹھ میں کوئی کام نہیں کرنا پڑیگا۔

اوالائی۔ بیکنٹھ تم اور تمہارے پرمیشور کی جوڑی کو مبارک رہے۔ جو دوسروں کا بچا ہوا پھل کھانے پر سدا تُلی رہتی ہے۔

تکارام۔ (گاتا ہے)

دیکھو پھندے میں نہ پھنس جاؤ کہیں!
رنگ کا دھوکا ہے اِک، جال ہے مایا کا عجیب!
کیا وہ آواز سُنی تم نے نہیں،
موت کے پاؤں کی چاپ آتی ہے —— آتی ہے قریب!
موت کا دیو کھڑا ہے، دیکھو!
شکل وحشی ہے اور اِک ہاتھ میں خُونی مشعل!
اِس سے اب کون بچائے تم کو؟
اس کا پھندا ہے کہ پھولوں سے سجا ہے چنچل!
آؤ، سُن لو یہ تکا کی باتیں،
بس، ہری موت سے اب تم کو رہائی دیں گے!
اس کی بیکار ہیں ساری گھاتیں،
کنگرے عرش کے اب جلد دکھائی دیں گے!
ایک تیزی سے وہ اِک پل میں یہیں،
ناؤ آکاش سے بہتی ہی چلی آتی ہے!
آہ! یہ ناؤ ہے کس درجہ حسین!
رنگ سے اس کے فضا نُور سے بھر جاتی ہے!
مو پروں والی نیا آگئی۔ کیسی سُندر کیسی پیاری کیسی اُجلی نیا!

ایک بوڑھا آدمی۔ ہوا میں واقعی پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دے رہی ہے
ایک عورت۔ مجھے تو سنائی نہیں دیتی۔
ایک آدمی۔ مجھے تو بس مٹیالی ندی کا شور سنائی دے رہا ہے۔
ایک بوڑھی عورت۔ مجھے آکاش میں سے کچھ آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔
ایک اور عورت۔ آکاش تو ایک نیلے پھول کی طرح ہے جو میرے من کو ایک چنچل سگندھ سے بھرے دیتا ہے۔
اوالائی۔ سوامی میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ لیکن ہماری گائے گابھن ہے۔ میں اُسے چھوڑ کر کیسے جاؤں۔
تکارام۔ میں جا رہا ہوں۔ اس جوت کی طرف جو مجھے دُور سے بُلا رہی ہے۔

(سٹیج پر ایک دم اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھیرے میں بڑے بڑے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنائی دیتی ہے۔)

ہجوم کی آوازیں۔ ہائے یہ کیسا اندھیرا ہے۔ یہ کیسی پھڑپھڑاہٹ ہے۔ ارے ہم کہاں ہیں۔ ہائے یہ اندھیرا ہمیں مسلے ڈالتا ہے۔ ارے میں جم گیا۔ یہ تو ہمیں جلائے دیتا ہے۔

(اندھیرے کی گہرائیوں میں سے تکارام کے آخری الفاظ سُنائی دیتے ہیں)

تکارام کی آواز۔ یہ اندھیرا نہیں۔ اُجالے کی انتہا ہے جس نے تمہاری آنکھوں کو چُندھیا دیا ہے۔ یہ اُس جوت کا پرتو ہے جو مجھے بلا رہی ہے۔

(پروں کی پھڑپھڑاہٹ مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ سٹیج پھر روشن ہو جاتی ہے)

ہجوم کی آوازیں۔ ارے تکارام کہاں ہے؟
رامیشور۔ (جو اس منظر میں شروع سے خاموش کھڑا ہے) یہ جوت وہ جوت ہے جو چیخنے والے ساگر پر چھا جاتی ہے اور جس کی موہنی گونج سے سارا آکاش بھر جاتا ہے۔[1]

ہرندرناتھ چٹوپادھیا کی انگریزی سے

صلاحُ الدین احمد

[1] اس ڈرامے کے آخری چار گیتوں کے لئے میں عزیز مکرم میراجی کا ممنون ہوں جنہوں نے میری کم فرصتی پر رحم کھا کے پہلے چار گیت ترجمہ کر دیئے۔

ایک شاعرِ جواں مرگ سے

(منصورِ مرحوم کی یاد میں)

نہ ملی فرصتِ یک لحظہ بھی جینے کے لئے
تنگ دل آہ ہے یہ محفلِ فطرت کتنی!
تجھ کو لمحات پہ درکار تھی قدرت کتنی
یک نفس اور مئے زیست کو پینے کے لئے۔

ساعتِ زیست ہر اک لمحہ گذرتی ہی گئی
نہ ملا وقت تجھے نغمہ سرائی کے لئے
بربطِ عشق پر آشفتہ نوائی کے لئے۔
زندگانی کی صراحی تھی کہ بھرتی ہی گئی

رہ گئے خوابِ عدم میں ترے رُومان کئی
کتنے نغمے تھے کہ جو تشنۂ تکمیل رہے
بے خود و مستِ مئے لذتِ تخئیل رہے
رہ گئے دل میں مچلتے ہوئے ارمان کئی

غلبۂ خواب سے تو خود کو بچا بھی نہ سکا
کھو گیا یوں کہ پتہ اپنا تو پا بھی نہ سکا!

تابش صدیقی

روشنی کی کرن

سعید شام کے وقت شملہ کی مال پہ کھڑا حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کشمیر سے لے کر مدراس تک کا تموّل اور حُسن اپنی پوری شان خود آرائی کے ساتھ سامنے سڑک پر متحرک تھا۔ بنے ٹھنے، بانکی وضع کے نوجوان اور خوبصورت، جامہ زیب عورتیں خراماں خراماں چلی جا رہی تھیں۔ ہوا میں قہقہوں کا لوچ اور خوشبو کی مہک رچی ہوئی تھی۔ انگریزی طرز کی دُکانیں، جن میں ہزاروں لاکھوں کا ولایتی مال بھرا پڑا تھا، اس سلیقے سے سجائی گئی تھیں کہ راستہ چلنے والوں کی توجہ خواہ مخواہ اُن کی طرف مبذول ہو جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا اور بجلی کی روشنی نے اس رونق کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ سعید سوچ رہا تھا کہ شملہ کا یہ منظر دیکھ لینے کے بعد کوئی شخص کیوں کر باور کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں باشندے تن ڈھانکنے کو چند گز کپڑے اور پیٹ بھرنے کو روٹی کے چند ٹکڑوں سے محروم ہیں۔ اور اس خطۂ ارض پہ بسنے والے بے شمار انسان محض افلاس کے ہاتھوں قبل از وقت موت کی نذر ہو رہے ہیں۔

سعید نے سوچا کہ اگر یکایک کسی طلسمی طاقت سے مال کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کی اُن درماندہ، مفلوک الحال اور خستہ و نیم جان بستیوں کا نقشہ بھی سامنے آ جائے تو یہ عشرت پسند اور نازک مزاج لوگ جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے کے باوجود بے چین راتیں بسر کرتے ہیں۔ اُن آبادیوں کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ جہاں عورتیں پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں جسم چھپائے تپتی ہوئی دوپہر میں پتھر اُٹھا اُٹھا کر مزدوری کرتی ہیں اور ننھے ننھے شیر خوار بچے پاس زمین پر پڑے دودھ کے لئے بلبلاتے ہیں۔ جہاں قحط زدہ، فاقہ کش اور مجبور و لاچار مزدوروں کی برہنہ پُشت پر اس لئے کوڑے برستے ہیں کہ اُنھوں نے کسی جاگیردار کے کارندے سے کام کی اُجرت طلب کی تھی

سعید نے دیکھا کہ چند عورتیں حریر و دیبا میں ملبوس، چہروں کو غازہ و گلگونہ سے رشکِ آفتاب بنائے اور بالوں کو حد درجہ احتیاط سے سنوارے آ رہی ہیں۔ ان عورتوں کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہونے لگا۔ بیش قیمت اور مرصّع ساڑھیاں اُن کے جسموں پر عشق پیچاں کی بیل کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ خوشبوؤں میں بسے ہوئے بال گھنٹوں کی محنت سے آراستہ کئے گئے تھے اور قدم قدم پر اُن کے جسموں کی لچک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حُسن و نزاکت کے مجسّمے ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ خود اعتمادی کے رنگ میں مسکراتی، دُزدیدہ نگاہوں سے گرد و پیش کی ہر چیز کا جائزہ لیتی اور اپنے پیچھے ہوا میں عطر کی خوشبو کی ایک لہر پیدا کرتی یہ نور و لطافت کے خمیر سے بنی ہوئی پُتلیاں انگریزی دُکانوں میں جو بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہی تھیں داخل ہونا شروع ہوئیں روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ شب و روز کی محنت سے پیدا کی ہوئی دولت سے، جس میں ہزاروں غریبوں کے خون کی آمیزش تھی، آرائش اور سنگار کا سامان خریدا جا رہا تھا۔ سعید نے سوچا کہ اگر ان چہروں سے غازے کی آب و تاب، آنکھوں سے سُرمے کا دُنبالہ، ہونٹوں سے سرخی کی جلا اور ابروؤں سے کاجل کی شوخی چھین لی جائے تو کیا یہ چہرے اتنے ہی حسین، یہ آنکھیں اتنی ہی فتنہ ساماں، یہ ہونٹ اتنے ہی دلکش اور یہ ابرو اتنے ہی قاتل رہیں گے۔ اگر یہ دُبلے پتلے جسم جو شاخِ گل کی طرح ہوا کے ہر جھونکے سے لچک لچک جاتے ہیں، ان زرنگار ساڑھیوں سے محروم ہو جائیں تو کیا یہ قد اتنے ہی رعنا، یہ رفتار اتنی ہی حشر انگیز اور یہ انداز اتنے ہی ہوش ربا ہوں گے۔ بے اختیار اُس کی نظریں اپنے آپ پر پڑ گئیں۔ وہ موٹے کھدر کا پاجامہ اور کُرتہ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں معمولی سا چپل اور سر پہ کھدر کی کشتی نما ٹوپی تھی۔ وہ ابھی تین مہینے ہوئے دو سال کی قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا تھا۔ ترکِ موالات کی سیاسی تحریک میں اُس نے بہت سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ قانون کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اُس نے وکالت کے پیشے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ترکِ موالات کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور عدالتوں کے مقاطعہ کی تلقین ہونے لگی۔ سعید خود آتشیں جذبات کا مالک نوجوان تھا۔ چنانچہ مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ بے دریغ سیاست کے

خارزار میں کود پڑا۔ وہ اس رو میں بہتا چلا گیا۔ تقریر و تحریر پر اُسے قابلِ تحسین عبور تھا لیکن نوعمری کی وجہ سے وہ احتیاط اور دور اندیشی نہ تھی جو صرف پختہ سالی سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنی انقلاب انگیز اور خلافِ آئین تقریروں کی بنا پر وہ جلد ہی گرفتار ہو کر سزایاب ہو گیا۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی سعید اپنی اُفتادِ مزاج کے اعتبار سے دلچسپ اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھا۔ قومی جوش تو ہر وقت اُس کے دل میں موجزن رہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ شاہانہ دل و دماغ کا مالک اور ایک حقیقی صنّاع کی طرح خوبصورت چیزیں وضع کرنے اور اُن سے حظ اُٹھانے کا شوقین بھی تھا۔ انہی دنوں میں اُس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو اُس کے بہت دور کے قرابت داروں میں سے تھی۔ اُس کا نام زبیدہ تھا۔ زبیدہ بی اے میں پڑھتی تھی اور اُس کے باپ نے جو سرکاری ملازمت کی وجہ سے تقریباً تمام عمر گھر سے باہر رہا تھا اب پنشن لینے کے بعد وطن میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ زبیدہ کی شکل و صورت میں دلکشی اور عادات و اطوار میں شائستگی اور متانت تھی۔ اُس کے چہرے سے ذہانت اور ہمدردی کے آثار ٹپکتے تھے۔ سعید جب پہلی مرتبہ اُس سے ملا تو اپنے دل پر عجیب و غریب تاثرات لے کر آیا۔ زبیدہ کی مہذب گفتگو، اندازِ نشست و برخاست میں اُس کا قابلِ رشک سلیقہ، ذکاوت و ذہانت کے ساتھ اُس کی ادبی لیاقت اور قومی و ملکی معاملات سے اُس کی گہری دلچسپی۔ ان تمام باتوں نے مل کر سعید کے دل میں زبیدہ کے لئے بہت بڑی جگہ بنا دی۔ پھر آہستہ آہستہ اُنہیں ملاقات کے زیادہ موقعے میسر آنے لگے۔ تعلیمی مشاغل میں منہمک ہونے کی وجہ سے اُن کی باتیں بالعموم علمی و ادبی موضوعات تک محدود رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ہند اور بیرونِ ہند کے سیاسی حالات بھی زیرِ بحث آجاتے تھے۔ سعید نے حیرت انگیز مسرت کے ساتھ دیکھا کہ زبیدہ قومی ادبار کو شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ وہ اکثر اُن اسباب و واقعات پر اظہارِ خیال کرتی جو اُس کے نزدیک ہندوستان کی موجودہ پستی کا باعث تھے اور پھر اس زبوں حالی سے نجات پانے کے لئے اپنی فہم و فراست کے مطابق تدابیر بھی پیش کیا کرتی۔ سعید کے دل میں ملک و ملت کے درد کی جو چنگاری چھپی ہوئی تھی وہ ان گفتگوؤں کے بعد پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتی تھی۔ سعید گھر آکر سوچتا کہ زبیدہ کی معیت اُس کے لئے کس درجہ خیال انگیز، روح پرور اور حیات افروز ہے۔ وہ جب بھی اس سے مل کر آتا اپنے دماغ میں زندگی کا نیا تصور دل میں جدوجہد کا نیا ولولہ اور روح میں عزم و ہمت کا نیا جذبہ محسوس کرتا تھا

اس کے علاوہ زبیدہ کے مزاج کا جمالیاتی پہلو بھی اُس پر اثر انداز ہو رہا تھا وہ ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتی تھی اور موسیقی میں اُسے کافی دسترس تھی۔ شعر و سخن کی گفتگو میں سعید بسا اوقات اُس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ زبیدہ کی جامہ زیبی اور اُس کے لباس کی نئی سے نئی وضع قطع، جس کے اختراع میں خود اُس کی فن کارانہ طبیعت کو بہت دخل تھا۔ سعید کے لئے کسی بلند پایہ صنّاع کے شاہکار سے کم اہمیت نہ رکھتی تھی۔ زبیدہ کی ہر چیز اُس سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی تھی لیکن وہ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ زبیدہ کے سامنے اُس کی کسی چیز کی تعریف نہ کرے۔ وہ اُس کے منہ پر مدح و ستائش کے کلمات کہنا مذاقِ سلیم کے منافی سمجھتا تھا یوں بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ زبیدہ پر ظاہر ہو کہ وہ اُس سے کس حد تک متاثر ہو چکا ہے۔ تنہائی میں اس ضبط و احتیاط اور بیگانگی و بے نیازی کا زبردست ردِّعمل شروع ہوتا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے، مطالعہ کی میز پر جھکے جھکے اور بستر پر لیٹے لیٹے اُس کی چشمِ تصور کے سامنے زبیدہ آجاتی۔ زبیدہ کی صورت ایسی نہ تھی کہ نظرِ اول میں دیکھنے والے کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں لیکن قدرت نے اُس کے حسن میں ایسی ملاحت اور دلکشی رکھی تھی کہ انسان جُوں جُوں اُسے دیکھتا فریفتگی اور والہیت کا جذبہ بڑھتا جاتا تھا۔ سعید کے سینے میں جذبات کی نئی نئی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور اُس کی دنیا خیالات کی نئی سے نئی دلآویزیوں سے مزین ہو رہی تھی۔

مدت ہوئی زبیدہ کی منگنی ایک بہت امیر گھرانے میں ہو چکی تھی۔ لڑکا فارغ التحصیل ہو کر اب ایک اچھے عہدے پر فائز تھا اور اُن کا تقاضا تھا کہ شادی جلد ہو جائے۔ زبیدہ کے والدین اس انتظار میں تھے کہ زبیدہ تعلیم سے فارغ ہو تو یہ فرض بھی ادا کر دیا جائے۔ زبیدہ نے اس رشتے پر کبھی اظہارِ خیال نہ کیا تھا اور اُس کی عزیز ترین سہیلیوں میں سے بھی کسی کو اُس کی خوشی یا ناخوشی کا حال معلوم نہ تھا۔ خود زبیدہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے تعلیم یافتہ ہے اور سرکاری ملازم ہے۔ اُس کے مذاق اور مزاج کے متعلق اُسے صرف اتنی واقفیت تھی کہ وہ دفتری زندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے شغف نہیں رکھتا۔ قومی و ملکی معاملات سے اُسے کچھ دلچسپی نہیں۔ شعر و ادب کی طرف اُس کا بالکل رجحان نہیں اور اُس کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ کبھی کبھی دوستوں میں بیٹھ کر تاش کھیل لیا جائے۔ سعید سے ملنے کے بعد زبیدہ کو عمر میں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ایک ہم خیال و ہم ذوق نوجوان مرد کی رفاقت

کس درجہ خوشگوار اور روحانی مسرت سے لبریز ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق
جب دونوں کے نظریئے ہم آہنگ ہو جائیں یا اگر اختلاف ہو بھی تو اتنا جتنا
موسیقی کے دو سُروں میں ہوتا ہے تو دل و دماغ کی شگفتگی کے لئے یہ صحبت کتنی
مؤثر و مفید ہوتی ہے۔ خیال اور مذاق کی یگانگت سے ہمدردی اور ہمدردی
سے محبت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ زبیدہ نے یکایک محسوس کیا کہ اُس کے دل
کے ایک خفیہ گوشے میں سعید کے لئے بہت لطیف اور نرم و نازک جذبات
پرورش پا رہے ہیں۔ یہ احساس جس ناگہاں تیزی سے رُونما ہوا اُسی قوت
کے ساتھ زبیدہ نے اُسے دبا دینے کی کوشش کی۔ ایک کنواری لڑکی کے
لئے، جس کی منگنی ہو چکی ہو، کیسے زیبا ہے کہ ایک اور نوجوان کے خیال کو
اپنے دل میں جگہ دے۔ زبیدہ نے سعید سے میل ملاقات ترک کر دی کہ
مبادا یہ چنگاری کہیں بھڑک کر شعلہ بن جائے۔ سعید اب بھی گاہے گاہے
اُن کے ہاں جاتا لیکن زبیدہ کی طرف سے کسی سرگرمی کا اظہار نہ پا کر وہ بجھے
ہوئے دل کے ساتھ واپس آجاتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ عورتوں کی تلون کیشی
کے قصے جو اُس نے کتابوں میں پڑھے تھے من و عن درست نکلے۔ زبیدہ
کی سرد مہری کو اُس نے نسوانی فطرت کی اُس روایتی دھوپ چھاؤں پر
محمول کیا جہاں عورت گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہے۔

زبیدہ نے جب بی اے کر لیا تو اُس کی شادی ہو گئی۔ سعید کسی
ضروری کام کا بہانہ کر کے شادی سے چند روز پہلے کہیں باہر چلا گیا تا کہ اس
تقریب میں شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اُس کا تحفہ زبیدہ کے جہیز میں موجود
تھا یہ ایک عورت کا خوبصورت مجسمہ تھا جو سنگ مرمر سے تراشا گیا تھا۔
عورت کے ہاتھ میں سورج مکھی کا پھول تھا جس پر آفتاب کی شعاعیں
پڑ رہی تھیں اور خود عورت کا وجود سراسر تاریکی میں تھا۔

زبیدہ معصومیتِ کردار اور پابندیٔ خیال کی تمام رعنائیاں لے
کر اپنے خاوند کے پاس گئی اور ہمیشہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش
کرتی رہی کہ اُس کے دل کے ہر کونے میں خاوند کی محبت جاگزیں ہے۔
سعید کے متعلق اُسے براہِ راست کوئی اطلاع موصول نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار
وہ میکے جاتی بھی تو سعید سے ملاقات نہ ہونے پاتی تھی۔ اُس نے سنا کہ
سعید کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ پھر پیہم اُس کو سعید کی بیماری کی
خبریں پہنچنے لگیں۔ اس دوران میں سعید قانون کی تعلیم ختم کر چکا تھا لیکن
آئندہ بسر اوقات کے متعلق اُس نے کوئی طریق کار تجویز نہیں کیا تھا۔ اُس
کے دوست احباب اور عزیز و اقربا زور دے رہے تھے کہ وہ جلد وکالت
شروع کر دے لیکن خود اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ ناقابل فہم طریق پر اُداس،
غمگین اور پریشان نظر آتا تھا۔ پوچھنے پر بھی وہ اپنے دل کا حال کسی کے
سامنے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس پُراسرار تبدیلی کی وجوہ بیان کرتے وقت
وہ صرف اپنی ناسازیٔ مزاج کا ذکر کر دیتا تھا۔ اُس کے فکرمند والدین نے
اس خیال سے کہ شاید تبدیل آب و ہوا سے کچھ فائدہ ہو اُسے دو ایک ماہ
کے لئے باہر بھیج دیا لیکن جب وہ واپس آیا تو اُس کی خودساختہ بیماری ویسی
ہی شدید اور ناقابل علاج تھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں چرچا ہونے
لگا کہ سعید کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہے۔

زبیدہ جب میکے آئی اور سعید کے متعلق اُس نے تشویش ناک
باتیں سنیں تو خود اُسے دیکھنے کے لئے ایک دن اُس کے مکان پر چلی گئی
سعید نے پہلے تو چاہا کہ ملنے سے انکار کر دے لیکن چونکہ وہ مکان میں تنہا
تھا اس لئے ملاقات کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ زبیدہ نے ڈرتے ڈرتے
محجوبانہ انداز میں مزاج پُرسی کی تو سعید نے رسمی طور پر شکریہ ادا کیا اور پھر یکایک
دیکھتے ہی دیکھتے، اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب بہ نکلا۔
زبیدہ نے حیران ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن سعید
کی یہ حالت تھی کہ ایک کمسن بچے کی طرح، ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔
صبر و ضبط کی وہ دیوار جس نے اب تک اُس کی آنکھوں کو خوں چکانی سے
روک رکھا تھا مسمار ہو چکی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اِن آنسوؤں کی روانی میں
اُس کے خونِ جگر کا آخری قطرہ بھی بہہ جائے تو اچھا ہے۔ وہ آگ جو مدت
سے اُس کے رگ و ریشہ میں سُلگ سُلگ کر اُسے نیم جاں بنا رہی تھی اب
ہوا کے ایک جھونکے سے شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ
ان شعلوں میں جل کر یکبارگی خاک سیاہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ زبیدہ تھرتھر
کانپ رہی تھی کہ اگر اس حالت میں کوئی آگیا تو کیا ہوگا۔ وہ ایک لمحہ میں سعید
کے دل کا راز پا چکی تھی۔ اُس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ سعید
اپنے آپ کو اُس کی خاطر یوں تباہ کر رہا ہے۔ اب جو اُس نے دیکھا کہ وہ
اپنی جوانی کے ایامِ بہار کو اُس کی یاد میں سوگوار بنا رہا ہے تو اُس کے لطف و
رحم کا فطری جذبہ فوراً بیدار ہو گیا اور ساتھ ہی اُن جذباتِ شوق میں حرکت
پیدا ہوئی جو سعید کے متعلق مدت سے زبیدہ کے دل میں موجود تھے اور
جنہیں وہ ہزار مصلحت اور کوشش سے دبا دبا کر اپنے خیال میں مٹا چکی
تھی۔ وہ شرم و حجاب کی بندشوں اور آداب و وضع کی پابندیوں کے حصار
سے دفعتاً چند منٹ کے لئے باہر نکل آئی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے سعید

کے آنسو پونچھے۔ الفاظ اُس کے حلق سے نکلتے نہیں تھے لیکن اُس نے اپنے آپ پر جبر کیا اور ٹھہر ٹھہر کر لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ "خدا کے لئے طبیعت کو سنبھالو۔ تقدیر کے خلاف جنگ نہیں کی جا سکتی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یوں رو رو کر اپنے آپ کو ہلاک کرنے سے کیا فائدہ۔ تم اپنا خیال نہیں کرتے تو میری ہی حالت کی پروا کرو۔ ذرا سوچو۔ اگر یہ راز عام ہو جائے تو میرا کیا حشر ہوگا۔ مجھے زمین و آسمان کے درمیان چھپنے کو جگہ نہیں ملے گی یاد رکھو میری آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی نکل گیا تو میں عمر بھر کے لئے تباہ ہو جاؤں گی"۔

ان آخری الفاظ نے سعید پر معجز نما اثر کیا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو فوراً خشک ہو گئے اور اس کے چہرے پر خشونت آمیز متانت پیدا ہو گئی۔ اُس نے انتہائی لجاجت کے ساتھ گویا بھکاری کسی امیر آدمی سے خیرات طلب کر رہا ہے کہا "میں تم سے ادنےٰ التفات کی بھیک مانگتا ہوں اور اُس کے عوض وعدہ کرتا ہوں کہ میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔ اگر تمہیں میرے خلاف کبھی کوئی وجہ شکایت ہوئی بھی تو میں اپنا گلا کاٹ لوں گا"۔

زبیدہ نے اُس کو یقین دلایا کہ "دل میں جب ایک مرتبہ شوق کی آگ بھڑکتی ہے تو بجھتی کبھی نہیں۔ چنگاریاں راکھ کے اندر دبی رہتی ہیں اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ یہ تنور ٹھنڈا ہو گیا۔ سمندر بظاہر پُرسکون نظر آتا ہے لیکن سطح کے نیچے شورش و اضطراب کا ایک محشر بپا ہوتا ہے۔ آؤ ہم اس وقت عہد کریں کہ شوق کے ان دھاروں کو خاموشی سے بہنے دیں گے۔ ان میں طوفان کا آنا اچھا نہیں۔ اس دنیا میں تو ہم آپس میں نہ مل سکیں گے لیکن ایک زندگی اور بھی ہے جہاں اس دنیا کے رسم و رواج کی حکومت نہیں"۔

زبیدہ کے پے درپے اصرار سے مجبور ہو کر سعید نے شادی کر لی۔ زبیدہ سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد سعید کے خیالات کا انتشار رفع ہو جائے گا اور اُس کی زندگی ایک نظام کے ماتحت کام کرنے سے باقاعدگی اختیار کرے گی۔ سعید مسلسل انکار کئے جاتا تھا لیکن زبیدہ اُسے بار بار دھمکی دیتی تھی کہ اگر اُس نے اُس کی بات نہ مانی تو وہ ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جائے گی۔ سعید کا خیال تھا کہ زبیدہ کی محبت کو دل میں جگہ دینے کے بعد کسی عورت سے شادی کرنا بے وفائی کی مکروہ ترین صورت تھی۔ وہ اُس کی یاد میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ آخر جب وہ زبیدہ کے روز روز کے تقاضوں سے تنگ آ گیا تو اُس نے حامی بھر لی۔ زبیدہ کے مشورے اور کوشش سے ایک بڑے اُونچے گھرانے میں رشتہ ڈھونڈا گیا۔ سعید کی بیوی تعلیم یافتہ، حسین اور مہذب و شائستہ تھی۔ لیکن متمول اور بہت حد تک مغربی معاشرت رکھنے والے کنبے میں پرورش پانے کی وجہ سے اُس کے مزاج میں نخوت اور خود پسندی کا عنصر غالب تھا۔

زبیدہ کو یقین تھا کہ خانگی زندگی کی دلچسپیاں آہستہ آہستہ سعید کے درد کا درماں بن جائیں گی۔ سعید بھی ایک ذمہ دار شوہر کی طرح اپنی بیوی کے آرام و راحت کا ہر گھڑی احساس رکھتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں اُمید بندھ چلی تھی کہ دونوں میاں بیوی باہمی کوششوں سے اپنے لئے ایک روشن و زرّیں مستقبل وضع کر لیں گے۔ سعید نے اگرچہ کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن وہ غیر شعوری طور پر متوقع تھا کہ اُس کی بیوی اُس کے دُکھے ہوئے دل کے لئے مرہم مہیا کرے گی۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے ماضی کی داستان سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس بات کا آرزومند تھا کہ وہ اُس کی لوحِ قلب سے غمِ رفتہ کے اندوہ گیں نقوش کو مٹانے کے لئے درد و محبت کے چند آنسو بہائے۔ وہ اُس سے دلجوئی، غم خواری اور شفقت و اُلفت کی اُمید لگائے بیٹھا تھا۔ لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اُس کے اور اُس کی بیوی کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ جس قدر خیال پرست اور جذبات پرور انسان تھا اُس کی بیوی اسی قدر خودنمائی اور خود پسندی کے دائرے میں محصور تھی۔ سعید کو علمی و ادبی کاموں سے دلچسپی تھی۔ وہ قومی معاملات اور سیاسی تحریکات سے بھی شغف رکھتا تھا۔ لیکن اُس کی بیوی کو ان باتوں سے کوئی وابستگی نہ تھی۔ وہ عام لوگوں کے مذاق کی ہم نوائی کرنا یا اُن کی سطح پر رہ کر زندگی گزارنا اپنے خاندانی وقار کے خلاف سمجھتی تھی۔ جس ماحول میں اُس نے تربیت پائی تھی اُس کا تقاضا تھا کہ وہ ایک بلند پایہ، صاحبِ ثروت، جاہ پسند خاتون کی طرح ایک تحکمانہ انداز اور شانِ خودآرائی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ سعید کا حساس دل غربت و افلاس اور مصیبت و ناداری کے تکلیف دہ مناظر دیکھ کر تڑپ اُٹھتا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش، ملک کے اندر، جہالت، غلامی، تنگدستی کی خوفناک تصویریں دیکھتا تو اُس کی روح کانپ کانپ جاتی تھی لیکن اُس کی بیوی اِن چیزوں سے بالکل اثر پذیر نہ ہوتی تھی۔ وہ سعید کی خیال آرائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ وہ ہمیشہ اُس کو تنبیہ کرتی تھی کہ ان بے سود اور مضر خیالات کو ترک کر دے۔ سعید حیران تھا کہ جو عقائد اُس کی زندگی کا جزو بن

چکے تھے اور جو رجحانات بڑھتے بڑھتے اُس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے تھے اُن کو ترک کرنے کے بعد اُس کے پاس رہ کیا جائے گا۔ زاویہ ہائے نگاہ کے اس اختلاف نے دونوں میں غلط فہمی پیدا کر دی اور اس غلط فہمی کو سعید کی بیوی کی متکبرانہ روش نے بڑھا بڑھا کر کشیدگی کی حد تک پہنچا دیا۔ سعید جو پہلے ہی دل گرفتہ و پریشان تھا اور زیادہ غمگین رہنے لگا۔

اتنے میں ترکِ موالات کی ہنگامہ خیز تحریک شروع ہو گئی۔ ہندوستان کی سیاسی فضا میں شعلے بلند ہونے لگے اور ملک کے طول و عرض میں انقلاب کی ایک ایسی زبردست رو چلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کہرام مچ گیا۔ کالج اور اسکول بند ہو گئے۔ وکلاء عدالتوں کو خیرباد کہہ کر میدانِ عمل میں نکل آئے اور قید و بند کا سلسلہ شدت کے ساتھ جاری ہو گیا۔ سعید سوچ رہا تھا کہ تحریک میں شرکت کرنے اور گوشۂ عافیت میں پناہ لینے میں سے کس کو ترجیح دے۔ ملک و ملت کے جس درد سے وہ ہمیشہ بے تاب رہا تھا اُس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وقت کی آواز پر بلا تامل لبیک کہا جائے لیکن اُس کی بیوی سدِ راہ ہو رہی تھی۔ سعید کچھ دیر اس کشمکش میں مبتلا رہا اور آخر قوم کی پکار کے سامنے اُس نے اپنی بیوی کی رائے کو ٹھکرا دیا۔ وکالت چھوڑ کر وہ قومی رضاکاروں کی جماعت میں شامل ہو گیا اور اُس کی بیوی ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی۔ سعید نے اس مستعدی اور سرگرمی سے کام کیا کہ گویا اُس کی زندگی کا تنہا مقصد یہی تھا۔ اُس نے اپنے صوبے کے دور دراز گوشوں میں جا جا کر عوام کو آزادی کا پیغام سنایا۔ تقریر و تحریر کے ذریعہ سے اُس نے جگہ جگہ قانون شکنی کے جراثیم پھیلا کر لوگوں کو حکومت کے خلاف صف آرا ہونے پر اُبھارا۔ انجام کار اُس کی سرگرمیوں کو خلافِ آئین قرار دے کر حکومت نے اُس پر بغاوت پھیلانے کا مقدمہ قائم کیا اور دو سال قید با مشقت کی سزا دے دی۔

جب وہ قید کی میعاد ختم کر کے جیل سے نکلا تو ملک کی حالت یکسر بدل چکی تھی۔ ترکِ موالات کی تحریک فرقہ وارانہ کشیدگی کے ہاتھوں سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ روشن خیال اور مخلص قومی کارکن کوئی واضح اور معین لائحہ عمل پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ سیاسیات سے کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے۔ سعید اس افسوس ناک ردِ عمل سے بے حد متاثر ہوا۔ اُس کی جسمانی صحت اور مالی حالت سخت نازک ہو گئی تھی۔ آئندہ کی فکر نے اُس کے مستقبل کو اور بھی تاریک بنا رکھا تھا۔ ان حالات میں اُس کو ہمدردی اور دل نوازی کی جائز توقع اگر کہیں سے ہو سکتی تھی تو اپنی بیوی سے۔ لیکن وہ سعید سے اس قدر ناراض تھی کہ اُس نے دو سال کے عرصے میں اُس سے ملنا یا اُس کو خط تک لکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ وہ سعید کے قید ہو جانے کو اپنی خاندانی عظمت و نجابت کے دامن پر ایک ایسا مکروہ دھبہ سمجھتی تھی جس کے لئے سعید ہرگز معافی کے قابل نہ تھا۔ اس مصیبت میں سعید کے خیالات کے تاریک اُفق پر رہ رہ کر زبیدہ کا درخشندہ چہرہ نمودار ہوتا اور اُس کے دل کو اُمید اور محبت کی شعاعوں سے منور کر دیتا تھا۔ لیکن وہ زبیدہ کے پاس جانے سے گھبراتا تھا۔ اُسے اپنی کمتری اور بے کسی کا احساس اس شدت سے ستا رہا تھا کہ وہ ڈرتا تھا کہ مبادا زبیدہ اُسے شرفِ ملاقات بخشنے سے انکار کر دے۔ اُس نے سنا تھا کہ زبیدہ نے پردہ ترک کر دیا ہے اور آج کل اپنے خاوند کے ہمراہ شملہ میں مقیم ہے۔ سعید کا ایک عزیز دوست بہ سلسلۂ ملازمت شملہ میں تھا اور سعید کی رہائی کے بعد اُس نے سعید کو دعوت دی تھی کہ گرمیوں کا موسم اُس کے پاس بسر کرے۔ چنانچہ سعید یہ سوچ کر کہ کچھ عرصہ پہاڑ پر قیام کرنے سے اُس کی صحت بہتر ہو جائے گی شملہ چلا گیا۔

مال پر اُسی طرح کھڑے کھڑے وہ شملہ کے تموّل اور حُسن کے بوقلموں نظارے دیکھ دیکھ کر اپنی حالت پر کافی غور کر چکا تھا۔ مختلف خیالات اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر آزادیٔ وطن کی تحریک اس قدر کمزور تھی تو اُس نے کیوں قید و بند کی مشقتیں جھیلیں۔ اگر اُس کے ہم وطن ملکی ضروریات سے اس قدر غافل اور قومی مصائب سے اس قدر بے پروا ہیں تو اُس نے کیوں جلتی آگ میں کود کر اپنے مستقبل کو تباہ کیا۔ اُس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے اور بعض اوقات وہ تحریکِ حریت کو ایک بے معنی ہاؤ ہو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ انہی خیالات میں محو وہ سڑک پر جا رہا تھا کہ سامنے زبیدہ آ گئی۔ سعید نے بچ کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن زبیدہ نے دیکھ لیا۔ چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد زبیدہ نے اُس کو اپنے مکان کا پتہ بتایا اور تاکید سے اُس کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز زبیدہ کے مکان پر جو باتیں ہوئیں اُنھوں نے سعید کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے۔ سعید کی مایوسی اور افسردگی کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اُس کے کان محبت اور ہمدردی کی آواز سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اُس کے تکدر و اضمحلال کا ایک بہت بڑا باعث یہ بھی تھا کہ آلامِ روزگار کے ہجوم میں اُسے کہیں سے تسکین و تشفی کا پیغام نہ ملتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جو لوگ کسی زمانے میں اُس سے محبت کرتے تھے اب

اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ احساس روز بروز قوی ہو کر اُسے خود اپنی نگاہ میں پست کر رہا تھا۔ زبیدہ نے سعید کی بیوی کا ذکر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اُسے واقعات کا علم تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ قصہ چھیڑ کر سعید کے دل کے سب سے نازک حصے کو تکلیف پہنچائے۔ سعید اپنے زمانۂ اسیری کے حالات سناتا رہا۔ سیاسی بحران اور اُس کے بعد کے واقعات پر بحث ہوتی رہی۔ ملک کی موجودہ کیفیت اور اپنے غیر یقینی مستقبل کے متعلق بھی سعید نے اندیشہ و اضطراب کا اظہار کیا۔ زبیدہ نے یہ دیکھ کر کہ سعید بے حد مایوس ہو رہا ہے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم بار بار کیوں کہتے ہو کہ دنیا سے محبت اور وفا کا وجود مٹ گیا ہے۔ یہ خیال بار بار کیوں دماغ میں لاتے ہو کہ تم نے تحریکِ موالات کی تحریک میں شامل ہو کر دور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا؟ کون کہتا ہے کہ ملک ایک دن میں آزاد ہو جائے گا یا قوم ایک دن میں غلامی کی زنجیریں کاٹ سکتی ہے؟ یاد رکھو یہ ایک طویل جدوجہد ہے جو خدا ہی جانتا ہے کب تک جاری رہے گی۔ یہ ایک طوفان ہے جس میں نہیں معلوم کب تک نئے نئے مدوجزر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں جوان اپنی جوانیاں قربان کریں گے۔ لاکھوں انسان اپنی زندگیاں نچھاور کریں گے۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حکومت کی بنیادیں متزلزل ہوتے ہوتے اور نظامِ کہنہ کی دیواریں گرتے گرتے زلزلے اور فتنے پیدا کریں گی۔ خون کی ندیاں بہہ بہہ کر وطن کی مقدس سرزمین کو گرد و غبار سے صاف کر ڈالیں گی اور پھر کہیں آزادی کا آفتاب طلوع ہوگا۔ کیا تمہارے لئے یہ اعزاز قابلِ فخر نہیں کہ تم حریت طلب جماعت میں سب سے پہلے شریک ہو گئے ہو؟ پانی کا بے مقدار قطرہ سمندر میں مل کر بحرِ بے پایاں کا لقب اختیار کر لیتا ہے اور ریت کا حقیر ذرہ ریگ زار میں سماتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ تم بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لے کر انفرادیت کے محدود حلقے سے نکل کر قوم کی اجتماعی قوت کی صورت اختیار کر گئے ہو اور یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے کس درد اور پریشانی کے ساتھ یہ دو سال گذارے ہیں۔ میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگا کرتی تھی کہ تمہارے ارادے کی مضبوطی اور تمہاری ہمت کی بلندی قائم رہے۔ جاں سپاری اور سرفروشی کا جو مسلک تم نے اختیار کیا ہے خدا اس میں استقامت بخشے۔ میں اگر اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں تو تم شاید سمجھ سکو کہ دنیا میں محبت اور وفا کا وجود باقی ہے یا یہ متاعِ گرانمایہ ختم ہو چکی ہے۔ میں نے پردہ ترک کر دیا کہ تمہاری غیر حاضری کے یہ دو برس کسی مفید کام میں صرف کر سکوں۔ میں نے ایک زنانہ مدرسہ قائم کر کے دن رات محنت کی۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے، سلائی کا کام کرنے اور دستکاری سکھانے سے میں نے دو ہزار کی رقم جمع کی کہ جب تم قید سے نکل کر آؤ تو میں سرخروئی سے تمہارا خیر مقدم کر سکوں۔ دنیا میں ایک ہی دل ہے جس میں تمہاری محبت ایمان کے درجے تک پہنچ چکی ہے۔ ایک ہی زبان ہے جس کا وظیفۂ حیات تمہارا نام ہے۔ تم جہاں بھی رہو گے اس دل کی تمنائیں اور اس زبان کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔"

سعید بے جان بُت کی طرح گُم سُم، پتھرائی ہوئی آنکھوں اور گھبرائے ہوئے حواس کے ساتھ سب کچھ سُن رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے اُس کے دل میں ایک طوفان اُٹھا اور پھر ساون کے مینہ کی طرح اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش شروع ہو گئی۔

وہ زبیدہ کے مکان سے نکلا تو اُس کے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ حزن و ملال اور اندوہ و یاس کے بادل چھٹ چکے تھے اور افق سے روشنی کی کرنیں پھُوٹ پھُوٹ کر شاہراہِ حیات کو منور کر رہی تھیں۔ اُسے منزلِ مقصود کے کنگرے صاف نظر آ رہے تھے۔

عاشق بٹالوی

شعر

وہ ہلکی ہلکی موجِ تبسم کی لرزشیں

جُنبش ہو جیسے چشمۂ آبِ حیات میں

آغا حشر کاشمیری

معراجِ تغزّل

کون آکر طور پر یہ جلوہ افشاں ہوگیا
میرے بت خانے کا ہر پتھر فروزاں ہوگیا

ہوگیا رازِ غمِ ہستی کا عرفاں، ہوگیا
میں نے تدبیرِ سکوں جب کی۔ پریشاں ہوگیا

جب ستارے چھپ گئے اور چاند پنہاں ہوگیا
وہ مرے دل کے اندھیرے سے نمایاں ہوگیا

خوئے تسلیم و رضا میری مروّج ہوگئی
ضبطِ آخر داخلِ آدابِ زنداں ہوگیا

عمر کتنی مختصر تھی، میرے دردِ آہ کی
دل سے اُٹھا، مُنہ سے نکلا اور پریشاں ہوگیا

چھین لیں فکرِ نشیمن نے مری آزادیاں
جذبۂ پروازِ محدودِ گلستاں ہوگیا

کیوں نظر اِس کی حقیقت کی طرف جانے لگی
کیا یہ انساں واقفِ اسرارِ انساں ہوگیا؟

ظرفِ صحرا کو ہے ضد جوشِ جنوں سے اِن دنوں
جانے کیا ہوگا جو ہر ذرّہ بیاباں ہوگیا

کس قدر صبر آزما تھا شعلۂ آوازِ حُسن
خود ہی موسیٰ کو پکارا خود ہی پنہاں ہوگیا

وہ شبِ فصلِ بہار، اور وہ مرے دل کی شگفت
اِک نظر اُٹھتے ہی ہر تارا غزل خواں ہوگیا

وسعتِ خاطر سلامت، ذوقِ آزادی بخیر!
جب قفس کو میں نے پھیلایا گلستاں ہوگیا

جاگ اُٹھے گورِ غریباں کے شکستہ مقبرے
چند تارے مل کے جب ٹوٹے۔ چراغاں ہوگیا

حسن کا اظہار تھا سعیِ نظر پر منحصر
میں نے جب چاہا، جہاں چاہا نمایاں ہوگیا

اتنا ہرجائی، جہاں دیکھو وہاں موجود ہے
باوفا اتنا کہ پابندِ رگِ جاں ہوگیا

آپڑی اک چھینٹ موجِ مدعا کی گود میں
بے کسی؟ مژدہ! کہ میں دنیا بداماں ہوگیا

یہ خرامِ ناز و پیہم گردشِ دامانِ ناز
اور اگر یہ عرصۂ محشر خراماں ہوگیا!

مجھ پہ ظاہر تھا، تو ظاہر تھا وہ تا حدِّ نظر
اور پھر اتنا ہوا پنہاں کہ پنہاں ہوگیا

اب کہاں سیماب، اب وہ زندگی اُس میں کہاں!
وہ تو کب کا کُشتۂ نیرنگِ دوراں ہوگیا

سیماب اکبرآبادی

سوچ

الٰہ آباد

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے؟ کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا! غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے دنیا کے دکھ یونہی رہیں گے
ظلم کے پھندے۔ پاپ کے بندھن اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا۔ جی کو جلانا یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا،

کیوں نہ جہاں کا دکھ اپنا لیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے۔ خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے ہم نہ رہیں۔ غم بھی نہ رہے گا

فیض

عہدِ مغلیہ میں فنونِ لطیفہ

فنونِ لطیفہ کی پرورش اور ترقی امن اور اطمینان چاہتی ہے۔ اور ان میں تراش خراش نفیس مذاق کی طالب ہے۔ مغلوں کے تین بادشاہوں کا زمانہ ایسا گذرا ہے جس میں مسلسل امن اور اطمینان رہا۔ یہ تین بادشاہ اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہان ہیں۔

عہدِ اکبری

تعمیر اکبر فنِ تعمیر میں بہت ستھرا مذاق رکھتا تھا۔ اس کا پہلا نمونہ اس کے باپ ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے۔ جسے دلّی والے بھول بھلیاں بھی کہتے ہیں۔ یہ عمارت اس سے پہلے کی عمارتوں سے بہت سی باتوں میں مابہ الامتیاز رکھتی ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر عالیشان عمارتوں کے نقشے بناتا اور اپنے دل و دماغ کے ایوانوں کو پتھر اور چونے کا جامہ پہناتا۔ ہمایوں کا مقبرہ جس کا ابھی ذکر ہوا اکبر کی ذہنی معماری کی اوّلین تشکیل ہے۔ یہ عالی شان عمارت سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ جس میں سنگ مرمر کی پچیکاری کی گئی ہے۔ گنبد تمام سنگ مرمر کے ہیں اور بالکل نئی قطع کے ہیں جو بعد میں مغلی گنبد کہلائے۔ فرگسن نے اس عمارت کی نسبت جو رائے قائم کی۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ نہ بعد کے نقاد اس کے ہم رائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گنبد کی وضع قطع میں شاہجہان کے ذوقِ سلیم نے اور ترقی کی۔ لیکن اکبر کی یہ پہلی کوشش بہر حال تحسین کی مستحق ہے۔

وہ عمارتیں جو اس فن میں اکبر کے ذوق سلیم کی آئینہ داری کرتی ہیں فتح پور سیکری میں موجود ہیں۔ حضرت سلیم چشتی کے مزار کی مسجد اور اس میں خاص کر مزار مبارک اکبر کی صناعی فطانت کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ مزار پر جو عمارت ہے وہ سنگ مرمر کی ہے۔ جس میں سیپ کی پچی کاری کی ہوئی ہے۔ کھڑکیوں میں مرمریں جالیاں نہایت خوبصورت ہیں۔ کارنسوں کے پیچے بلاشبہ ہندووانی وضع کے ہیں۔ پھر بلند دروازہ قابل دید ہے جو سنہ ۱۶۰۱ء میں خاندیس کی فتح کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ اس کو ہندوستان کے نہایت مکمل نمونوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنگ سرخ باد و باراں کے اثر سے پھیکا ہو کر گلابی ہو گیا ہے۔ اور خوب بہار دیتا ہے فتح پور سیکری میں بہت سی پبلک اور ذاتی استعمال کی عمارتیں ہیں جن کا ذکر طوالت چاہتا ہے۔ یہاں یورپین نقادوں کی ایک غلطی کی اصلاح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جسے دیوانِ خاص بتایا جاتا ہے۔ وہ اصل میں وہی عمارت ہے جہاں بادشاہ مختلف مذہبوں کے نمائندوں کے خیالات اور مباحثے سنا کرتا تھا اور جسے فارسی تاریخوں میں عبادت خانہ نام دیا گیا ہے

نقاشی نقاشی یا تصویر کشی کا فن ہندوستان میں نیا نہ تھا۔ جب ہمایوں لمبی غیر حاضری کے بعد ایران سے لوٹا تھا اور اپنے ساتھ چند ایرانی مصور لایا تھا۔ اس سے بہت پہلے ہندو مصور ایجنٹا کی قدیم نقاشی میں ترمیم کر چکے تھے۔ اور جموں۔ کانگڑا اور راجپوت مصوری کے سکول خوب ترقی سے چل رہے تھے۔ راماین اور مہابھارت کی ضخیم جلدیں باتصویر بن چکی تھیں۔ مذہبی مصوری کے علاوہ منظر کشی۔ فطرت کی نمائندگی اور روزانہ زندگی بھی ہندی استادانِ فن کی قلمکاری سے محروم نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا کہ ہمایوں اپنے ساتھ میر سجاد علی اور خواجہ عبدالصمد کو ایران سے لایا۔ میر سجاد علی ہرات کے مشہور استادِ فن بہزاد کا شاگرد تھا۔ اکبر کے عہد میں ہندی اور ایرانی فنونِ مصوری کی ترکیب سے ایک نیا سکول بن گیا جسے مغل آرٹ کہا جاتا ہے۔ قدامت پرست کٹھ ملاؤں نے ضرور مخالفت کی ہو گی۔ ورنہ ابوالفضل اس بارے میں اکبر کا یہ قولِ فیصل سپردِ قلم ہرگز نہ کرتا اکبر کا قول تھا۔

"ان لوگوں کی کمی نہیں جو نقاشی سے نافر ہیں۔ لیکن میں ان کو پسند نہیں کرتا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک مصور کو خداشناسی کا ایک خاص ذریعہ حاصل ہے۔ کیونکہ وہ جب کسی شے کی تصویر کھینچتا ہے جو ذی روح ہو اور اس کے اعضاء وغیرہ کا تناسب قائم کرتا ہے تو یقینی طور پر اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس وجود میں جان نہیں ڈال سکتا۔ لہٰذا لابُد ہے کہ وہ خدا کی عظمت کے آگے سر

جھکائے۔ اس طرح وہ خلاقِ عالم کے عرفان میں اپنا علم زیادہ کرتا ہے۔[1]"

اکبر ہندو آرٹ کا خصوصیت کے ساتھ مدّاح تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُن کی تصویریں ہمارے تصوراتِ اشیاء سے بالاتر ہیں۔ دنیا میں چند ہی تصویریں ہونگی جن کو اُن پر فوقیت حاصل ہو سکے۔ ہندو استادانِ فن میں سے ایک وحید العصر استاد جس کے آرٹ کے کمال نے اکبر کے دل میں گھر کر لیا تھا، وسوانا تھ تھا اس سے بھی بڑھ کر آرٹسٹ ایک ہندو مسمی بسلاون تھا۔ اس کی نسبت ابوالفضل کی رائے یہ ہے کہ پُشت تا پُشت منظر نمونہ خیال کی صحیح عکاسی۔ رنگوں کے توازن۔ صورت کشی اور نقاشی کے دوسرے شعبوں میں وہ وسوانا تھ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

اکبر اکثر نقاشوں کے نگارخانوں میں جایا کرتا اور آرٹ کے اچھے نمونوں کے لئے انعام دیا کرتا۔ آرٹ کے اس اکبری خزانہ یادگار میں ایک البم ایسا ہے جس میں بادشاہ اور اُمرائے سلطنت کی تصویریں ہیں۔ اکبر نامہ اور تزکِ بابری کی تصویریں اور رزم نامہ یعنی فارسی ترجمہ مہابھارت کی تصویریں شامل ہیں۔

موسیقی | تان سین اور مصری رام کے نام ہی دنیا دربارِ اکبری کے مذاقِ موسیقی کے اندازے کے لئے کافی ہے۔ ایک نے آواز اور دوسرے نے ساز کے علم کو معراج پر پہنچایا جسے موسیقی کی اصطلاح میں خیال کہتے ہیں وہ تان سین کا ایجاد[2] ہے۔

عہدِ جہانگیری

مصوری | جہانگیر نقاشی کے فن کا بڑا مبصر تھا۔ وہ دو مصوروں یعنی ابوالحسن اور منصور کا ذکر اپنی تزک میں کرتا ہے۔ جن کے آرٹ کا وہ خصوصی طور پر مداح تھا۔ ابوالحسن سے جہانگیر نے اپنی تزک کی لوح

نواتی جس کے صلہ میں اُسے خان زمان کا خطاب عطا کیا۔

جہانگیر کے عہد میں مغل سکول یورپین نقاشی سے متاثر ہوا۔ یہ یوں ہوا کہ مسیحی سوفسطائی پادری اپنے ساتھ بہت سی مذہبی تصویریں لائے تھے جن میں اکثر اطالوی استادوں کے شاہکار تھے۔ ان کی بہت تعریف ہوئی۔ ان سے دیسی فن پہ بہت اثر پڑا جو بیشتر حالت طبعی اور نیچر کی متابعت وغیرہ نکاتِ فن سے تعلق رکھتا تھا۔ سر ٹامس رو نے ہندوستانی نقاشوں کی نقل کے کمال کا ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے وہ یہ ہے کہ ٹامس ایک تصویر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہندوستانی مصوروں کی تعریف سُن چکے تھے۔ اُنہوں نے ایک تصویر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی اور کہا کہ اگر کوئی ہوبہو اس کی نقل اُتار دے تو وہ پچاس روپیہ[1] دینگے۔ اسی شام کو چھ تصویریں اس انگریزی سفیر کے سامنے رکھی گئیں مگر وہ اصل تصویر کو شناخت نہ کر سکا۔ برنیر لکھتا ہے کہ ہندوستانی مصوری نہایت دلچسپ ہے۔ وہ ان کی نقاشی۔ منظر نگاری اور مختصر کشی[2] کی تعریف کرتا ہے اگرچہ وہ چہرے کے حُلیہ کے تناسب میں نقص نکالتا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں مغل سکول منتہائے کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اب مصور ایرانی فنیت کی سخت قیود سے آزاد ہو گئے تھے جس نے اکبر کے عہد کے شاہکاروں میں جکڑاؤ اور گرانی پیدا کر دی تھی۔ جہانگیر کے عہد کی تصویروں میں یہ عیب نہیں۔ بلکہ نرمی اور نزاکت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اب ایرانی اور ہندوستانی اور یورپین اثرات نے مل جل کر ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ برنیر نے ایک ڈھال کا ذکر کیا ہے جس پر اکبر کی مہموں کی تصویریں اور جنگوں کے مناظر ہیں۔ اس کی تیاری میں سات برس لگے تھے۔ شہزادہ دانیال کی ایک رائے کے اقتباس سے اُس زمانے کے فنونِ لطیفہ کے ذوق کا اندازہ ہو سکے گا وہ قول یہ ہے:۔

"لیلیٰ مجنوں کی اُکتانے والی کہانیوں۔ پروانوں اور بلبل سے ہم سیر ہو گئے ہیں۔ شاعر اور آرٹسٹ کو وہ چیزیں اپنے موضوع کے لئے اختیار کرنی چاہئیں۔ جو ہم دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں[3]"

نقاشی کے بعد جہانگیر کی توجہ زیادہ تر باغوں کی طرف رہی اور اس کی شگفتہ ذوقی کے یہ نمونے سری نگر اور لاہور میں اب تک دل و دماغ کو تازگی

---

[1] یہ رقم اس زمانے میں ایک عمدہ تصویر کے لئے دربار سے مقرر ہو چکی تھی۔
[2] مختصر کشی استعمال ہوا ہے۔ مینیچر پینٹنگ کی جگہ [3] سٹڈیز ان انڈین پینٹنگ۔ این سی مہتہ[5]

---

[1] آئینِ اکبری ا۔ ۱۰۶

[2] ہمیں فاضل مقالہ نگار کے اس بیان سے اختلاف ہے کہ "خیال" تان سین کی ایجاد ہے کیونکہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے "خیال" کا موجد محمد شاہ رنگیلے کا درباری گائک ایک پٹھان تھا۔ جس کا فنی نام سدا رنگ ہے۔ معارف النغمات اور موسیقی کی دوسری مستند کتابیں ہمارے اس اختلاف کی شاہد ہیں۔ سدا رنگ سے پہلے ماہرینِ موسیقی دھرپد کی چیزیں گایا کرتے تھے اور تان سین اور بیجو باورا بھی دھرپد ہی کے ماہر شمار کئے جاتے ہیں۔ ادارہ

بخشتے ہیں۔ فنِ تعمیر سے وہ بالکل بے پروانہ تھا۔ لاہور کے قلعہ کی فردوسِ نظر موتی مسجد اس کی متبرک یادگار ہے۔

عہدِ شاہجہانی

شاہجہان کی دلچسپی نقاشی کی بہ نسبت فنِ تعمیر کی طرف زیادہ تھی اس کے عہد میں فنِ خطاطی میں بہت ترقی ہوئی اور طغرا نویسی میں بہت تراش خراش ہوئی۔ چنانچہ خطاطی کے بہترین نمونے ہم کو شاہجہانی عمارتوں میں ملتے ہیں۔ کوفی اور نسخ کے علاوہ نستعلیق کے نظر افروز نمونے ہم کو خاص کر اکبری عمارتوں میں بھی ملتے ہیں۔ شاہی ایوانوں میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتب خانے تھے۔ فادر مانریق کے قول کے مطابق ۱۶۴۱ء میں چوبیس ہزار جلدیں آگرہ کے شاہی کتب خانہ میں تھیں۔ اورنگ زیب کے بعد کی افراتفری میں ان سے بہت سی کتابیں تتر بتر ہو گئیں۔ اور تصویروں کے بہت سے البم یورپ پہنچ گئے۔ جہاں ان کے کمال مصوری و نقاشی کی بہت توصیف ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان مرقعوں کو دیکھ کر دوسروں کا تو کیا ذکر ہے۔ سر جوشوا رینلڈز اور ریمبران[ل] جیسے فن کے ناقد اور اُستاد حیران رہ گئے اور ہندوستانی نقاشی کی نزاکت اور خوبصورتی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ فنونِ لطیفہ کے یہ ذخیرے یورپ کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ لندن کے برٹش میوزیم اور وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم اور انڈیا آفس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس سلسلے میں انڈیا آفس کی ایک البم کا ذکر کیا جائے گا۔ جس کی ہستی نہایت الم ناک تلازم رکھتی ہے۔ یہ غم نصیب شہزادہ دارا شکوہ کی ملکیت تھی۔ اس پر یہ عبارت درج ہے۔

"یہ البم عزیزہ نادرہ بیگم کو شاہزادہ دارا شکوہ خلف شہنشاہ شاہجہان نے ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں ہدیۃً بھیجی۔"

شاہجہان کے عہد میں مغل نقاشی کا رُخ بہ وجوہ زوال کی طرف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو گویا وہ ختم ہی ہو گئی۔

تعمیر شاہجہانی عمارتیں اپنے بانی کی دقتِ نظر اور شُستہ مذاقی کا نمایاں ثبوت ہیں۔ یہ قریباً ساری اس وقت موجود ہیں جن کی تفصیل علیحدہ تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک دفتر چاہتی ہے۔ یہاں صرف تاج محل سے متعلق ایک امر کا ضمناً ذکر کرنا کافی ہوگا۔

یوروپین حضرات کو یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ تاج جیسی رُوح پرور اور حسین عمارت کو جو تمام دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ہندوستانی یا ایشیائی دماغ کا مولود تسلیم کریں۔ اُنہوں نے وِنیس کے ایک جیرم ویرونیو کی کہانی گھڑ کر لوگوں کو سنادی۔ کہ تاج کا خاکہ اس شخص نے بنایا تھا۔ یہ بات سو فسطائی پادری مانریق کے دماغ سے مترشح ہوئی جس کی شہادت اور ثبوت میں ایک حرف بھی پیش نہیں کیا گیا۔ اب یہ ظنی نظریہ دنیا نے منسوخ اور معقولیت سے خارج قرار دیا ہے۔

اس کے مقابلہ میں قسطنطنیہ کے ایک ترک استاد عیسیٰ کا جو نام لیا جاتا ہے۔ وہ بھی جچتا نہیں۔ کیونکہ تاج میں جو ہندوانی فنِ تعمیر کے آثار نمایاں ہیں وہ نہ اُس وِنیس کے معمار کے ذہن میں سما سکتے تھے اور نہ قسطنطنیہ کے تُرک اُستاد کے خیال میں آ سکتے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ تاج محل کا خاکہ خود بادشاہ ہی کے دماغ سے کاغذ پر صورت پذیر ہوا۔ میں اس رائے میں اکیلا یا پہلا شخص نہیں ہوں۔ نقادانِ فنِ تعمیر کی رائے ہے کہ آرائشی صنعت کاریوں سے قطع نظر تاج دہلی کے مقبرۂ ہمایوں کی ارتقائی یا ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور ہمایوں کے مقبرہ میں مرغول اور چاروں گوشوں کی بارہ دریاں یقیناً ہندوانی ہیں۔ یہ چیزیں تاج میں بھی موجود ہیں۔ شاہجہان ایرانی اور ہندوستانی دونوں طرزوں کو جانتا اور خوب سمجھتا تھا۔ اور سمرقند کے مقبروں کا بھی اس کو علم تھا۔ اس لئے قیاس غالب ہے۔ کہ تاج کا نقشہ شاہجہان ہی کے دماغ سے اُترا۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

ل Sir Joshua Reynolds. Rembrandt.

سرگوشیاں

آج رات
میرا دل
چاہتا ہے، تو بھی میرے پاس ہو!
اور سوئیں ساتھ ساتھ!

تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت!
آسماں بھی صاف ہے،
اور ستارے اور چاند
بے خود و سرمست ہیں!
تازگی
ہے عیاں
ذرے ذرے سے زمیں کے آہ! لیکن بے بسی!
اور تنہائی مری!

آج تو آجا، مری ہمراز بن!
آ بھی جا!
لے گھٹائیں آ رہی ہیں بے نشاں رفتار سے،
اور ان کالی گھٹاؤں میں ہے سرمستی، خمار،
اور پانی کے ہیں تار،
تو بھی آ
مل کے ہم

آج رات
گا ہی لیں چاہت کا گیت!

جسم بھی تیرا مجھے مرغوب ہے،
اور تیری ہر ادا!
اور یہ چہرہ ترا محبوب ہے!
تیری یہ پیاری جوانی اک اچھوتی سی کلی،
اور صورت سادی سادی سانولی،
اور ترے بالوں میں یہ چنبیا کے پھول،
اور نازک ہاتھ پر لپٹا ہوا گجرا ترا،
اور گلے میں ایک ہار!

آہ! تیرے سب سنگار
کھینچتے ہیں دل کے تار
اور اک ہلکی سی گونج
اس فضا کی وسعتوں میں کھو گئی!

آ مری ننھی پری!
آ، مری من موہنی!
آج رات
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو!

میراجی

اندیشہ ہائے دُور و دراز

لطف کی زندگی تمام ہوئی
صبحِ آسودگی کی شام ہوئی

بڑھ رہی ہیں سیاہیاں ہر سو — منتظر ہیں تباہیاں ہر سو
گرتا جاتا ہے پردۂ ظلمات — گم ہوئی جا رہی ہے راہِ حیات
تھرتھراتا ہے میرا قلبِ ضعیف — راہ پُر ہول، کائنات حریف
نہ کوئی راہبر، نہ راہنما — قسمت اندھی خدا ہے بے پروا
اور جانا ہے مجھ کو دُور بہت!

کوئی اختر نہیں فلک پہ کہیں — میری نزہت بھی میرے پاس نہیں
میری نزہت میری حیات کا نور! — میری تاریک کائنات کا نور!
تو اگر میری راہبر ہو جائے — ایک معراج یہ سفر ہو جائے
ہم زمان و مکاں کو چھوڑ چلیں — منزلِ ہست و بود طے کر لیں

عرشِ الفت مقام ہو اپنا
صبح و شب کا نظام ہو اپنا!

ظہیرُالدین ایم اے

پنگھٹ

ساون کے بھیگے بھیگے دن تھے۔ پُروا چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اُجڑا بے رونق اور اداس گاؤں بہشت کا ایک گوشہ بن گیا ہے۔ پھوار پڑتی تو یہ محسوس ہوتا کہ دنیا کا غم دل سے دُھلا جا رہا ہے۔ اور مور جھنکارتے تو ان کی دل نواز آواز سے دل جھومنے لگتا۔ دُھوپ نہ چھاؤں۔ گرمی نہ سردی۔ عجیب دن تھے اور عجیب سماں تھا۔ خواہش کے مطابق نہ سہی۔ ضرورت کی تمام چیزیں گاؤں میں مہیا ہو ہی جاتی ہیں اور نہ بھی ہوں تو بھی قدرت نے جذبات کے معاملے میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ اس لئے افلاس و تباہی کی گھنگھور گھٹاؤں میں بھی جذبات کی بجلی کوندتی تھی۔ جذبہ خوشی کا ہو یا غم کا۔ دیہات کی سادہ فضا میں جس طرح پرورش پاتا ہے اور اس کے اظہار کی جو نوعیت گاؤں میں ہوتی ہے۔ شہر میں وہ بات کہاں؟

ایک قیامت جس کا سامنا ہر چوماسہ میں کرنا پڑتا ہے۔ جھولا تھا۔ کم سن۔ اَلھڑ۔ بے باک اور شوخ بچیاں کہیں کہیں شرمیلی جوان کنواریاں مہندی رچی سہاگنیں دیوار کی اوٹ میں تھم گاڑے۔ . . . جو جھولے پر ہیں وہ جھول رہی ہیں۔ جو جھلا رہی ہیں وہ پینگ کے ساتھ ساتھ جھوم رہی ہیں اور ہلکے ہلکے سروں میں جن کے دھیمے پن میں خوف کی نہیں حیا اور غم کی جھلک ہے گا رہی ہیں۔ گاؤں کے سادہ جفاکش اور مسلسل کام کرنے والوں میں اہلِ دل اور اہلِ نظر کہاں؟ ہوں بھی تو منظر کی یکسانی وہ بُری بلا ہے کہ غالبؔ بہشت پر دوزخ کو ترجیح دیتا ہے ان کے نزدیک جھولا بے فکری لڑکیوں کا کھیل تھا یا سسرال سے میکے میں آئی ہوئی سہاگنوں کا دل بہلاوا۔ اس کی رومانیت سے وہاں کون واقف ہو۔ کوئی بہت فراخ دل بزرگ ہوئے تو مسکرا کر نکل گئے۔ گاؤں کے مرد گھروں میں آتے ہیں تو کسی ضرورت سے، اس لئے کبھی کبھی یہ نظارۂ رقصاں ساکن بھی ہو جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی لڑکی کسی کام سے چلی جاتی ہے لڑکیاں اطمینان سے ان دنوں میں جھولتی ہیں۔ جب بارش ہو رہی ہو یا پڑنے۔ اور چاول کی پود لگائی جائے۔ مرد سارا دن کھیتوں میں۔ بڑی بوڑھیاں گھر کے کام کاج میں۔ اور نوعمر لڑکیاں جھولے پر۔ ہلکی ہلکی پھوار۔ مست مست ہوا۔ رسیلے رسیلے گیت۔ حسنِ معصوم کے قہقہے اور چہچہے۔ جنت میں کیا ہوگا جو گاؤں میں نہیں؟

آہ: قدرت اپنی فیاضی کے جوہر کہاں دکھاتی ہے!

(۲)

لڑکیاں جھولے پر ہنستی ہی نہیں۔ روتی بھی ہیں۔ اور بعض بعض گیتوں پر تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں۔ یہ گیت یا تو سسرال میں ماں باپ کی یاد ——— یا میکے میں ساس نندوں کے مظالم کی داستان پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جھولا اس وقت "پھانسی" بن جاتا ہے اور گیت چبھتے ہوئے نشتر۔ اس کے بعد دل کا بوجھ جو ذرا ہلکا ہوا۔ تو پھر وہی چہچہے اور قہقہے۔

ایک دن بارش تھم چکی تھی۔ لیکن کھُلا نہیں تھا۔ سامنے صحن میں کچھ نوعمر لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ ان میں کنواری بھی تھیں اور سہاگنیں بھی۔ ایک سماں بندھا ہوا تھا اور ایک سَم چھا رہا تھا۔ ایک گیت جو ختم ہوا۔ تو کچھ دیر بعد ایک نئی سہاگن نے یہ گیت چھیڑ دیا۔

پنگھٹ سے لاگی پاسیاں

جھولے پہ جو جوڑی بیٹھی تھی۔ اس میں سے ایک گانے والیوں کا ساتھ بھی دے رہی تھی۔ اور پاؤں سے ٹھوکے دے دے کر دوسری سے بھی اشاروں اشاروں میں گلے سے گلا ملانے کو کہہ رہی تھی۔ دوسری لڑکی ——— چمپا نام تھا۔ تھی تو نہایت شوخ و طرار۔ لیکن اُسے نہ جانے اس وقت کیا چُپ لگی کہ نہ گانا تھا نہ گایا۔

باری ختم ہوئی۔ جھولا تھما۔ نئی جوڑی بیٹھی۔ چمپا جھولے سے اُتری ہے تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ لڑکیاں پینگ وینگ بھول گئیں پہلے تو سب نے حیرت سے چمپا کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسری پر معنی خیز نظریں ڈالیں۔ اس ہجوم میں جو بالکل چُپ چاپ تھا۔ نگاہوں نگاہوں میں خدا جانے کیا کیا باتیں ہو گئیں۔ چمپا نے بہت چاہا کہ ضبط کرے۔ لیکن آنسو تھے کہ اُمڈے آرہے تھے وہ جھلاتی رہی اور دوپٹے کے آنچل سے آنسو

بتی رہی۔ ساتھ کی کھیلی سہیلیوں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ہنسی ہنسی کے گیتوں کوئی رو دے اور سارا مزا کرکرا ہو جائے۔ گیت میں آخر رونے کی کونسی ت تھی۔ لڑکیوں سے خدا بچائے۔ جھولا تھما۔ تو اس مرتبہ ایک بحث چھڑ گئی ۔ چمپا نگاہوں کا نہیں زبان کا ہدف تھی۔

"کیوں بہن آخر تمہیں کیا ہوا؟"

"اے کہیں کنواری لڑکیاں بھی ایسے گیتوں پر روتی ہیں۔"

"روتی کیوں نہیں! ڈوم بجائے چپنی ذات دکھائے اپنی۔ یہ ہمیں نتق جتلانے لگی ہیں۔ بڑی آئیں "ہیر" کہیں کی۔ چلیں ٹسوے بہانے۔"

"کیا جانے اُس گیت پر نہ روئی ہوں۔"

"اجی رہنے دو۔ بھلا کوئی بات ہے۔"

چمپا سوال جواب کے اس بکھیڑے میں بُت بنی کھڑی رہی۔

(۳)

رات کو گھر گھر یہی چرچا تھا۔ کنواری لڑکی اور ایسے گیت پر روئے ال میں کچھ کالا ہے۔ ہزار مُنہ اور ہزار باتیں۔

"چمپا تو ایسی لڑکی نہیں"

"جو دیکھی نہیں وہ بھلی"

"موئی پانی بھرنے جاتی ہے یا آنکھ مٹکا کرنے"؟

"خدا کی پھٹکار ہو ان نئی پود کی لڑکیوں پر"

"اے بہن۔ ہے بھی تو غضب۔ جوان جہان ہے۔ ماں باپ کے دیدے پھوٹ گئے ہیں کیا۔ کہیں ٹھکانا کیوں نہیں کر دیتے۔"

"نہیں کرتے تو کیا کنواریاں بھرے دربار اور بیچ بازار یوں ٹسوے بہایا کرتی ہیں۔ بس بی رہنے دو۔ آئیں حمایت لے کے۔"

"لو بی اور سنو۔ دیر سویر ہر کام میں ہوتی ہے۔ ہونہہ کلچھنی کہیں کی"

غرض رات کیا آئی۔ چمپا کے خلاف ایک اچھی خاصی "فردِ جرم" مرتب کرلائی۔ گھر والیوں تک بھی بات پہنچی۔ بہتیری صفائی پیش کی گئی۔ لیکن گاؤں والیوں کی زبان کون پکڑتا اور وہ کیوں چُپ ہوتیں۔ ان کے دامن داغدار نہ تھے۔ مصلحت کو ان کے کیریکٹر میں راہ کیوں کر ملتی۔ گاؤں کے اخلاق کی اجارہ دار یہ تھیں۔ اس حرکت پر کیوں نہ جلتیں کڑھتیں اور کیوں نہ چمپا کے ساتھ اس کے گھر والوں کو بھی کھری کھری سناتیں۔ بہو بیٹی سب کی یکساں ہے۔ آج یہ کل وہ۔ عیب باہر سے تو نہیں آتے اور آج چمپا کے معاملے میں دخل نہ دیا گیا۔ تو کل کو ساری لڑکیوں کے لئے راہ کھُل جائے گی؛ الزام طنز اور جواب دہی کے تقاضوں سے گھبرا کر آخر جب چمپا کی گھر والیوں نے یہ کہہ دیا کہ کل سے چمپا پانی بھرنے نہیں جائے گی۔ تو کھُسر پھُسر کچھ کم ہوئی۔ لیکن اس فیصلے نے گاؤں والیوں کے شک کو یقین سے بدل دیا۔

(۴)

چمپا کے دل میں بھری برسات میں آگ لگ رہی تھی اور بجھنے کی کوئی صورت تھی بھی تو وہ مٹ چکی تھی۔ اب بھڑکنے کا اندیشہ تھا۔ وہ اُس گھڑی کو پچھتا رہی تھی کہ جھولے پر گئی اَن ہونی ہونی ہوئی اور اَن کہنی سُنی۔ "پنگھٹ والا" آرام سے ہے۔ جس کے دل کو لگی ہے وہ جانے۔ پانی بھرنا یوں بند ہوا۔ جھولے پر کیا منہ لے کر جائے۔ اور جانے بھی تو ایک بار کے جانے سے یہ کچھ ہوا۔ دوسری بار نہ جانے کیا ہو۔ یہ دن! آہ یہ دن گھر میں گھُٹ گھُٹ کر مرنے کے نہ تھے۔ کہاں جائے اور کیا کرے۔

پنگھٹ پر جانا نہ جانا تو برابر تھا۔ "پنگھٹ والا" گاؤں سے پہلے ہی جا چُکا تھا۔ چمپا کو پنگھٹ سے دلچسپی تھی تو اتنی کہ وہ اِدھر سے آتا تھا یہاں کھڑا ہوتا تھا۔ یوں مسکراتا تھا۔

"چمپا گھڑا اُٹھواؤں"

اکیلی پاکر یہ بھی کہہ گزرتا تھا۔ اور اسکے تیوری چڑھانے پر مسکرا کر اُدھر کو چلا جاتا تھا۔

جب چمپا کا تصور ذرا شدید ہوتا۔ تو وہ کبھی کبھی کنوئیں کی جگت پر کھڑے کھڑے کمر نہیوڑائے۔ ایک پاؤں ڈول کی لج (ڈور) پر رکھے ایک ہاتھ میں لج کسی قدر ڈھیلی گرفت سے پکڑے گنگنایا کرتی۔

دل برسے بادل سار
میرے تم کے تلے کی ایسی مٹی
بوند پڑے رس جائے
دل برسے بادل سار
تری جُوتی اُوپر چکن مکن
تری پگیا جیسے مور رے
دل برسے بادل سار
میرے تم کے تلے کی مٹی ایسی
بُوند پڑے رس جائے

یہ گیت اُسے بہت پسند تھا۔ اس میں "پنگھٹ والے" کی ہکی

سی تصویر تھی۔ چکن والی جوتی اور مایادار پگڑی اس ڈھب سے بندھی ہوئی کہ طرہ۔ پگڑی اور شمد ل کر نور معلوم ہو اور جھولے پر وہ زیادہ یہی گیت گاتی تھی۔ یہ سہانوں کا عام گیت ہے۔ لڑکیاں بھی شرما شرما کر گا ہی لیتی ہیں لیکن اس دن یہ گیت ختم ہوا ہی تھا کہ چمپا کے تصورات کی دنیا میں "پنگھٹ والا" اپنی چکن دار جوتی پہنے اور نور جیسی پگڑی باندھے پنگھٹ کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا چمپا کے نازک احساسات غم پذیری سے اس قدر رقیق ہو رہے تھے کہ جونہی یہ گیت

پنگھٹ سے لاگی یاریاں

شروع ہوا۔ چمپا کا بھرا ہوا دل آنسو بن کر آنکھوں میں آ گیا۔ بات یہ تھی اس چیت سے پنگھٹ والا غائب تھا اس کے گھر کی حالت عام گاؤں والوں کی طرح خراب تھی۔ نہ جانے کدھر نکل گیا۔ کوئی خیر نہ خبر۔ خط نہ پتر۔ اور ہو بھی تو اس کے گھر والے جانیں۔ چمپا کو کیا معلوم۔ وہ اس کے لئے رو سکتی تھی۔ لیکن اس کا نام زبان پر کیوں کر لاتی اور لاتی تو پھر دنیا کی زبان کیونکر پکڑتی۔ شکر یہ ہوا کہ وہ اس وقت گاؤں میں نہیں تھا۔ کسی اور کی طرف چمپا رخ نہ کرتی تھی۔ ورنہ جیسے دل کا راز آنکھوں تک آ گیا تھا۔ رسوائی میں کیا کسر تھی؟ اب اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ لگی ہے؛ لیکن یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ کس سے لگی ہے؛ پنگھٹ پر کسی کا نام تو نہیں لکھا۔

(۵)

ایک دن بستی میں شور مچا کہ چھجو کے نام بیس روپے کا منی آرڈر آیا ہے۔ لڑکا کہیں اچھی جگہ نوکر ہو گیا ہے۔ اب ماں باپ کے گھر سے ہیں۔ دس روپیہ مہینہ بھی آئیگا۔ تو سب دلدر دور ہو جائیں گے۔ کما پوت ہے کمر باندھ کر نکلا ہے۔ چھجو کو روپے نہ آئیں گے تو کس کو آئیں گے

چمپا کے کانوں میں بھنک پڑی۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ جھولے پر آج بھی لڑکیاں وہی گیت گا رہی تھیں۔

پنگھٹ سے لگی یاریاں

چمپا چرخے پر بیٹھی تھی۔ وہ یہ گیت سن رہی تھی اور مسکرا رہی تھی "پنگھٹ والے" کی خبر تو آئی، وہ بھی آ جائیگا۔ لیکن وہ تڑپ بھی رہی تھی کہ کسی طرح چھجو کے ہاں جائے۔ ادھر اُدھر دیکھ کر اُس نے اپنا تکلا ٹیڑھا کر لیا۔ چھجو کی عورت کا ہاتھ تکلا سیدھا کرنے میں بڑا صاف تھا۔ چمپا نے مال نعیلی کر کے تکلا بڑیوں میں سے نکالا۔ چرکھ دمکڑا اس میں سے نکال کر ہاتھ میں لئے لئے دوڑی دوڑی گئی۔ چچی ذرا تکلا سیدھا کر دینا۔ چچی کے ہاں آج عید تھی بیٹے کی خیریت کے ساتھ روپیہ بھی آیا تھا۔ گھر کے گرے ہوئے پائے ٹوٹے ہوئے کولے اور بے ہنگم در و دیوار آج مسکراتے نظر آ رہے تھے چمپا کے ہاتھ سے تکلا لے کر چھجو کی بیوی زمین پر بیٹھ گئی اور اُسے سیدھا کرنے لگی۔ آنے جانے والیوں سے باتوں باتوں میں چمپا نے سب کچھ معلوم کر لیا۔

جھولے والی بات آئی گئی ہو گئی۔ اس لئے کہ "پنگھٹ والا" تو گاؤں سے باہر اور اس دوران میں چمپا کو کسی لڑکے سے تو در کنار کسی عورت سے بھی کھل کر بات کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بات آگے چلتی تو کیونکر۔ جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ لیکن چمپا کے دل میں طعن و تشنیع اور ہلکی سی رسوائی کی ایک کسک باقی تھی۔ وہ بھی اس طرح مٹنے لگی۔ کہ اٹھوارے بھر میں ایک آدھ مرتبہ کسی بہانے سے چمپا چھجو کے ہاں جاتی کوئی خط پتر آیا ہوتا تو اُسے بھی "پنگھٹ والے" کی خیر خبر معلوم ہو جاتی۔

(۶)

ادھر چمپا کی خاموش اُجڑی ہوئی دنیا پھر آباد ہو رہی تھی۔ اُدھر قسمت کچھ اور تانا بانا تن رہی تھی۔ دیوالی کے بعد گیہوں کا بوارہ پڑا ہی تھا کہ چمپا کا ایک جگہ پیام لگا۔ ماں باپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ گھر اچھا ہے بر بھی اچھا ہے۔ کچھ زیادہ دور کی بات بھی نہیں۔ چار پانچ کوس کا فرق ہے سمدھیانے کے لوگ ملنسار بھی ہیں اور غریب طبیعت بھی۔

اب کیا ہوگا؟ چمپا دُلہن بنے گی۔ سہاگ رات دیکھے گی ساتھ کی کھیل سہیلیوں کو ایک بات ہاتھ آئی۔ اُنہوں نے ایک اُدھم مچایا۔ وہ چمپا کی جان کو آ گئیں۔ چمپا کھچتی۔ کڑھتی۔ اس لئے کہ یہ پیام اس کے لئے پیام موت تھا اور سہیلیاں اُسے زیادہ چھیڑتیں۔ کہ شرماتی لجاتی ہے۔ اسے ذرا اور بنائیں۔ ایک دن تمام کی تمام اس کے سر ہو گئیں۔ جھولا تو اب نہ تھا۔ تیجن میں لے گئیں۔ رات بھر کاتا اور رات بھر گیت گائے گئے۔ اب چمپا کا راستہ سہیلیوں کی نظروں میں صاف تھا۔ کوئی روڑا نہ تھا کوئی اونچ نیچ نہ تھی اب ڈر کیسا؟ ایک شریر لڑکی نے دوسری کے کان میں کہا ذرا وہ گیت تو چھیڑو۔

پنگھٹ سے لاگی . . . . . .

دوسری نے جھڑک کر پہلی کو خاموش کر دیا۔ کہ اتنے دن بعد تو بے چاری کا آنا جانا کھلا ہے اور پھر اب کیا ہے۔ کنوارپنے کی بات اور ہے اب خیر سے وہ بیاہی جائے گی۔ دنیا جھک مارتی ہے تو مارا کرے۔ چمپا کا دامن

پنگھٹ پر

کنول

سایہ ۔۔۔۔؟

بالکل صاف ہے۔

چمپا کے دل کی کون جانے۔ اس کا آنا جانا کھل گیا تھا۔ لیکن دل کی گرہ نہ کھلی تھی۔ من کی لگی بھڑک رہی تھی۔ حیا بولنے نہ دیتی تھی۔ وفا جینے نہ دیتی تھی۔ دن پہاڑ کی طرح بھاری اور راتیں قبر کی طرح اندھیری تھیں۔ گھر میں چمپا کے بیاہ کا تذکرہ ہوتا۔ تو اس کے سینے پر سانپ لوٹتے۔ وہ اس مصیبت سے کیونکر بچے گی۔ اس کا محبوب یہاں نہ تھا۔ اس کی آس تو تھی لیکن اب وہ بھی ختم ہو رہی ہے۔ کیا چمپا غیر کی ہو کر جی سکتی ہے وہ کیا کہے گا کہ منہ دیکھے کی محبت تھی۔ آنکھیں پھیرتے ہی دل بھی پھر گیا۔ کیا وہ واپس آ کر یہ سُن سکے گا۔ کہ چمپا کسی اور گھر کی ہو گئی۔ وہ گھر سے بے گھر ہوا تو میرے لئے۔ پردیس گیا تو میرے لئے۔ پرائی تابعداری قبول کی تو میری خاطر آئے گا تو کیا کہے گا؟

(۷)

بھادوں میں پڑ رہی تھیں۔ دانت سے دانت بج رہا تھا۔ ایک دن صبح سویرے ایک کہاری گھبرائی ہوئی چمپا کے گھر آئی اور گھر والوں سے کہا۔

"پنگھٹ پر چمپا مری پڑی ہے"

کوئی دس دن گذرے تھے۔ کہ چھجو کا لڑکا گاؤں میں پہنچا۔ اُس نے سب کچھ سُنا۔ جھولے پر چمپا کا رونا۔ پھر اس کا پیام۔ پھر اس کی موت۔ اُس سے کسی نے سلسلہ بیان نہیں کیا۔ اس لئے کہ بیچ کی کڑی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ لیکن چھجو کا لڑکا سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ ڈیرہ پر واپس نہیں گیا۔ کچھ دن چُپ چپ رہا۔ اب دن بھر پاگلوں کی طرح پنگھٹ اور مرگھٹ کے درمیان۔ یہی۔ گیت گاتا پھرتا ہے۔

پنگھٹ سے لاگی یاریاں

وقار انبالوی

غزل

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر
مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر

اے تو کہ شرارت سے نہیں پاؤں زمیں پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ
پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

حالاتِ جدائی الم انگیز نہیں ہیں
لکھا ہے ترا نام مری لوحِ جبیں پر

یہ بھیگی ہوئی رات یہ کیفیتِ عرفاں
چاہوں تو ستارے بھی اتر آئیں زمیں پر

ہاں ہم نے ہی کھائے ہیں دلِ زار پہ چرکے
ہم قتل بھی ہو جائیں تو الزام ہمیں پر

لہجے کی درشتی لبِ نازک پہ گراں ہے
اوراقِ سمن صرف نہ کر لفظِ نہیں پر

وہ میرے لئے موردِ الزامِ محبت
آتا ہے ترس شاد مجھے حسنِ حزیں پر

شاد عارفی

غزل

اُٹھ اُٹھ کے بگولے مجھے کرتے ہیں اشارے
ہیں کتنے دلآویز یہ صحرا کے نظارے

آنسو کے تلاطم میں ہے اُمید کی کشتی
کب دیکھئے لگتی ہے یہ دریا کے کنارے

سن آئے ہیں لو حضرت واعظ کا بھی ہم وعظ
جس طرح کہ سویا ہوا سوتوں کو پکارے

دن فکر میں شب فکر کے بہلانے میں گذری
کچھ زیست کے ایام بھی یوں ہم نے گذارے

جس طرح کہ منزل کا مسافر کو یقیں ہو
بیٹھا ہوں تری راہ میں لو پاؤں پسارے

تصویر کے ہر رخ پہ حقیقت کی جھلک ہے
کچھ ایسے مصور نے ترے نقش اُبھارے

مندر کے جھروکوں سے چمک جیسے ہو ظاہر
کافر کی نگاہیں تھیں کہ بجلی کے شرارے

کشفی کی طرح کون وفادار ملے گا
جو توڑ کے لادے تجھے گردوں کے ستارے

کشفی ملتانی

بارش کے بعد پرندوں کی کیفیت

نغمے سنئے چمن کے طیّاروں کے — بیٹھے ہیں جو آغوش میں گلزاروں کے
بھیگے ہوئے جب پروں کے موتی سُوتے — نکھرے کچھ اور رنگ منقاروں کے

بالائے شجر انجمن آرائی ہے — نغموں سے فضائے باغ گرمائی ہے
کچھ دیر ہوئی گھرا تھا ابرِ دُربار — اب کیف و سرور کی گھٹا چھائی ہے

کچھ دور اڑے، چہک کے پھر لوٹ آئے — بیٹھے اور زمزموں کے مینہ برسائے
نازک شاخیں پکڑ کے پنجوں میں کبھی — جھولا جھولے، حسین پَر پھیلائے

شاخیں چھوڑیں، بلند پروازی کی — چہکے، کچھ دیر تک ہوا بازی کی
پر جوڑ کے تیر کی طرح گلشن میں — اترے، اور داد دی خوش آوازی کی

صحنِ گلشن سے مست و سرشار اڑے — بیٹھے رہے دو چار تو دو چار اُڑے
پلٹے جا جا کے آشیانوں کی طرف — اس طور سے پھولوں کے گرفتار اُڑے!

مرزا عباس بیگ محشر

جاپانی لڑکیوں کا تخیل

آج کل نوجوانوں کے خیالات کو جس قدر وقعت سے دیکھا جاتا ہے پہلے کسی زمانے میں انہیں یہ وقعت حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے خیالات میں مدبّرین اور معلمین کو تعلیم اور ماحول کے اثرات کا صحیح تعین کرنے کا بہترین مواد مل جاتا ہے۔ نیز ان کے افکار میں مستقبل کے نظام کی جھلک نظر آجاتی ہے کیونکہ آگے چل کر ملکی نظام کے ہر شعبے کی باگ انہی کے ہاتھوں میں آنے والی ہے۔ اُس وقت ہر جگہ انہی کا تخیل کار فرما نظر آئے گا۔ موجودہ تعلیم کے اثر سے عورتیں گھریلو دائرے سے نکل کر پبلک میں آنے لگیں تو ان کی آراء کو بھی وقعت سے دیکھا جانے لگا۔ ساتھ ہی نوجوان لڑکیوں کے خیالات کی جستجو ہونے لگی۔ بوڑھوں اور جوانوں کے خیالات میں ہمیشہ تصادم رہا ہے۔ جہاں جوانوں کے خیالات سطح پر آجاتے ہیں وہاں سوسائٹی میں تازگی کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور زندگی میں ولولہ باقی رہتا ہے۔ مگر جس سوسائٹی میں بوڑھوں کا اثر جوانوں کو ابھرنے نہیں دیتا۔ وہاں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور ایک قسم کی مُردنی سی چھا جاتی ہے۔ زندگی کے جوش کو قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ جوانوں کے خیالات کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور روشِ زمانہ کا اندازہ لگا کر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

یہاں جاپانی لڑکیوں کے تخیل کا آئینہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ خیالات ٹوکیو کے ہائی اسکولوں کی اعلیٰ جماعت کی طالبات کے ہیں جن کی عمر پندرہ سولہ برس سمجھنی چاہیئے۔ زندگی کے مختلف شعبوں پر چند سوالات مرتب کرکے اُنہیں لڑکیوں کے سامنے جواب دینے کے لئے رکھا گیا۔ جو جوابات اُنہوں نے دیئے ان کا اوسط فی صدی کے حساب سے لگایا گیا وہی یہاں ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے جاپانی خواتین کی نئی پود کا تخیل معلوم ہو جاتا ہے جس سے زمانے کی روش کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ مذہب

جواب فی صدی

سوال	ہاں	نہیں
(۱) کیا تم حقیقت میں دیوتاؤں کے وجود پر ایمان رکھتی ہو؟	۷۱	۲۹
(۲) کیا تم دوزخ اور جنت کے وجود پر ایمان رکھتی ہو؟	۷	۹۳
(۳) کیا تمہارا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد نیک آدمی جنت میں چلے جاتے ہیں اور بد آدمی اسفل السافلین میں؟	۲۴	۷۶
(۴) کیا تمہارا ایمان ہے کہ اعتقاد اور دعا سے بیماری اچھی ہو سکتی ہے؟	۴۰	۶۰
(۵) کیا تمہارا ایمان ہے کہ انسان کی روح موت کے بعد زندہ رہتی ہے؟	۴۱	۵۹
(۶) کیا تم بھوتوں کے وجود پر ایمان رکھتی ہو؟	۴	۹۶
(۷) کیا تمہارا ایمان ہے کہ لومڑیاں اور بجو انسان پر جادو کر سکتے ہیں؟	۸	۹۲
(۸) کیا تمہارا ایمان ہے کہ مذہب انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے؟	۱۰۰	×

۲۔ خاندان

سوال	جواب فی صدی
(۹) اگر تمہارے والدین کی ہدایات میں اور تمہارے استاد کی ہدایات میں اختلاف ہے تو تم کونسا راستہ اختیار کرو گی؟ (الف) جو تمہارے والدین نے بتایا ہے یا (ب) جو تمہارے استاد نے بتایا ہے یا (ج) جو تمہارا ضمیر بتاتا ہے؟	(الف) ۱۵ (ب) ۱ (ج) ۸۴

(۱۰) اگر تمہاری ماں کی رائے تمہارے باپ کی رائے — باپ ۵
سے مختلف ہے تو تم کیا کرو گی؟ ماں کی رائے پر عمل کرو گی یا — ماں ۵
باپ کی رائے پر یا اپنے ضمیر کے کہنے پر؟ — ضمیر ۹۰

(۱۱) اگر تمہارے والدین کا مشورہ تمہاری رائے
کے خلاف ہو تو تم کیا کرو گی؟ (الف) کیا تم اپنے والدین — (الف) ۷۱
کی خاطر اپنے خیالات ترک کر دو گی یا (ب) اپنی رائے پر قائم رہو گی؟ — (ب) ۲۹

(۱۲) اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہر پہلو سے دیکھتے
ہوئے تمہارے والدین ہی کی رائے غلط ہے تو کیا پھر بھی — والدین ۵
تم ان کی رائے پر چلو گی؟ یا تم صداقت اور انصاف کا راستہ — صداقت ۹۵
اختیار کرو گی؟

(۱۳) کیا تم اپنے والدین کی خدمت انجام دینے کے لئے
شرمناک سے شرمناک فعل انجام دینا منظور کر دو گی؟ — ۱۵ ہاں ۸۵ نہیں

۳۔ شادی وغیرہ

(۱۴) مندرجہ ذیل صفات میں سے تمہیں کونسی تین
صفات اپنے ہونے والے شوہر میں پسند ہیں؟ شخصیت،
قابلیت، شکل، تعلیم، دولت، صحت، حیثیت۔

۹۴ اول شخصیت
دوئم صحت
سوئم تعلیم
چہارم حیثیت
۶ پنجم دولت
ششم شکل

(۱۵) کیسے خاندان میں شادی کرنا پسند کرو گی؟ ساس — ۴۴ ساس سسرے والا
سسرے والا خاندان یا بغیر ساس سسرے کا خاندان؟ — ۵۶ بغیر ساس سسرے کا

(۱۶) کہاں شادی کرنا پسند کرو گی؟ شہر میں یا دیہات — ۵۵ شہر
میں؟ — ۴۵ دیہات

(۱۷) کیا تم کسان کی بیوی بننا پسند کرو گی؟ .. — ۳۳ ہاں ۶۷ نہیں

(۱۸) مندرجہ ذیل دو اشخاص میں سے تم کسے شوہر بنانے
کے لئے انتخاب کرو گی؟ (الف) یونیورسٹی کا گریجوایٹ بغیر — (الف) ۹۱
جائیداد کے یا (ب) لکھ پتی صرف ابتدائی تعلیم پائے ہوئے؟ — (ب) ۹

(۱۹) آزادانہ شادی (یعنی ذمہ دار مشاطہ کی مداخلت
کے بغیر) کو اچھا سمجھتی ہو یا برا؟ .. .. .. — ۱۸ اچھا ۸۲ برا

(۲۰) دونوں قسم کی شادیوں میں سے تمہیں کونسی
پسند ہے؟ آزادانہ شادی یا مشاطہ کے توسط سے شادی؟ — ۷۰ مشاطہ کے توسط سے — ۳۰ آزادانہ

(۲۱) اگر تمہارے والدین اور بزرگ کسی ایسے شخص سے
تمہاری شادی کرنا چاہیں جو تمہیں ناپسند ہے تو کیا کرو گی؟ — ۱۳ شادی
کیا تم شادی کر لو گی یا انکار کر دو گی؟ — ۸۷ انکار

(۲۲) کیا تمہارے نزدیک عورت کا شادی کئے بغیر — ۷۱ ہاں
زندگی بسر کرنا کوئی شرمناک فعل ہے؟ — ۲۹ نہیں

(۲۳) کیا تم ساس سسرے سے علٰحدہ ہو کر اپنے — ۵۲ ہاں
شوہر کے ساتھ آزادانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہو؟ — ۴۸ نہیں

۴۔ پیدائش اولاد

(۲۴) اگر تمہارے ہاں ایک بچے سے زیادہ پیدا ہونا — ۹۸ لڑکا
ناممکن ہو تو تم کیا انتخاب کرو گی؟ لڑکا یا لڑکی؟ — ۲ لڑکی

(۲۵) تمہیں کتنے بچے پسند ہیں؟ . . . .

بچے	فی صدی
ا بچہ	صفر فی صدی
۲	۱
۳	۱۳
۴	۳۰
۵	۴۲
۶	۴
۷	۲
۸	۱

(۲۶) کیا تم سمجھتی ہو کہ بچوں کے بغیر زندگی بے کیف ہوتی ہے؟ — ۹۸ ہاں ۲ نہیں

(۲۷) کیا تم سمجھتی ہو کہ جتنے زیادہ بچے پیدا ہوں اتنی — ۹۶ ہاں
ہی زندگی زیادہ خوشگوار ہوتی ہے؟ — ۴ نہیں

(۲۸) کیا تم سمجھتی ہو کہ ضبط تولید پسندیدہ فعل ہے؟ — ۲۱ ہاں ۷۹ نہیں

(۲۹) کیا تم سمجھتی ہو کہ والدین کو حق حاصل ہے کہ وہ — ۸۸ ہاں
بڑھاپے میں اولاد سے خدمت کی توقع کریں؟ — ۱۲ نہیں

(۳۰) کیا تم والدین کے اس فعل کو غیر ذمہ دارانہ سمجھتی
ہو کہ اس کے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے بچے زندگی — ۸۴ ہاں
میں پھل پھول نہیں سکتے پھر بھی بچے جنتے جاتے ہیں؟ — ۱۶ نہیں

(۳۱) تمہارے نزدیک گھر میں لڑائی جھگڑے
کے خاص اسباب کیا کیا ہیں؟

(۱) بچے نہ ہونا
(۲) دولت کی زیادتی
(۳) عزت
(۴) بیوی یا شوہر کی خود غرضی

(۵) بیوی کی زناکاری
(۶) بیماری یا نقص صحت
(۷) شوہر اور بیوی کے تخیل میں
عدم موافقت
(۸) محبت نہ ہونا
(۹) سوتیلی والدہ
(۱۰) شراب خوری
(۱۱) تعلیم میں عدم مساوات

۵۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل

(۳۲) تمہارے نزدیک عام حق رائے دہندگی اچھا
ہے یا برا؟ . . . . ۸۱ اچھا ۱۹ برا
(۳۳) تمہارے نزدیک عورتوں کو عام حق رائے
دہندگی ملنا اچھا ہے یا برا؟ ۲۷ اچھا ۷۳ برا
(۳۴) تمہارے نزدیک شراب خوری کی قانونی
ممانعت اچھی ہے یا بری؟ . . ۴۴ اچھی ۵۰ بری
(۳۵) کیا تم لائسنس دار رنڈی کے پیشے کو بند کرنا چاہتی ہو؟ ۴۱ ہاں ۵۹ نہیں
(۳۶) کیا تم کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہتی ہو؟ ۶۴ ہاں ۳۶ نہیں
(۳۷) کیا تم شادی کرکے اپنا پیشہ ترک کر دو گی؟ ۱۷ ہاں ۸۳ نہیں
(۳۸) مندرجہ ذیل دو راستوں میں سے تمہیں
کونسا پسند ہے، اپنے پیشے کے ذریعے سے آزادی ۳۷ آزادی
حاصل کرنا یا شادی کرکے شوہر کے سہارے پر گذارہ کرنا؟ ۶۳ شوہر کا سہارا
(۳۹) کیا تم سمجھتی ہو کہ پیشے کے لحاظ سے عورت
کو مرد کے برابر شمار کرنا چاہئے؟ ۵۹ ہاں ۴۱ نہیں
(۴۰) اگر تمہارا کوئی سہارا نہ رہے اور پیسہ بھی (الف) ۱۴
پاس نہ ہو تو مندرجہ ذیل راستوں میں سے کونسا اختیار (ب) ۵۴
کرو گی؟ (الف) بھیک مانگنا (ب) خودکشی (ج) چوری (ج) ۱
(د) فاقے کی موت؟ (د) ۳۱
(۴۱) اشتراکیت کو اچھا سمجھتی ہو یا برا؟ ۱۳ اچھا ۸۷ برا
(۴۲) کیا تم اسے درست سمجھتی ہو کہ مزدور جا ہے
جتنی محنت شاقہ کریں ہمیشہ غریب ہی رہیں اور امرا ہاتھ
پاؤں ہلائے بغیر امیر بنے رہیں؟ . . . . ۱۳ ہاں ۸۷ نہیں
(۴۳) کیا تم اس دعوے کو درست سمجھتی ہو کہ حصول
دولت کے لئے سخت محنت کرنے کے بعد محنت کرنے
والوں میں دولت مساوی یا تقسیم کر دی جائے؟ ۱۱ ہاں ۸۹ نہیں
(۴۴) کیا تم اس دعوے کو درست سمجھتی ہو کہ انسان
قابلیت کے لحاظ سے مساوی نہیں پیدا کیا گیا اور سماجی
سیاسی اور اقتصادی معاملات میں اعلیٰ رتبہ دماغی قابلیت
کے لحاظ سے ملنا چاہئے؟ . . . . . ۸۳ ہاں ۱۷ نہیں
(۴۵) کیا تم اس دعوے کو درست سمجھتی ہو کہ خدا
نے سب آدمیوں کو مساوی پیدا کیا ہے اس لئے سماجی
سیاسی اور اقتصادی معاملات میں سب سے مساوی
برتاؤ کرنا چاہئیے؟ . . . . . . ۴۲ ہاں ۵۸ نہیں
(۴۶) سوسائٹی کی تنظیم کے لئے اخلاقی ذرائع ۹۵ اخلاقی ذرائع
اختیار کرنا پسند کرو گی یا قوت استعمال کرنا پسند کرو گی؟ ۵ قوت

۶۔ تعلیم

(۴۷) بچے کی تربیت کے لئے مندرجہ ذیل میں سے (الف) ۲
کونسا ذریعہ اختیار کرنا پسند ہے؟ (الف) ملامت کرنا۔ (ب) ۱
(ب) مارنا (ج) سمجھانا۔ (ج) ۹۷
(۴۸) اگر بچہ بدمزاجی کرے اور کہنا نہ سنے تو مندرجہ (الف) ۲۹
ذیل میں سے کونسا رستہ اختیار کرو گی؟ (الف) اُسے یونہی (ب) ۵۲
چھوڑ دینا (ب) کچھ دے کر بہلانا (ج) ملامت کرنا (د) مارنا (ج) ۱۹
(ہ) کوٹھڑی میں تنہا بند کر دینا؟ (د) صفر (ہ) صفر
(۴۹) دونوں میں سے کونسا طریقہ پسند ہے؟
(الف) جاپانی خواتین کے قدیم ہنر سیکھنا مثلاً آرائش
گل، کوتو بجانا، تقریب چائے نوشی، سینا وغیرہ یا (الف) ۱۷
(ب) گھر کا کام کاج کرکے خانہ داری کی عملی تعلیم حاصل کرنا؟ (ب) ۸۳
(۵۰) جب تمہارا ارادہ کالج میں تعلیم پانے کا نہیں
ہے تو کیا مدرسے میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنا
بیکار سمجھتی ہو؟ . . . . . ۳۰ ہاں ۷۰ نہیں
(۵۱) جاپانی عورتوں کے لئے مغربی لباس مد

مغربی طرزِ تخیل کو اچھا سمجھتی ہو یا بُرا؟ ۱۱ اچھا ۸۹ بُرا

۷۔ تفریح وغیرہ

(۵۲) مندرجہ ذیل تفریحات میں سے کونسی تین تمہیں پسند ہیں؟ (الف) سنیما (ب) تھیٹر (ج) مطالعۂ کتب (د) کھیل کود (ہ) کسی قسم کا کام (و) موسیقی (ز) آرائشِ گل (ح) مصوری (ط) خوشنویسی (ی) ماجونگ کا کھیل؟

(الف) ۱
(ب) ۱
(ج) ۲۰
(د) ۲۰
(ہ) ۲۸
(و) ۱۵
(ز) ۱۳
(ح) ۲
(ط) صفر
(ی) صفر

۸۔ عام امور

(۵۳) کیا تم مندرجہ ذیل آرا کی تائید کرتی ہو؟ ہاں نہیں

(الف) دنیا کی تمام اقوام خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی برابر ہیں ۴۵ ۵۵

(ب) امیر لوگ غریبوں سے زیادہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ ۳۲ ۶۸

(ج) دیہات میں رہنے والوں کی صحت شہر والوں سے بہتر ہوتی ہے ۹۷ ۳

(د) جاپان میں دق کے مریضوں کی تعداد بلحاظ آبادی کے دنیا کے دیگر ممالک سے زیادہ ہے ۷۷ ۲۳

(ہ) ضبطِ تولید سے قوم کی آبادی کم ہو جاتی ہے اور قوم کمزور ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ خراب بات ہے۔ ۷۳ ۲۷

(و) ہر حالت میں والدین اور بزرگوں کی اطاعت کرنی چاہئے۔ ۱۳ ۸۷

(ز) مذہب پر ایمان لانا ایک باطل فعل ہے ۲۱ ۷۹

(ح) خدا دکھائی نہیں دیتا اور سائنٹفک طریقوں سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خدا کی کوئی ہستی نہیں ہے ۳۶ ۶۴

(ط) ضبطِ تولید سے سوسائٹی میں بد اخلاقی کے خیالات ترقی کرتے ہیں لہٰذا یہ خراب بات ہے ۸۰ ہاں ۲۰ نہیں

(ی) چونکہ جاپانی عورتوں میں سے اکثر شادی ہونے پر خاندان کی خاطر اپنی ہستی قربان کر دیتی ہیں لہٰذا انہیں اعلیٰ تعلیم دینے کی ضرورت نہیں۔ ۱۷ ۸۳

(ک) سماجی معاملات میں مرد کے مقابلے میں عورت کی پستی کی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی لحاظ سے وہ مرد کی تابع ہے۔ ۴۳ ۵۷

(ل) اصلی تعلیم مدرسے کی بجائے سوسائٹی میں حاصل ہوتی ہے ۵۳ ۴۷

(م) جاپانی عورت کے لئے اعلیٰ تعلیم ضروری نہیں ہے کیونکہ اس کے مغرور اور کج بحث بن جانے کا احتمال ہے۔ ۳۸ ۶۲

ان جوابات کی رو سے موجودہ جاپانی عورت کے تخیل پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا جا سکتا ہے مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ تاہم ان کی ذہنیت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنے سے باز نہیں رہا جا سکتا۔ یہ چاہے قومی دیوتاؤں کے بطلان سے بے دینی کی مرتکب ہو جائیں مگر بچوں کی شرارت پر تادیب کی غرض سے بھی ان کو مارنا پیٹنا اور ان پر تشدد کرنا گناہ کبیرہ سمجھتی ہیں۔ اس کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آتا۔

نورالحسن برلاس

رباعی

مینائے شرابِ ارغوانی اے ساقی
آنکھوں میں ہے سرابِ زندگانی اے ساقی
مستِ جام و سبو اٹھا بھری پیری ہے
کیفیتِ شبابِ زندگانی اے ساقی

سعید احمد اعجاز

اعجازِ تغزل

اگر عشق اپنی ہمت پہ بے نیازِ ماسوا ہوتا
تو اب تک حُسن کی فطرت پہ قابو پالیا ہوتا

نہ چھپتا دل کے پردوں میں نظر سے رونما ہوتا
جو وہ ذوقِ تجسس سے ہمارے آشنا ہوتا

نہ ہوتیں منحرف موجیں، نہ یہ طوفاں بپا ہوتا
کسی حد تک بھی ذہنِ ناخدا میں گر خدا ہوتا

کیا اے عشق تو نے حسن کو بے کل کر برہم
یہ مفہومِ محبت تھا، نگاہوں سے ادا ہوتا

ستارے جھومتے ہیں جس سے، جگنو رقص کرتے ہیں
کبھی سنتے چلے پھر وہ روح کا نغمہ سنا ہوتا

جنہیں پونچھا ہے اپنی آستیں سے تم نے گھبرا کر
یہی آنسو کسی دن شرحِ عنوانِ وفا ہوتا

وہ ہوتے "تاج" ہوتا اور پوری چاندنی ہوتی
کنول اور نسترن میں عالمِ ماہ و سُہا ہوتا

وہ فرطِ ناز سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے چلتے
بساطِ مرمریں پر اُن کا سایہ پڑ رہا ہوتا

ق
کنارِ "تاج" میں انگڑائی لیتی اُن کی برنائی
منارِ "تاج" اُن کی مستیوں سے جھومتا ہوتا

یہ کہہ کر بھاگتے وہ "تم ہمیں چھولو تو ہم جانیں"
میں بوئے گُل کی صورت اُن کے پیچھے دوڑتا ہوتا

وہ تھکتے ہانپتے اک بار میری گود میں گرتے
میں آخر ہم کنارِ پیکرِ نور و ضیا ہوتا

فلک کے چاند کو ہوتیں گراں بیداریاں اپنی
زمیں کا چاند آغوشِ وفا میں سو رہا ہوتا

تصور کو محبت میں غنیمت جانتا ہوں میں
تصور بھی نہ ہوتا میری قدرت میں، تو کیا ہوتا!

چمن سے تابہ صحرا منتظر تھا اس کا ہر ذرہ
کہیں جلوہ نما ہوتا، مگر جلوہ نما ہوتا

خوشی کا ہے نہ غم کا ہے، نہ اُن کا ہے نہ میرا ہے
کسی کے کام تو آتا، اگر دل کام کا ہوتا

جو میں اے باغباں خوگر نہ ہو جاتا تباہی کا
چمن کی ڈالی ڈالی پر نشیمن بن گیا ہوتا

وہ پورا عہد کر دیتے بھرے ساون میں آنے کا
اگر اعجاز میری چشمِ تر میں حوصلہ ہوتا

اعجاز صدیقی اکبرآبادی

حضرتِ انسان نے آہستہ آہستہ کارگاہِ قدرت کے تمام راز معلوم کر لئے ——— کائنات کے ذرہ ذرہ پر اپنے نام کی مہر لگادی عظیم الشان اور ناپیدا کنار سمندر کی طوفانی موجوں کو مطیع کیا۔ فضائے بسیط کی آوارہ ہواؤں پر قابو پایا ——— زمین کے سینے میں پوشیدہ خزانوں کو ڈھونڈ نکالا نظام شمسی کے خفیہ رموز معلوم کئے۔ اس کے غیظ و غضب کی قہرمانی نمود یعنی تڑپتی ہوئی بجلیوں کو اپنا پابند بنایا ——— سب کچھ کیا لیکن قدرت بدستور اس کی ان کوششوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی ——— اس لئے کہ وہ اب بھی قدرت کے ادنیٰ اشاروں کا مطیع ہے ——— اور ان خفیہ دشمنوں کو زیر نہیں کر سکا۔ جو خود اس کے دل میں پوشیدہ ہیں۔ یعنی نفس کی بے پناہ اور نامعلوم قوتیں جو نت نئے گل کھلاتی رہتی ہیں ——— اور انسان کے علم و عمل کو بے کار کر کے اس کو اس طرح ادھر ادھر لئے پھرتی ہیں جس طرح سمندر کی طوفانی موج ایک حقیر تنکے کو۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو غالباً مجھ کو اپنے عزیز دوست اسلم کی عبرت ناک زندگی کا افسانہ لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہ ہمارے حلقۂ احباب کا لائق ترین فرد تھا ——— ذہین۔ طباع اور شائستہ۔ زمانۂ تعلیم میں وہ ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کرتا رہا ——— اور خلاف معمول طلبا کے دونوں گروہوں یعنی کھیلنے والوں اور پڑھنے والوں میں مساوی طور پر ہر دلعزیز رہا ——— وہ ایک بہت اچھا کھلاڑی تھا اور ایک ہونہار طالب علم ——— اساتذہ بھی اس سے خوش رہتے تھے اور ہم سبق بھی ———

اسلم ہمارے گروہ کا مسلّم قائد تھا۔ حالانکہ بعض نوجوانوں کی طرح خواہ مخواہ اپنے گروہ کا لیڈر بن جانے کی اس میں عادت نہ تھی۔ نہ اس نے اپنی شخصیت کو کبھی نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ فطرتاً اپنی شخصیت کو چھپانے اور دوسروں کی ہاں میں ہاں ملانے کا عادی تھا۔ پھر بھی کسی پُراسرار طریقے پر ہمیشہ ہوتا وہی تھا جو وہ چاہے۔ اس کا شائستہ انداز اور دلپذیر عادات نہ صرف احباب بلکہ اغیار کو بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور کرتی تھیں ——— ان تمام خوبیوں کے باوجود آج وہ زندگی کی پیہم اور مسلسل ناکامیوں پر قربان ہو کر ہم سے جدا ہو چکا ہے!

بی اے پاس کرنے کے بعد ہم سب زندگی کی اس تلخ حقیقت کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جس کو تلاش روزگار کہتے ہیں۔ گروہِ احباب کا شیرازہ بکھر گیا ——— بعض ملازم ہو کر دوسرے شہروں کو چلے گئے۔ بعض مقامی دفتروں میں وہ فردا کی امید موہوم پر معاوضہ کے بغیر کام کرنے لگے ——— اور بعض نے کسب معاش کے وہ ذرائع اختیار کر لئے جو جنگ حیات کے پسپا شدہ سپاہی عموماً اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے خوش قسمت عزیزوں کے گلے کا ہار بن گیا۔ کسی نے نیک و بد کی تمیز مٹا کر جعل سازی اور فریب دہی کو اپنا شعار بنا لیا ——— اور کسی نے کھدر پوش ہو کر اپنی بے کار ہستی کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

اسلم کی روش ان سب سے جداگانہ رہی ——— کامل دو برس تک تلاش روزگار میں سعی لاحاصل کرنے کے بعد وہ تھک کر بیٹھ رہا ——— دل کی خوں شدہ امیدیں تحت الشعور میں دب گئیں۔ مجروح اور شکست خوردہ شخصیت نے حقیقت کی ٹھوس دنیا سے نکل کر خیالی دنیا میں اپنی فتوحات کا سلسلہ قائم کیا ——— وہ گھنٹوں بلکہ پہروں ایک ہی مقام پر بیٹھا ہوا کچھ سوچا کرتا تھا۔ کئی دفعہ ایسے موقعوں پر مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہیں دیکھا کرتا تھا کہ خیالات کی نوعیت کے ساتھ ساتھ اس کے بشرہ کی کیفیت بدل رہی ہے۔ کبھی چہرے پر حسرت و یاس کے آثار پیدا ہو جاتے۔ آنکھوں میں بے رونقی اور چہرہ پر پژمردگی چھا جاتی ——— کبھی جس طرح ابر بہار کی بارش سے خزاں رسیدہ چمن کے برگ و بار پر شادابی اور ہریالی دوڑ

جاتی ہے اس کا چہرہ جوشِ مسرت سے چمک اٹھتا۔ ہونٹوں پہ فاتحانہ تبسم کی لہریں رقص کرنے لگتیں ــــــ آنکھوں میں رونق اور چمک پیدا ہو جاتی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے دل کی دھڑکن کا راز افشا ہونے لگتا۔ کبھی تیوری کے بل، مٹھیوں کے بھینچ لینے سے آہنی عزم اور فیصلہ کی شان پیدا ہو جاتی۔

ایک روز میں نے اسلم سے شکایت کی اور پوچھا کہ تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔ کیا میرا آنا ناگوار گذرتا ہے؟

میں اس حسرت یاس بھری یاد کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جس سے اس نے میری دوستانہ شکایت کا جواب دیا ــــــ مسکراہٹ تھی یا شکست اور مایوسی کا مرثیہ! اس نے کاہلی اور سستی کے انداز سے پہلو بدلا، جمائی لی۔ اور ایک خفیف سی آہ بھرنے کے بعد مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"میں مسلسل ایک گھنٹے سے یہی سوچ رہا ہوں کہ تم سے کیا باتیں کروں" اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھ کو دنیا کے کسی موضوع پر کچھ کہنا باقی نہیں ہے۔ شاید میری گویائی کا خزانہ خالی ہو گیا ہے ــــــ تم کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ اب میں کسی بھی کام سے اتنا نہیں گھبراتا جتنا باتیں کرنے سے گھبراتا ہوں ــــــ اگر کوئی دوسرا باتیں کرتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ گریبان پھاڑ کر کہیں بھاگ جاؤں ــــــ دور۔ بہت دور۔ جہاں کسی کی آواز نہ پہنچ سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بدنصیب بات ہی کیا کرے، جس کی دنیا اجاڑ ــــــ بے رنگ۔ بے کیف اور تھکا دینے والی یکسانیت سے لبریز ہو!"

اتنا کہہ کر اسلم نے خستگی کے انداز سے انگڑائی لی اور خاموش ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد اس کو میونسپلٹی کے دفتر میں بیس روپیہ ماہوار کی ملازمت مل گئی ــــــ ایک دوست کی زبانی یہ مژدہ سن کر میں بہت خوش ہوا۔ اور فوراً مبارکباد دینے کے لئے اس کے گھر پہنچا۔ اتفاق سے وہ موجود تھا۔ میرے آنے کی اطلاع پا کر باہر آیا ــــــ لیکن اس طرح کہ میں ندامت اور افسوس کے مارے زمین میں گڑ گیا ــــــ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ندامت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں فرشِ زمین پر چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اس کو کسی فعلِ قبیح کے ارتکاب کی حالت میں دیکھ لیا ہے ــــــ وہ میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا ــــــ اور اس نے آہستہ آہستہ گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا! زندگی میں پہلی دفعہ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پرنم ہیں اور ہونٹ وفورِ جذبات کی کشمکش سے کانپ رہے ہیں!

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس وقت آنے میں انتہائی نادانی سے کام لیا ہے۔

"محمود آخر میں ملازم ہو گیا" اس نے مسکرا کر کہا۔

"خدا مبارک . . . یعنی خدا ترقی دے . . . . ابھی تو پہلے زینے پر قدم رکھا ہے" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا

"ہاں ــــــ" اس نے مدھم لہجہ میں جواب دیا "مجھے کل تک امید تھی کہ پہلا زینہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہوگا ــــــ لیکن بلقیس اس میں بھی خوش ہے!"

آخری جملے نے میرے دل پر تیر و نشتر کا کام کیا۔ اس نے یہ الفاظ کچھ اس طرح ادا کئے تھے گویا وہ اپنی ناکامی کی معافی مانگ رہا ہے۔ "اچھا خدا حافظ" میں نے آواز پر قابو حاصل کر کے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

"کیا بیٹھو گے نہیں"؟

"نہیں!" میں نے غصہ سے جواب دیا اور تیز قدم رکھتا ہوا چلا آیا،

ــــــ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ اسلم پر، اپنے آپ پر، یا زمانہ پر، یہ نہیں معلوم ــــــ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس وقت اگر کوئی مجھے ٹوک دیتا تو ضرور ایک آدھ جھڑپ ہو کر رہتی!

اسلم ایک بلند خیال، غیور، تن آسان اور ذکی الحس انسان تھا۔ اس ناکام کامیابی نے اس کی رہی سہی امیدوں کو خاک میں ملا دیا ــــــ دل میں پرورش پانے والے حوصلے اور ولولے مایوسی سے بدل گئے ــــــ اور مایوسی نے اس کو زندہ درگور کر دیا ــــــ وہ چلتا پھرتا تھا ــــــ دفتر جاتا تھا ــــــ کام کرتا تھا ــــــ لیکن مجبوروں کی طرح۔ جذبۂ انفعال میں ڈوبا ہوا۔ ماضی سے شرمندہ، مستقبل سے مایوس اور حال سے بے نیاز۔ اس کو اپنی ہستی سے نفرت ہو گئی تھی ــــــ اور اگر اس کو اپنی نوجوان رفیقۂ حیات بلقیس سے والہانہ محبت نہ ہوتی تو یقیناً رشتۂ حیات کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالتا۔

زمانہ اسلم اور اس ایسی لاتعداد ناکام ہستیوں کے صدمات و افکار سے بے نیاز اپنا لامتناہی راستہ طے کرتا رہا ــــــ جو سنہرے پہیوں کی گاڑی پر سوار تھے وہ اس کے ساتھ ساتھ منازلِ ترقی سے گذرتے رہے۔ جو نادار تھے اور پا پیادہ، وہ وہیں رہ گئے جہاں ان کے سفر کی پہلی

منزل تھی۔

اسلم کی زندگی روز بروز انقلاب پذیر ہوتی گئی —— اس کا مزاج بدل گیا۔ اطوار و عادات بدل گئے۔ اس کو انسان کی صحت سے نفرت ہو گئی۔ طبیعت میں کاہلی اور تساہل کوٹ کوٹ کر بھر گیا فیشن پرستی۔ صفائی اور خوش پوشی کا خیال جاتا رہا —— اس کی نشست کا کمرہ بلقیس کی ان تھک کوششوں کے باوجود کثیف سے کثیف تر ہوتا گیا۔

اب نہ اس کو میلے کپڑے پہننے میں پس و پیش تھا۔ نہ کئی کئی دن خط بنوانے میں عار۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کے دل سے جذبۂ خودداری کا وجود ہی مٹ چکا ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کا زہر خون کے ساتھ اس کی رگ رگ میں دوڑ چکا تھا اور رفتہ رفتہ۔ ارادہ اور عمل کی قوتوں کو فنا کر رہا تھا۔

ناکامی ترقی کی کوشش میں مزید انہماک کا باعث ہوتی ہے! بیشک۔ لیکن صرف اس کے لئے جس کے کردار میں صبر و استقلال کے ساتھ ساتھ آہنی عزم کے عناصر غالب ہوں۔

اسلم کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ بلقیس کی محبت اس کی زندگی کا سبب تھی اور اس کی بربادی کا باعث بھی! متذکرہ بالا واقعات کے کئی ماہ بعد ایک روز صبح کے وقت بلقیس نے اسلم سے کہا۔

"سلمیٰ بہن نے مشین منگائی ہے جس پر کپڑے بھی سیئے جا سکتے ہیں اور طرح طرح کے بیل بوٹے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں۔ آن کی آن میں ایسا اچھا میز پوش تیار ہو گیا کہ کیا کہوں!"

"ہاں" اسلم نے سرد آہ بھر کر کہا "یہ سب امیروں کے دل بہلاوے ہیں۔ جس کے پاس میز ہی نہ ہو وہ میز پوش کیا کرے گا!"

"نہیں ہے تو کیا ہوا" بلقیس نے بچوں کی طرح پر جوش لہجہ میں کہا "کبھی تو خدا دے گا۔ میں تو تھوڑا تھوڑا بچا کر یہ مشین ضرور لوں گی۔"

جوش اور شوق کی حالت میں بلقیس کے رخسار تمتما رہے تھے —— ہلکی ہلکی دلفریب سرخی دوڑ گئی تھی —— آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اسلم نے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں سر اور گردن پر لوٹتی ہوئی اس جگہ پہنچ کر رک گئیں جہاں بلقیس نے پھٹی ہوئی ساڑی کو سی رکھا تھا۔ بلقیس نے دیکھا اور ایک بے ساختگی سے اس مقام کو اپنے خوشنما نازک ہاتھ سے چھپا لیا۔

اسلم نے نگاہیں نیچی کر لیں —— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے!

انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ رجسٹروں اور مسلوں کا ایک انبار سامنے میز پر لگائے ہوئے اسلم اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا تھا —— ارد گرد دوسرے کلرک باہم ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ تنخواہ ملنے کی امید نے ان کے دلوں کو مسرور کر دیا تھا۔ کوئی اپنی شاہ خرچی کی داستانیں سنا رہا تھا۔ کوئی اپنی رفیقۂ حیات کی سخت گیری اور اقتصادی خوش سلیقگی کی روئیداد بیان کر رہا تھا۔ کوئی قرض داری اور لاتعداد بچوں کے اخراجات کا دکھڑا رو رہا تھا۔ غرض سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے —— اگر کوئی خاموش تھا تو اسلم۔ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ اس کے لئے روحانی عذاب کا پیش خیمہ بن کر آتی تھی۔ اسی روز اس کو اپنی بے مائگی اور افلاس کا صحیح اندازہ ہوتا تھا۔ سارا مہینہ ناگزیر ضروریات کو پہلی تاریخ پر اٹھا رکھنے کے بعد جب وہ بلقیس کو مایوس کرنے پر مجبور ہوتا تھا تو اس کے دل میں غیظ اور بغاوت کا ایک متلاطم سمندر موجیں مارنے لگتا تھا۔

صبح کو دفتر آتے وقت اس نے بلقیس سے بندوں کی ایک جوڑی لانے کا وعدہ کیا تھا —— لیکن راستے میں نوٹ بک دیکھنے پر معلوم ہوا کہ تنخواہ سے زیادہ اس کو قرضہ چکانا ہے۔ پانچ روپیہ ماہوار قسط پٹھان کو ادا کرنی تھی۔ جس سے اس نے گرم کپڑے خریدے تھے۔ نو روپے بنئے کو دینے تھے۔ جس سے ماہوار جنس ادھار لی جاتی تھی۔ دو روپے ایک کلرک سے لے کر اپنے لئے جوتے خریدے تھے۔ وغیرہ وغیرہ اسی طرح اس کو پورے پچیس روپے ادا کرنے تھے اور تنخواہ تھی صرف بیس روپے۔ ان تفصیلات پر غور کرنے کے بعد اسلم مایوس ہو گیا۔

"خودکشی حرام ہے! بزدلی ہے۔ ہونھ۔ چہ خوش!" اس نے نفرت کے ساتھ سوچا۔ "حرام کیوں نہ ہوگی۔ حرام نہ ہوتی تو صد ہا بد نصیب انسان تقدیر کی ستم ظریفیوں سے بچ نہ جاتے —— قدرت کا منشا کیونکر پورا ہوتا —— امیروں کو دولت کی قدر کیونکر ہوتی —— حرام ہے!!"

حقارت کے ساتھ منہ بنا کر اس نے اینٹوں کے فرش پر تھوک دیا اور کھڑا ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کو یاد آ رہا تھا کہ بندوں کا مژدہ سن کر بلقیس بچوں کی طرح خوش ہو گئی تھی۔ جوش مسرت اور بے تابی شوق نے اس کی غزالیں آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بجلیاں بھر دی تھیں۔ رخساروں پر عجیب دلفریب رونق چھا گئی تھی۔ اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی

اور اس کے کالر کا بٹن لگانے کے بہانے سے وہ اس کے سینے سے لگ گئی تھی۔۔۔

"میں اس کو ہرگز مایوس نہ کروں گا" اسلم نے مٹھیاں باندھ کر۔۔۔ دانت پیس کر زیر لب کہا "چاہے کچھ بھی ہو ۔۔ ذلت ہو۔ رسوائی ہو جیل جانا پڑے ۔۔۔ کچھ ہو۔ میں بندے ضرور خریدوں گا"

ترکیب یہ سوچی تھی کہ خزانچی سے تنخواہ لے کر فیل از وقت گھر چلا جائے گا۔ اس طرح پٹھان کے روپے بچ جائیں گے لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا ۔۔۔ تنخواہ خدا خدا کر کے ملی بھی تو وہ ایک ضروری کام اپنے محل آنے کر ان کے انجام دینے میں دیر ہو گئی ۔۔۔ چھٹی ہونے میں دس منٹ باقی تھے جب وہ فرصت پا کر کمرے سے باہر نکلا اور مجرموں کی طرح ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا۔ سراہٹ پر اس کا دل خوف سے اچھلنے لگتا نفس کی آمدوشد رکنے کو ہوتی۔ ہر شخص پر پٹھان کا دھوکا ہونے لگتا۔

"کہاں جاتا ہے بابو ؟"

دفعتہً ایک بھاری اور تہدید آمیز آواز آئی ۔۔۔ اسلم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہی پہچانی ہوئی ڈراونی آواز! نزع میں دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح مڑ کر دیکھا تو موت کا فرشتہ موجود تھا ۔۔۔ دیو قامت مغلیہ کی صورت دیکھتے ہی مایوسی نے اسلم کی تمام قوت ارادی کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس نے چپکے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا اور بہ مشکل آنسوؤں کے سیلاب کو آنکھوں میں روکے ہوئے گھر چلا آیا۔

"کاش بلقیس کا سامنا ہونے سے قبل مجھے موت آجاتی!" وہ راستہ بھر دعائیں مانگتا رہا لیکن موت بلانے سے نہیں آتی ۔۔۔ وہ زندہ اور صحیح و سالم گھر پہنچا ۔۔۔ بلقیس مسکراتی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور امید و بیم کی حالت میں اس کا منہ تکنے لگی ۔۔۔ اسلم کا چہرہ سرخ ہوا۔ پھر زرد ہوا پھر سفید ہو گیا۔ ایک جگر سوز آہ سینے سے اٹھی اور دب کر رہ گئی۔

"میں بندے نہیں لا سکا بلقیس!" اس نے ندامت اور معذرت کے لہجہ میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا ۔۔۔ جوش اضطراب میں اس کی گرفت اس قدر سخت ہو گئی کہ بلقیس کی نازک پسلیاں دکھنے لگیں۔

"خیر نہ سہی ۔۔۔ اگلے مہینے ۔ لا دیجئے گا" بلقیس نے چند سیکنڈ کے بعد تسلی آمیز لہجہ میں کہا اور اپنے آنچل سے اسلم کے گرم گرم آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔ محبت اور پیار کے ساتھ۔ یہ آنسو اس کی تمام خون گشتہ امنگوں کا صلہ تھے جن کو اس نے فراخ دلی سے قبول کیا۔

اس واقعہ کے کئی روز بعد میں اسلم کی ملاقات کو گیا تو وہ بلیھر کی نشست گاہ میں لیٹا ہوا کوئی بہت ہی پرانی سی کتاب پڑھ رہا تھا مجھ کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا اور خلافِ معمول نہایت تپاک کے ساتھ خیر مقدم کر کے اپنے پہلو میں بٹھا لیا ۔۔۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کا چہرہ کسی پر اسرار مسرت کے جوش سے روشن ہے۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ لہرا رہی تھی اور آنکھیں فاتحانہ انداز سے چمک رہی تھیں۔

"کیا کوئی خاص بات ہے۔ آج بہت خوش نظر آرہے ہو" میں نے دریافت کیا۔

"بات تو بالکل عام ہے" اس نے پر اسرار انداز میں جواب دیا "لیکن ہم اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس کو خاص سمجھتے ہیں"۔

"خوب! زحمت نہ ہو تو اس کی توضیح بھی فرما دیجئے" میں نے طنزاً کہا "ذرا میں معمے حل کرنے میں کچھ تیز فہم نہیں ہوں"۔

"کچھ نہیں" اسلم نے بناوٹی بے پروائی سے جواب دیا "میں شہر سے دور ۔ دریا کے کنارے ایک عالی شان محل بنوانے والا ہوں ۔۔۔ جس کے چاروں طرف رشک فردوس چمن اور باغات ہوں گے جابجا سنگ مرمر کے حوض بنے ہوں گے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے نہریں پیچ و خم کھاتی ہوئی جاری ہوں گی۔ مصنوعی پہاڑیوں پر آبشار بنے ہوں گے۔ فوارے چھوٹ رہے ہوں گے ۔۔۔ خودرو خوشنما اور خوشبودار جھاڑیوں میں پری وش نازنینیں چھپی ہوئی مدھم سروں میں بربط و چنگ بجا رہی ہوں گی۔ اور اپنی اس ارضی جنت میں میں اپنی بلقیس کے ساتھ گلگشت کروں گا۔ خدام کی فوج دست بستہ موجود ہو گی"۔

اسلم کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صفحۂ خیال پر یہ خوشنما تصویر دیکھ رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر بیان کر رہا ہے۔ اس کا پُرجوش چہرہ سرخ ہو کر دمکنے لگا تھا۔ جذبات کی غیر معمولی گہماگہمی میں آواز دھیمی ہو گئی تھی اور نفس کی آمدوشد تیز تھی۔

میں فطرتاً بزدل نہیں ہوں لیکن اس وقت میرے دل پر ایک ناقابل بیان خوف طاری ہو گیا اور کسی خفیہ جبلی قوت نے مجھے اسلم سے دور ہو کر

بیٹھنے پر مجبور کیا۔

"اسلم!" میں نے ایسی آواز میں کہا جو چیخ سے مشابہ تھی۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور میرے چہرے پر اندیشہ ناک سنجیدگی کے آثار دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ میرے شکوک اور پختہ ہو گئے۔

"گھبراؤ نہیں محمود" اس نے ہنسی روک کر کہا "میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہوش کی باتیں کر رہا ہوں"۔

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"حضرتِ انسان نے ایسے ایسے علوم و فنون ایجاد کئے ہیں"۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "جن کی مدد سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ زمانہ اور تقدیر کی ساری مخالفت پر آسانی کے ساتھ غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ تم دیکھ لوگے کہ میں ہے جو کچھ کہا وہ شیخ چلی کا خواب نہیں بلکہ واقعہ ہے"۔

اس کے بعد اسلم نے بتایا کہ جو کتاب وہ پڑھ رہا تھا اس میں کیمیا گری کے نہایت آسان اور آزمودہ نسخے درج تھے۔ اس نے ان کا تجربہ شروع کر دیا تھا اور اب تک خاطر خواہ کامیابی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی پوری قوت لسانی صرف کر کے کیمیا گری کی مخالفت کی۔ ہزار نشیب فراز سمجھائے کیمیا گروں کی تباہی اور بربادی کی ہولناک تصویریں کھینچیں۔ سب کچھ کیا ــــ لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ایک عالمانہ انداز میں مسکرا یا کیا۔

"تعلیم یافتہ ہو کر جاہل نہ بنو" میں نے بگڑ کر کہا "یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی شے کی ماہیت بدل جائے جس طرح گھوڑا مرغ نہیں بن سکتا۔ اسی طرح لوہا یا تانبا بھی سونا نہیں بن سکتا"۔

"ماہیت بدلنے کا تو سوال ہی نہیں ہے" اس نے جواب دیا۔ "صرف رنگ اور وزن کو بدلنا ہے اور یہ ثانوی اوصاف ہیں۔ لہٰذا بدلے جا سکتے ہیں"۔

"خیر تم جانو تمہارا کام جانے" میں نے عاجز ہو کر کہا۔ "میرا جو فرض تھا وہ میں نے پورا کیا۔

"ناراض نہ ہو محمود میں تم کو بھی مالامال کر دوں گا!" اس نے مسکرا کر کہا

"شکریہ!" میں نے طنزیہ لہجہ میں جواب دیا اور اس کے پاس سے چلا آیا۔

اصل بات یہ تھی کہ جنگِ حیات میں شکست کھا کر اسلم مایوس ہو چکا تھا اور دوسرے تخیل پرست نوجوانوں کی طرح کسب زر کے ایسے ذرائع تلاش کرنے لگا تھا جن میں محنت اور مشقت کو بالکل دخل نہ ہو اور دولتِ قاروں مفت ہاتھ آ جائے۔ اس تلاش کے دوران میں اس کو اکسیر سازی کی کتاب مل گئی تھی۔

عام تخیل پرستوں کی طرح اسلم کو ناکامی کا گمان تک نہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ گل مراد ہاتھ آنے میں صرف دنوں اور ہفتوں کی دیر ہے ــــ ادھر "پارہ قایم ہوا" ادھر قاروں کے خزانے کی کنجی اس کے ہاتھ میں آئی۔

اس یقین کے زیر اثر اس نے فرصت کا ہر لمحہ کیمیا گری کے لئے وقف کر دیا۔ مکان کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اس نے اپنی تجربہ گاہ بنائی تھی۔ جس میں جا بجا اُپلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ طاقوں پر طرح طرح کی جڑی بوٹیاں چھوٹی چھوٹی پڑیوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ گندھک۔ شورہ، تیزاب۔ اور اسی قسم کی بہت سی چیزیں کافی مقدار میں جمع تھیں ــــ کوٹھڑی کے ایک گوشے میں چولھا تھا جس میں ہر وقت اُپلوں کی آگ دہکتی تھی ــــ مٹی کے برتن میں دوائیں پکتی رہتی تھیں۔

اس انہماک اور مصروفیت میں اکثر اسلم کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔ ایک روز رات کے گیارہ بج گئے لیکن اسلم کوٹھڑی سے باہر نہ نکلا۔ بلقیس انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ بھوکی بھی تھی اور نیند بھی غلبہ کر رہی تھی آخر عاجز آ کر خود اسلم کو بلانے گئی۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھول کر بلقیس نے کوٹھڑی میں قدم رکھا تھا کہ کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا۔ سر چکرانے لگا۔ کوٹھڑی میں ایک عجیب زہریلی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ فرش سے چھت تک نہایت غلیظ اور بدبودار دھواں محیط تھا۔

اُپلوں کی مدھم آنچ میں جو کوٹھڑی کی تاریک فضا کو منور کرنے سے قاصر تھی اسلم کا چہرہ عجیب پر ہیبت انداز میں چمک رہا تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ آنکھیں مریضانہ انداز میں اپنے حلقوں سے اُبلی پڑتی تھیں۔

"کچھ کھانے پینے کا بھی ہوش ہے" بلقیس نے کھانستے ہوئے کہا۔ "گیارہ بج گئے۔ توبہ کسی کو ایسا شوق ہو"۔

"ہش۔ ش۔ ش!" اسلم نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اچھا بس رہنے دیجئے۔ اٹھئے۔ بھاڑ میں گئی ایسی کیمیا" بلقیس نے کہا اور کھانستی ہوئی آگے بڑھی۔

اسلم کھڑا ہوگیا۔

"بلقیس! تم جاؤ۔ یہاں دھواں بہت ہے، بہت گرمی ہے۔ تم یہاں کیوں چلی آئیں؟"

اس نے احتجاج کے لہجہ میں کہا۔

"نہیں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

"میں ذرا بلقیس! میں تو یہاں سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ اس مٹی کے برتن میں ہمارے مستقبل کی تشکیل ہو رہی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ سے پارہ پک رہا ہے۔ لیکن اب تک کم نہیں ہوا۔ غالباً قائم ہو گیا ہے . . . بلقیس میں نے جب ان پر بات کیا۔ جاؤ خوشی مناؤ۔ جشن عشرت کے خواب دیکھو۔ میں بہت جلد ان کی تعبیر دوں گا۔"

"آپ بھی چلئے" بلقیس نے ایک ضدی بچے کی بات کہی۔

"کچھ نہیں — جاؤ، جاؤ بلقیس! سمجھو ضد نہ کرو۔"

اسی طرح کی باتوں میں بہلا پھسلا کر اسلم نے بلقیس کو تو بھیج دیا اور خود بھٹی کے پاس بیٹھ کر برتن پر نظریں جما دیں وہ کچھ سوچ رہا تھا دیکھتا رہا۔ اچانک —کیا اس کی نظریں دھوکا کھا رہی تھیں یا واقعی پارہ کم ہو رہا تھا ——

گھبرا کر اسلم نے ایک شیشی اٹھائی اور اس کا تمام عرق برتن میں انڈیل دیا —— ایک سیکنڈ کے اندر پارہ نے سیکڑوں رنگ بدلے اور آخر کار نیلا سا شعلہ بن کر اڑ گیا۔

ممکن نہ تھا کہ کسی طرح اسلم اس اڑتے ہوئے شعلہ کو پکڑ لے۔ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر مایوسی سے دیکھنے لگا اور آخر کار حسرت و یاس کی زندہ تصویر بنا ہوا وہیں لیٹ گیا —— زمین پر آگ کے پاس۔ تھوڑی دیر بعد جب اسلم کوٹھڑی سے نکل کر خواب گاہ کی طرف چلا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ چہرے پر ضعیفی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ صورت سے ناامیدی ٹپک رہی تھی۔ سر جھک گیا تھا۔ کمر خم ہو گئی تھی۔ ایک ایسے شکست خوردہ سپاہی کی طرح جو تھک کر ہتھیار پھینک چکا ہو جس کا بدن زخموں سے چُور اور دل حسرت و یاس سے معمور ہو۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔

ایک روز دفتر سے واپس آ کر اسلم نے دیکھا کہ بلقیس کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کی آہٹ پاتے ہی بلقیس نے کتاب تکیہ کے نیچے چھپا دی اور اس کی توجہ کو کتاب سے ہٹانے کے لئے باتیں کرنے لگی۔ ایسی دلچسپ مگر بے سروپا باتیں جو صرف صنف نازک کے لئے مخصوص ہیں۔

"کیا پڑھ رہی تھیں بلقیس؟" اسلم نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں — دل گھبرا رہا تھا ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی" بلقیس نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اسلم نے تکیہ کے نیچے سے کتاب نکال کر دیکھی۔ یف کمپنی کا اشتہاری پمفلٹ!

دفعۃً اسلم کی آنکھوں سے مجروح محبت کے جلوے جھانکنے لگے جذبات کے اشتعال سے ہونٹ مرتعش ہو گئے۔

اس نے بلقیس کی طرف معذرت خواہ نگاہوں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ بلقیس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ اسلم کا انفعال اس کے دل میں ٹیس بن کر نمایاں ہو رہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے کیوں اسلم کو شرمندہ کیا۔

اس واقعہ نے اسلم کے انہماک اور جوش میں اضافہ کر دیا۔ اس نے ایک ماہ کی رخصت حاصل کی اور دن رات کیمیا بنانے میں مصروف رہنا شروع کر دیا۔ تین تین دن گذر جاتے اور وہ اپنی تجربہ گاہ سے قدم باہر نہ نکالتا تھا۔ بس وہ تھا اور اپلوں کی آگ۔ بلقیس وہیں سے جا کر کھانا کھلا دیتی تھی۔ امید و بیم کی کشمکش نے اسلم کو دیوانہ بنا رکھا تھا —— جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی بے صبری بڑھتی گئی۔ خیال اور عمل میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اس نے صدہا نسخے آزما ڈالے۔ بے تابی کسی ایک نسخے پر جم کر تجربہ کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

بلقیس اسلم کے اس خبط سے عاجز آ گئی۔ تنہائی اس کو کاٹے کھاتی تھی۔ اسلم مکان میں موجود رہتا تھا۔ بالکل اس کے قریب لیکن کس قدر دور! گویا دوسری دنیا میں۔ تنہا اور خاموش رہتے رہتے وہ اعصابی کمزوری میں مبتلا ہو گئی۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ دل غم و غصہ اور شکوہ شکایت سے لبریز ہو گیا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے ایک روز اسلم سے شکایت کی۔

"گھبراؤ نہیں بلقیس" اسلم نے محبت کے ساتھ اس کے پژمردہ رخسار کو تھپتھپا کر کہا۔ "بس یہ میری کوشش کی آخری اور فیصلہ کن رات ہے۔ امید تو ہے کہ آج اکسیر تیار ہو جائے گی۔ اور . . . اگر خدانخواستہ کامیابی نہ ہوئی تو پھر کبھی کیمیا کا نام بھی نہ لوں گا۔ مہینہ بھی ختم ہو چکا ہے کل سے مجھے دفتر جانا ہے"۔

"ہاں ٹھیک تو ہے" بلقیس نے خوش ہو کر کہا "تقدیر سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ تقدیر نے ہم کو غریب بنایا ہے۔ غریب ہی رہیں گے —— میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب کسی چیز کی خواہش نہ کروں گی"۔

"مایوس نہ ہو بلقیس۔ کیوں دل چھوٹا کرتی ہو —— اگر کیمیا تیار ہو گئی

۔۔۔۔۔"

اسلم نے بقیہ مطلب ایک پرجوش پیار کے ذریعہ ادا کیا ——
بلقیس خوش خوش کوٹھڑی سے چلی گئی۔

بلقیس نے صبح سویرے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا — سنگار کیا۔ پژمردہ رخساروں پر شادابی کی کیفیت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس نے آج مدت کے بعد اپنا بہترین جوڑا صندوق سے نکال کر پہنا تھا۔ وہ خوش تھی۔ بے انتہا خوش! آج اس کا اسلم اس کو دوبارہ ملنے والا تھا۔ اس نے آئینہ میں اپنا عکس دیکھا اور مسکرانے لگی۔ آنکھوں میں غرور و ناز کی چمک پیدا ہو گئی۔ حسن و شباب کی بے پناہ دل آویزیوں کو مصیبت فنا نہ کر سکی تھی!

شاداں اور خورم۔ ناز کے ساتھ چلتی ہوئی وہ اپنی خوابگاہ سے نکل کر اسلم کی کوٹھڑی کی طرف بڑھی۔ لیکن جوں جوں وہ کوٹھڑی کے قریب پہنچتی جاتی تھی اس کا دل بیٹھتا جاتا تھا۔ رفتار سست پڑتی جاتی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کسی نامعلوم خوف نے اس کے دل کو اپنے آہنی پنجہ میں کسنا شروع کیا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ دروازہ بند تھا۔ اور اس کی درزوں سے زہریلا بُو دار دھواں خارج ہو رہا تھا۔ ہاتھ کئی دفعہ دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھے اور رک گئے۔ اس مخصوص الہامی قوت نے جو باہمی محبت کے باعث دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو بتلایا کہ اس کو کوئی عظیم صدمہ پہنچنے والا ہے۔ لیکن اس نے دل مضبوط کر کے دروازہ کھولا اور کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ دروازہ کھلتے ہی دھوئیں کے دل بادل نکلنے لگے۔ اندر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ کچھ دیر میں جب دھواں ہلکا ہوا تو بلقیس نے دیکھا کہ اسلم مٹی کا برتن سینے سے لگائے پشت کے بل پڑا ہے۔ بے حس و حرکت مردہ! اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ دھوئیں کی سیاہی سے اس کے کپڑے، چہرہ، ہاتھ پاؤں سب سیاہ ہو چکے تھے اور وہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ بلقیس نے نبض دیکھی۔ رخساروں پر ہاتھ رکھا۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لاش پر گر پڑی۔

شبیر حسن بی اے

رباعیات

(۱)

عسرت کی گرہ دل سے بھی کھل سکتی ہے
افسردہ طبیعت بھی بہل سکتی ہے
پیچیدہ ہے گرچہ گردش ساغر سے
رفتار فلک بھی بدل سکتی ہے

(۲)

میں سر بہ گریباں نہیں ہوتا اے شیخ
پی کر میں پشیماں نہیں ہوتا اے شیخ
دل ڈوب کے صہبا میں نکھرتا ہے اور
آلودۂ عصیاں نہیں ہوتا اے شیخ

سعید احمد اعجاز

کلامِ فراق

تنگ ہے مجھ پہ جگہ وسعتِ کائنات میں
تو نے وہ درد اُٹھا دیا پردۂ التفات میں

کیفِ فنا بھی آچلا تیشہ کی حیات میں
ہونے لگی ہیں لرزشیں موجِ تجلّیات میں

سرحدِ صبح و شام سے دُور جمالِ یار ہے
کہتے ہیں جس کو وقتِ دید دن میں وہ ہے نہ رات میں

ایک نگاہِ ناز میں جذبِ ہزار اضطراب!
عشق کی سو کہانیاں حسن کی ایک بات میں

عالمِ بیدلی درست، شکوۂ بیکسی بجا!
حسن کو دخل بھی تو ہو عشق کے واردات میں

آہ یہ پرسشِ کرم اور یہ ادائے بے حسی
اُف یہ ستم طرازیاں شوخیٔ التفات میں

کوئی نہیں ہے رازداں کوئی نہیں ہے دردرس
عالمِ سوز و ساز میں، غمکدۂ حیات میں

سوز نہیں تپش نہیں کیف نہیں، اثر نہیں
یہ بھی ہے دن میں دن کوئی رات ہے یہ بھی رات میں

گھٹتی چلی ہیں دُوریاں بڑھتی چلی ہیں نسبتیں
برقِ نگاہِ یار میں ہستیٔ بے ثبات میں

پوچھ نہ عشق کی نگاہ کیسے پڑی، کہاں پڑی
عقل اُلجھ کے رہ گئی دامِ تعیّنات میں

ہاں وہی نوبہارِ ناز ہاں وہی سب سے بے نیاز
سوز بھی ہے حیات میں، ساز بھی ہے ممات میں

برقِ تبسمِ نہاں کوندتے کوندتے رُکی
درد سا اُٹھ کے رہ گیا سینۂ کائنات میں

خُلدِ بریں میں آج تک گونج رہی ہے یہ صدا
"آہ عذاب ہی سہیں کیا ہے دھرا نجات میں"

لطف و ستم، وفا جفا، یاس و اُمید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں!

خاطرِ حسن سے فراق کشتۂ امتیاز ہوں
ورنہ جفا میں بھی ہے کیا جو نہیں التفات میں

شکوۂ بے توجہی اب تو مجھے نہیں فراق
ٹوکتی ہے نگاہِ ناز آج تو بات بات میں

فراق گورکھپوری

SHAHI
for
HEALTH & VITALITY
SHAHI
LOSS OF MEMORY
BEST TONIC
for
BRAIN & NERVES
امتحان
شاہی
TAYYEBI DAWAKHANA UNANI
INDORE
BOMBAY

بہار شادی
بہار نوجوانی
سٹینو ہاؤس ایجنسی امرتسر
STENO HOUSE AGENCY,
AMRITSAR

قدیم ہندوستان کی معاشی حالت

عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستانی زیادہ تر زراعت پر بھروسہ کرتے ہوں گے، چھوٹے چھوٹے دیہات میں رہتے ہوں گے، ان کی ضروریاتِ زندگی بہت ہی کم ہوں گی، اور معیارِ زندگی بھی اسی لحاظ سے پست ہوگا۔ ان حالات کے ماتحت معاشی نظام بھی سیدھا سادا اور معمولی حیثیت کا ہوگا۔ لیکن حال ہی میں جو انکشافات دریائے سندھ کے کنارے "موہن جوداڑو تہذیب" اور "ہڑپہ" کے متعلق ہوئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانے میں بھی ہندوستان کے کچھ حصے بہت ہی مہذب تھے اور ان کا تمدن دوسرے ممالک کے تمدنوں کے مقابل میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ان مقامات پر کھدائی کا جو کام ہوا اور جو کھنڈر روشنی میں آئے ان کو سامنے رکھ کر ماہرین آثارِ قدیمہ کا بیان ہے کہ اس زمانے میں لوگ کافی ترقی یافتہ شہروں میں بھی رہتے تھے۔ عمارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مذاقِ تعمیر ایک خاص اصول اور علم پر مبنی تھا، شہر کے رہائشی انتظامات بلدی ترتیب کے اصول پر تھے، بازاروں اور راستوں میں بھی ایک خاص تناسب مدنظر تھا، موریوں اور نالیوں کو بھی اصول حفظانِ صحت کے اعتبار سے بنایا گیا تھا، پبلک حماموں کا رواج عام تھا، عمارتوں کی تعمیر میں ہوا کے گذر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا، تعمیر میں جو مسالہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں جلائی ہوئی اور خشک کی ہوئی دونوں قسم کی اینٹ ہوتی تھی۔ اسی قسم کے دوسرے آثار صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اس قدیم تمدن میں بہت سی نام نہاد جدید چیزیں بھی استعمال ہوتی تھیں اور یہ نظریہ روز بروز صحیح ہوتا جارہا ہے کہ تہذیب کا چکر بدلتا نہیں بلکہ گھومتا رہتا ہے۔

زراعت خاصے پیمانے پر کی جاتی تھی اور آب پاشی کے ذرائع میں نہریں، تالاب اور نالے شامل تھے۔ غذا میں زیادہ تر گیہوں اور جو استعمال ہوتے تھے۔ جانوروں کا گوشت، دودھ اور ترکاریوں کا استعمال عام تھا۔ معدنیات کا بھی پتہ چلایا جاتا تھا اور سونا، چاندی، تانبا، ٹین اور سیسہ برآمد اور استعمال کیا جاتا تھا۔ سونے چاندی کی "موہن جوداڑو تہذیب" میں قلت نہ تھی اور عام طور پر آرائشی و زیبائشی اشیاء انہی دھاتوں سے بنائی جاتی تھیں البتہ سونے کی بہ نسبت چاندی کی افراط تھی۔ بعض چاندی کے ظروف برآمد ہوئے جو خاصے بڑے تھے اور ان سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ چاندی کی کثرت کی وجہ سے بعض گھریلو اشیاء کافی تعداد میں اس سے بنائی جاتی تھیں۔ تانبے کے ہتھیار اور اوزار بنائے جاتے تھے مثلاً بھالے، برچھیاں، ڈھال، تیر، تلوار، تبر اور بعض ایسے ہتھیار جن کو آج ان کا صحیح نام دینا مشکل ہے۔ ٹین کو تانبے کے ساتھ ملا کر پیتل تیار کیا جاتا تھا اور اس مرکب دھات سے گھریلو زندگی کی مختلف اشیاء بنائی جاتی تھیں۔ اس کے سوا قیمتی ہتھیار سب پیتل کے بنائے جاتے تھے کیونکہ ان کی دھار زیادہ تیز ہوتی تھی۔

عمارتوں کی تعمیر میں پتھر کا استعمال بھی کیا جاتا تھا اور پتھر کے فرش کا بھی رواج تھا۔ اس کے سوا قیمتی پتھروں کی بھی اہمیت سے لوگ واقف تھے اور کئی قسم کے بیش قیمت پتھر بطور جواہرات زیور وغیرہ میں جڑائے جاتے تھے۔

پارچہ بافی کا رواج بھی عام تھا۔ گھروں میں چھوٹے پیمانے پر اور کارخانوں میں بڑے پیمانے پر کپڑے بُنے جاتے تھے۔ سوت اور اون دونوں کا استعمال عام تھا۔ متمول حیثیت کے افراد اون کا استعمال زیادہ شوق سے کرتے تھے اور غربا سوتی کپڑے ہی پہنتے تھے۔ لباس کا مذاق بھی آج کی طرح مختلف تھا۔ لمبے لمبے کرتے پہننے اور گلے میں شال ڈالنے کا رواج متوسط اور متمول طبقہ میں تھا۔

متذکرہ بالا تفصیلات "موہان جو داڑو تہذیب" کی تھیں جس کے متعلق محققین کا اندازہ ہے کہ اس کی قدامت ۳۲۵۰ ق م تک پہنچتی ہے جو یقیناً آریاؤں کے ورود سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ اس لئے عام طور پر جو خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان آریاؤں کی وجہ سے مہذب ہوا غلط ہے بلکہ واقعات بتاتے ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے جو تمدن رائج تھا وہ ... آریائی تمدن سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔

آریا وسط ایشیا سے ہندوستان میں شمال مغربی راستوں سے داخل ہوئے اور اپنے ساتھ اپنا تمدن بھی لیتے آئے جو ہندوستان کے لئے نیا تھا اور اپنے قدم جمنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے تمدنی اثرات بھی جما دیئے اور آہستہ آہستہ موہان جو داڑو تمدن کی جگہ آریائی تمدن نے لے لی اور چونکہ ہندوستان کی تاریخ آریاؤں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے اس لئے آریائی تمدن کو سب سے پہلا ہندوستانی تمدن سمجھا گیا حالانکہ موجودہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ موہان جو داڑو تمدن آریاؤں سے پہلے کا ہے جو کہ زیادہ ترقی یافتہ تھا لیکن وہ آریاؤں کی آمد سے پہلے مٹ چکا تھا۔

آریائی قوم ابتدا میں بھیڑ اور بکریوں کی نگہبانی پر اپنی زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے دودھ اور گوشت سے پیٹ بھرتی تھی اور بال اور پشم سے کپڑا بنا جاتا تھا۔ گھوڑے بیل وغیرہ باربرداری اور سواری کے کام آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زراعت کی طرف اس قوم نے توجہ کی جنگ کے زمانے میں ہتھیار کا استعمال کیا جاتا جو مختلف دھاتوں سے بنائے جاتے تھے۔ جنگی سواری رتھ تھی اور شاہی رومیوں کے اس کا رواج متمول طبقہ میں شوقیہ حد تک پہنچ گیا تھا۔ صنعت و حرفت بھی ضروریات کے موافق تھی۔ پارچہ بافی بھی تھی اور رنگریزی کا کام بھی معمولی طریقہ پر ہوتا تھا۔ نجاری کا پیشہ دوسرے پیشوں کے برابر ترقی یافتہ تھا اور نہ صرف مختلف قسم کا خانگی سامان بنایا جاتا تھا بلکہ کشتیاں بھی بنائی جاتی تھیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ دریائے سندھ اور اس کی نہروں میں کشتیاں عام طور پر چلائی جاتی تھیں اور ان کے ذریعہ لوگوں کی آمد و رفت اور سامان کی حمل و نقل میں سہولت مہیا تھی۔

رفتہ رفتہ آریائی تمدن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا اور وہ تمام باتیں جو ایک عرصہ پہلے غیر منظم اور غیر معین تھیں۔ اب آہستہ آہستہ منظم اور معین ہونے لگیں۔ شہریت بڑھنے لگی اور دیہات میں بھی نئے نئے ترقی یافتہ طریقوں سے کاشت کی جانے لگی جس کا لازمی نتیجہ زرعی خوش حالی تھی۔ یہی تدریجی ترقی صنعت و حرفت میں بھی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تجارت کو فروغ بھی ضروری تھا۔ ایسے ثبوت موجود ہیں جو صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں نہ صرف تجارت ملک کے مختلف مقامات میں جاری تھی بلکہ بیرون ملک بھی اشیا بھیجی جاتی تھیں۔ چنانچہ خاص طور پر محققین نے یہ دریافت کیا ہے کہ ہندوستان اور اسیریا کے مابین حضرت سلیمان کے عہدِ حکومت میں (دسویں صدی قبل مسیح) تجارتی لین دین تھا اور اسیریا کی منڈیوں میں ہندوستانی مال کی بہت مانگ تھی اور اس زمانے کے لحاظ سے وہ بہترین سمجھا جاتا تھا۔

اس کے بعد بدھ مت کے تمدن کا زمانہ آیا۔ اس دور میں معاشی نظام عموماً زمینداری کا سا تھا۔ مالکان زمین کا اقتدار قائم تھا اور وہ حکومت اور رعایا کی درمیانی کڑی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی شخصی اثرات گہرے نہ تھے بلکہ اجتماعی اقتدار کا بول بالا تھا۔ دیہات سدھار کے ساتھ ساتھ شہروں کی رونق بڑھ گئی تھی اور شہریت کا شوق بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں پیشوں اور مزدوری میں خاص انقلاب واقع ہو چکا تھا، پارچہ بافی، نجاری، چمڑے کی صنعت، سیم و زر اور آہن گری۔ جواہر گری، رنگائی، نقاشی وغیرہ اہم پیشے خیال کئے جاتے تھے اور ابھی ذات بندی کا اتنا رواج نہ ہوا تھا کہ لوگ ایک پیشہ کو چھوڑ کر دوسرے پیشہ کو اختیار نہ کر سکیں۔ اس عام آزادی کی بدولت ایک ہی خاندان میں مختلف افراد مختلف پیشہ کرتے تھے اور حرفتوں کی ترقی کے مکمل ذرائع مہیا تھے۔

حرفت اور تجارت میں آہستہ آہستہ اجتماعیت کا عنصر زور پکڑتا جاتا تھا اور پیشہ ورانہ انجمنوں اور اداروں کا قیام عمل میں آ چکا تھا تاکہ ان حرفتوں کی پوری طرح دیکھ بھال کی جائے اور ان کو ترقی کے مواقع مل سکیں۔ گو کہ یہ قدیم وضع کے ادارے تھے لیکن موجودہ تجارتی اور حرفتی اداروں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ اس قسم کی اٹھارہ انجمنوں کا ذکر "بدھسٹ انڈیا"[1] میں رہائس ڈیوز نے کیا ہے جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

(۱) انجمن جس کے اراکین لکڑی کا ہر قسم کا کام کرتے تھے۔
(۲) انجمن جس کے اراکین مختلف دھاتوں کا کام کرتے تھے۔
(۳) انجمن جس کے اراکین مختلف قسم کے پتھروں کا کام کرتے تھے۔

[1] Buddhist India

(۴) انجمن جس کے اراکین ہر قسم کی پارچہ بافی کرتے تھے۔
(۵) انجمن جس کے اراکین ہر قسم کے چمڑوں کا کام کرتے تھے۔
(۶) انجمن جس کے اراکین ہر قسم کے برتن بناتے تھے۔
(۷) انجمن جس کے اراکین برتنوں پر قلعی، پالش اور روپہلی اور سنہری نقاشی کرتے تھے۔
(۸) انجمن جس کے اراکین ہر قسم کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔
(۹) انجمن جس کے اراکین جوہری تھے۔
(۱۰) انجمن جس کے اراکین مچھیرے تھے۔
(۱۱) انجمن جس کے اراکین شکاری تھے۔
(۱۲) انجمن جس کے اراکین کھانے پینے کی اشیا تیار کرتے تھے۔
(۱۳) انجمن جس کے اراکین قصائی تھے۔
(۱۴) انجمن جس کے اراکین حجام تھے۔ یہی ہر قسم کے تیل اور خوشبو کی اشیا بھی تیار کرتے تھے۔
(۱۵) انجمن جس کے اراکین پھل بیچتے اور ہار وغیرہ گوندھتے تھے۔
(۱۶) انجمن جس کے اراکین ملّاح تھے۔
(۱۷) انجمن جس کے اراکین ٹوکریاں بناتے اور بید بافی کرتے تھے۔
(۱۸) انجمن جس کے اراکین نقاش تھے۔

یہ انجمنیں ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کے guilds سے بہت سی حیثیتوں میں ملتی جلتی تھیں۔ ہر انجمن کا صدر ایک خاص اعزاز رکھتا تھا اور حکومت کو جب کبھی گفت وشنید کرنے یا قوانین نافذ کرنے کی ضرورت پڑتی۔ تو صدر سے اکثر مواقع پر مشورہ کر لیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ اپنے طبقہ کا صحیح نمایندہ سمجھا جاتا تھا اور اس لحاظ سے وہ اپنے طبقہ کی فلاح و بہبود کو خوب سمجھتا تھا۔ اِس کے سوا سارے اراکین اس کے قبضے میں ہوتے تھے اور اُسی کے اشاروں پر عمل کرتے تھے۔ اگر ان مختلف انجمنوں میں باہم کوئی نزاع واقع ہوتی تو ایک خاص عہدہ دار جسے اس زمانہ میں "مہاستھی" کہا جاتا تھا فیصلہ کرتا اور اس کا کہا ماننا دونوں انجمنوں کا یکساں فرض ہوتا تھا۔

مختلف حرفتوں میں لوگ انفرادی طور پر چھوٹے پیمانے پر کام کیا کرتے تھے اور دوسرے کے ہاں مزدوری کرنے کو عار سمجھتے تھے اس لئے ہر گھر ایک چھوٹا موٹا حرفتی کارخانہ تھا جہاں ایک ہی خاندان کے افراد باہم مل جل کر کام کیا کرتے تھے۔ ذات پات اور چھوت چھات کی خلیج اتنی عمیق نہ تھی کہ پٹ ہی نہ سکتی ہو اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک ذات کا فرد دوسری ذات والوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتا تھا اور یہ میل جول کسی طرح خلاف مذہب یا سماج نہ سمجھا جاتا تھا۔

تجارتی کاروبار بھی اچھے پیمانے پر چلتا تھا اور یہ لین دین صرف مقامی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ سامان بیرونِ ملک سے بھی آیا جایا کرتا تھا۔ کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سامان لایا اور لے جایا جاتا تھا۔ بحری سفر مذہبی نقطہ نظر سے ابھی بُرا نہ سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح بندرگاہوں کو کافی فروغ حاصل ہو چکا تھا اور یہ دریائی تجارت کے مارکٹ سمجھے جاتے تھے۔ تجارتی کاروبار میں زرِ نقد کا رواج ہو چکا تھا اور قدیم زمانے کی طرح جنس کا معاوضہ جنس قرار نہیں دی جاتی تھی بلکہ تانبے کا سکہ جسے "کہاپانا" کہا جاتا تھا معاوضہ میں لیا اور دیا جاتا تھا۔ قرض کا جو طریقہ اس وقت رائج تھا اس پر سود بھی لیا جاتا تھا۔

اس کے بعد جب "موریائی دور" شروع ہوا تو معاشی حالات نے اور ترقی کی۔ اس خاندان کے بادشاہوں نے زراعت کی ترقی کے لئے خاص طور پر انتظامات کئے۔ سرکاری محکمۂ زراعت قایم کیا گیا اور اس کے مختلف فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی مقرر کیا گیا کہ وہ عام کاشتکاروں کو زراعت کے صحیح اور نفع بخش اصول سے واقف کرائے۔ مفلس کسانوں کو قرض دے۔ زمینات کی بہتری کے لئے تدابیر کرے۔ اجناس کے بازاروں کا تعین کرے اور ان کی نکاس کی سہولیت بہم پہنچائے۔ اس محکمہ کا یہ فرض بھی تھا کہ وہ مویشیوں کی نسل کی ترقی کے ذرائع مہیا کرے اور عوام کو ان کی دیکھ بھال اور پرورش کے صحیح اصول بتائے کیونکہ زمین کے ساتھ ساتھ مویشی کا بھی زراعت سے گہرا تعلق ہے۔

اس دور میں معدنیات کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔ سرکاری محکمہ قایم کیا گیا اور اس کے فرائض میں ملک کے مختلف حصوں کی معدنیات کا پتہ چلانا تھا۔ معدنیات سرکاری ملک سمجھی جاتی تھیں اور بعض دفعہ سرکاری محکمہ خود کھدائی کا کام کرتا تھا لیکن اکثر و بیشتر اجارہ پر دی جاتی تھی۔ دھاتوں کو گلانے کے بھی بہت ہی اصولی اور علمی طریقے معلوم کئے گئے تھے اور ان سے جو اشیاء ضروریات کی تیار کی جاتی تھیں وہ اس دَور کی بہت بڑی خصوصیت ہیں۔ اتنی عمدہ اور صاف اشیا اس سے پہلے تیار نہ ہوتی تھیں۔ اس قسم کا جتنا کام بھی دھاتوں کا ہوتا تھا۔ چاہے وہ ظروف سازی ہو چاہے نقاشی سب کی سب حکومت کی زیرِ نگرانی انجام پاتا تھا اور ایک

خاص محکمہ اس کی ترقی کے احکامات جاری کرتا تھا اور اس کی جانچ پڑتال کرتا تھا کہ کہیں ان میں زوال کے آثار تو پائے نہیں جاتے یا پھر ان میں اگر کوئی خرابی واقع ہونے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں تو کیوں!

مسکرات کی کشید کا ٹھیکہ حکومت ہی کا تھا اور وہی اس کی سربراہی کرتی تھی۔ اسی طرح نمک کا بیوپار بھی حکومت ہی کے ہاتھ میں تھا۔ پارچہ بافی کو فروغ دینے کے لئے متعدد طریقے استعمال کئے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے انعامات کا اعلان ہوتا تھا اور نمائشیں منعقد کی جاتی تھیں تاکہ فن کو اس کی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ کارٹیلیا نے اُونی اور ریشمی کپڑوں کی مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے۔ ریشمی کپڑا بنارس، مگدھ، پانڈیا، سورنا کدیا وغیرہ جیسے شہروں میں اچھا بنا جاتا تھا۔ اور سوتی کپڑا مدھورا، اپارنتا، کالنگا، کاشی، ونگا، واتسا، ماہیشا وغیرہ جیسے شہروں میں بہتر بنا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بھی بہت سارا پشم اور ریشمی کپڑا چین سے آتا تھا۔ میگاس تھنیس جیسے سیاح اور دوسرے عہد کے وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ عام طور پر شہروں کے باشندے خوش پوش نظر آتے تھے۔ بظاہر وہ سادگی پسند معلوم نہ ہوتے تھے اور اس کے برخلاف نفاست اور نزاکت ان کے لباس سے عیاں ہوتی تھی۔

چندر گپت موریا کے زمانے میں پیشوں کی تنظیم سرکاری محکموں کے تفویض تھی۔ شہر پاٹلی پتر میں اس کی تنظیم کے لئے چھ ادارے قائم تھے۔ ہر ادارے میں پانچ اراکین مامور تھے اور ان کا کام تھا کہ جن پیشوں کی نگرانی اُن کے تفویض کی جائے اس کی پوری طرح پابندی کرائیں۔ ایک ادارہ ایسا تھا جو ان سب پر انتظامی نگرانی کرتا تھا۔ کام کے اوقات اور اجرت کی شرح بھی وہی ادارہ مقرر کرتا تھا اور یہ انتظام بالکل اس طریقۂ کار سے ملتا جلتا ہے جو موجودہ ترقی یافتہ زمانہ میں رائج ہے۔

اُن دنوں کاریگر تین گروہوں میں منقسم تھے، ایک شاہی گروہ کہلاتا تھا جو بادشاہِ وقت کے لئے ضروریات فراہم کرتا تھا اور صرف خانوادۂ شاہی کی خدمات ہی بجا لاتا تھا، دوسرا گروہ اُن شہری اداروں سے ملحق تھا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور ان کی کارگزاری شہری زندگی ہی تک محدود رہتی اور تیسرا گروہ دیہاتی کاریگروں پر مشتمل تھا اور وہ موجودہ طرز کے دیہی صنعتی کارخانوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

صنعت و حرفت کے فروغ کی وجہ سے تجارت بھی بہت ترقی کر گئی تھی۔ اگرچہ ذرائع حمل و نقل نہایت ہی محدود تھے اور سوائے بیل گاڑیوں یا بار برداری کے دوسرے جانوروں کے کوئی اور تیز رفتار سواری میسر نہ تھی۔ پانی پر البتہ کشتیوں کے ذریعہ سامان ایک مقام سے دوسرے مقام پر جاتا تھا۔ یہ وسیلہ بھی بیل گاڑیوں سے کم رائج نہ تھا کیونکہ کشتی سازی کے کارخانے کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ اور یہ ذریعہ بعض بڑے بڑے دریاؤں میں زیادہ رائج تھا۔ تب سے کشتیوں کے علاوہ کشتی سازی کی صنعت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ سکندر اعظم کے لئے ایک بحری بیڑے کی تیاری کی گئی تھی اور ایسے حوالے سفرناموں اور تواریخ میں موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی کشتیاں بڑے پیمانے پر تیار ہوتی تھیں اور اس قابل تھیں کہ مصر تک پہنچ سکیں۔

موریا خاندان کے زوال کے بعد بھی یہ تجارتی ترقی برابر بڑھتی ہی گئی اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ابتدائی عیسوی دور میں ہندوستان اور روما کے درمیان تجارتی لین دین تھا۔ چوتھی اور پانچویں صدی بعد مسیح میں ہندوستانی تجارت و حرفت قابلِ رشک حد تک آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس دور سے عمارتوں کی تعمیر کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور اگرچہ یہ ذوق پچھلے ذوق ہی کا ایک ترقی شدہ نمونہ تھا اور اسی کے زیر اثر تھا لیکن اس کی ترقی نے اس کو اس قابل کر دیا کہ وہ ایک نیا تاریخی دور سمجھا جائے۔

اس کے بعد ہی اجنتا کی تعمیر اور نقاشی کی خوبیاں دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ اس زمانہ میں سنگ تراشی مجسمہ سازی اور نقاشی کا معیار جس حد تک پہنچ گیا تھا وہ حیران کن ہے اور اس کی صحیح عظمت آج کی تحقیقات سے واضح ہوتی ہے۔

آٹھویں صدی کے ابتدائی نصف میں ہندوستان پھر ایک دفعہ سنہری دور سے گذرا اور یہ زمانہ جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ راجہ ہرش کا تھا۔ اس کے زمانے میں چینی سیاح "ہیون سوانگ" ہندوستان آیا تھا۔ اس نے خوب جی بھر کے سیاحت کی اور خود راجہ کو بھی قریب سے دیکھا وہ اپنے تاثرات میں لکھتا ہے کہ راجہ اور اس کے خاندان کے افراد نہایت ہی عمدہ محلات میں رہتے تھے اور ان کا ساز و سامان ان کی تمدنی ترقی کا آئینہ دار تھا۔ صنعت و حرفت کی ترقی عروج پر معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سوا عام شہریوں کی حالت بھی معاشرتی نقطۂ نظر سے اچھی تھی۔ ان کا معیار زندگی بھی بڑھا ہوا تھا۔ سنگ تراشی، مجسمہ سازی اور نقاشی کا مظاہرہ ایلورہ کی مشہور "دیول کیلاسا" سے ہو سکتا ہے۔

اس عصر کا مشہور وقائع نگار "بانا" تمدنی ارتقا کا بہت ہی اچھا نقشہ کھینچتا ہے۔ خصوصاً "راج یاسری" کی شادی کی تقریب میں وہ

تنی تفصیلات مہیا کرتا ہے کہ اس سے اس زمانہ کی معاشرت اور معیارِ زندگی کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔ شادی کی رسومات، تقاریب کی شان وشوکت، دعوتوں کا ذکر، مہمانوں کی چہل پہل کے سلسلہ میں لباس وضع قطع، زیورات، سواریوں وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے

تمدنی تاریخ کے محققین کا خیال ہے کہ راجہ ہرلیش کا دور قدیم ہندوستانی معاشی ترقی کا آخری زمانہ تھا۔ موہان جودارو "تمدن" سے لے کر ہرلیش کے زمانے تک صدیوں کا زمانہ معاشی ترقیوں کے جن مختلف ادوار سے گذرا ہے ان کا ذکر اوپر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم کا ہندوستان معاشی نقطۂ نظر سے اتنا پست نہ تھا جتنا کہ آج کل بعض حلقوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل (انگریزی) کتابوں سے مدد لی گئی ہے:-

(۱) موہان جودارو اور دریائے سندھ کی تہذیب۔ موہانجودارو اینڈ دی انڈس سولزیشن

(۲) ویدوں کا ہندوستان۔ (ویدک انڈیا)

(۳) بدھ کے زمانے میں سماجی تنظیم (سوشل آرگنائزیشن ان بدھاز ٹائم)

(۴) بدھ کا ہندوستان (بدھسٹ انڈیا)

(۵) قدیم ہندوستان میں تنظیم عامہ۔ (پبلک ایڈمنسٹریشن ان اینشنٹ انڈیا)

(۶) میگاس تھنیس۔

(۷) ہندوستانی صنعت کار۔ (دی انڈین کرافٹسمین)

(۸) سمتھ کی ابتدائی ہندوستانی تاریخ۔ سمتھس اَرلی ہسٹری آف انڈیا

(۹) البیرونی کا ہندوستان۔ (البیرونیز انڈیا)

(۱۰) تاریخ طبعی۔ (نیچرل ہسٹری)

(۱۱) ہندوستان میں آریائی حکومت۔ (آرین رول ان انڈیا)

(۱۲) ہرلیش چرتر (کا انگریزی ترجمہ)

سید بادشاہ حسن حیدرآبادی

باقیاتِ فانی

پھر ذوقِ تماشا کو مرہونِ اثر فرما
فرصت ہو تو دل پر بھی پھر قصدِ نظر فرما

پھر جان فدا کر لوں تو عشق کو رسوا کر
جب میری خبر آئے تو شرحِ خبر فرما

یہ تیری خموشی بھی گو عینِ تکلّم ہے
مشتاقِ تکلّم سے کچھ پھر بھی مگر فرما

فرمانِ سحر تیرا ہر شام پہ جاری ہے
یارب شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما

فانیؔ نے تجھے چاہا تو بندہ نوازی کر
فانی نے خطا کی ہے تو قطعِ نظر فرما

فانیؔ بدایونی

چاندنی اور سائے

چاندنی رات .... صنوبر کے گھنے سایوں میں،
آہ! محبوب! مرے دل کو نہیں ہے تسکیں!

گو میں نیند کی مدہوش ہُوا ہے انساں
نورِ مہتاب کا سیلاب ہے اُمڈا آتا
ایک چاندی کا پگھلتا ہُوا دریا ہے رواں!
ہے درختوں کی ہر اک شاخ خمیدہ، خاموش
برگ خوابیدہ، فضا نیند میں ساکن، بے ہوش!

چاندنی رات .... صنوبر کے گھنے سایوں میں
آہ! معبود! مرے دل کو نہیں ہے تسکیں!

پھر سے کیوں دورِ گذشتہ کی مجھے یاد آئی؟
جتنے خوابیدہ تھے احساس وہ بیدار ہوئے
خلش تیز سے پھر رُوح مری کانپ اُٹھی،
اور بھولے ہوئے افسانے ہوئے اور قریب!

چاندنی رات .... صنوبر کے گھنے سایوں میں
آہ! محبوب! مرے دل کو نہیں ہے تسکیں!

کر دیا کس نے نئے عزم کا دِل پر افسوں؟
دل تڑپ کر مِرا کہتا ہے کہ ہو جائے جنُوں
کاٹتے کاٹتے مہتاب کی کرنوں کا یہ جال،
عرش پر جا کے خدا سے میں کروں ایک سوال:
ڈوبی کیوں رہتی ہیں اشکوں میں نگاہیں میری؟
تجھ تک آ ہی نہیں سکتیں کبھی آہیں میری!
اس قدر ہیچ ہیں کیا تیری نظر میں آنسو؟
کیا ترے پاس نہیں دل کا مرے کچھ دارُو؟
تری قدرت کے مظاہر بھی غضب کرتے ہیں،
چاندنی اور صنوبر بھی غضب کرتے ہیں!

چاندنی رات .... صنوبر کے گھنے سایوں میں،
آہ! مسجود! مرے دل کو نہیں ہے تسکیں!

ساقی

ہر قسم کی بُنائی کیلئے دلکش
سوہنیشی اُونی دھاگے
BERLIN
REGAL
SILVER MOON
KNOP
CROCHET
MOTI
SUPER MARL
SUPER FINGERING
MARLEX
CHANDNI
REGAL
SITARA
SUPER MARL
MOTI
KNITTING YARNS
LUSTREX
PARROT
PEACOCK
RAM BRAND
CROCHET
BEAR
BUTTERFLY
Dharospun
KNITTING YARNS
بُنائی کیلئے ہمیشہ
دھاروسپن اُون
استعمال کریں
جو کئی قسموں اور خوشنما رنگوں میں مشہور دھاریوال ملز میں مدت سے
تیار ہو رہی ہے
مفت نمونا جات کے لئے
ڈیپارٹمنٹ نمبر ۱۱۴ کو لکھئے
دی دھاریوال وُلن ملز قائم شدہ ۱۸۸۰ء دھاریوال پنجاب
دھاریوال ملز ڈپو: میسن نرسنگھ داس بلڈنگ دی مال لاہور
لوکل نمائندے (۱) میسرز ملاوامل اوتم چند میسن نرسنگھ داس بلڈنگ دی مال لاہور (۲) میسرز گھنشیام داس اینڈ سنز گورو بازار امرتسر
(۳) میسرز ڈی۔ این۔ بخشی اینڈ سنز مرچنٹس اینڈ ایجنٹس راولپنڈی شہر (۴) میسرز بھگوان داس گوردیال۔ بازار بھابڑیاں جموں

ایک اتوار

کردار:۔ (۱) ایک وکیل (۲) اس کی بیوی (۳) ان کا نوکر

منظر:۔ وکیل کا گھر۔ اتوار کا دن

(وکیل صاحب زنان خانے میں صوفے پر دراز ناول پڑھ رہے ہیں۔ بیوی صاحبہ بچے کو نہلا دھلا کر اور نوکر کو شام کے کھانے کے متعلق احکام دے کر وکیل صاحب کے پاس آتی ہیں اور مچل کر وکیل صاحب سے کتاب چھین لیتی ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں تو کتاب فرش پر پھینک دیتی ہیں)

بیوی صاحبہ۔ دن بھر کتاب کے کیڑے بنے رہتے ہو۔ خبر نہیں ان قصے کہانیوں میں کیا دھرا ہے۔

وکیل صاحب۔ کیا کروں اور؟

بیوی صاحبہ۔ کوئی بات کیجئے جس سے دل بہلے۔ اتوار کی چھٹی آپ کتابیں پڑھنے میں گنوا دیتے ہیں۔ ذرا ہنس کر) جی یہ گھر ہے۔ لائبریری نہیں ہے۔

وکیل صاحب۔ تو آؤ باتیں کریں۔ کیا ارشاد ہے؟

بیوی صاحبہ۔ کیا کہوں؟ کبھی کوئی پیار کی بات نہیں کرتے۔ دراصل اب میں پرانی ہو گئی ہوں۔ پہلے تو گھر کا کام بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ تب یہ ناول کہاں چلے گئے تھے؟

وکیل صاحب۔ (مسکرا کر) پرانی تو خیر آپ ہو ہی گئی ہیں، لیکن میرا پیار پہلا سا ہی ہے۔ ہاں اب وہ پہلی سی باتیں نہیں کرتا۔

بیوی صاحبہ۔ یہی تو ثبوت ہے پیار کے کم ہو جانے کا۔

وکیل صاحب۔ واہ، یہ کیوں کر؟ صبح شام جو تمہارے ساتھ سیر کو جاتا ہوں، اس وقت باتیں نہیں ہوتیں کیا؟

بیوی صاحبہ۔ پہلے بھی تو دونوں وقت سیر کو جایا کرتے تھے۔

وکیل صاحب (لاجواب ہو کر) اچھا تو آؤ پھر کرو کوئی بات۔

بیوی۔ بات کیا کروں، یہی پوچھتی ہوں کہ آخر ان کتابوں میں کیا جادو بھرا ہے جو آپ ان میں ایسے گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو جو ناول آپ نے دیا تھا، بالکل اچھا نہیں لگا۔

وکیل صاحب۔ وجہ وہی جو پہلے بھی کئی دفعہ بتا چکا ہوں یعنی تمہاری طبیعت ابھی بچوں کی سی ہے۔

بیوی۔ وہ کیسے؟

وکیل صاحب۔ بس یہی چاہتی ہو کہ ہر طرف تمہارا ہی چرچا ہو، تم ہی سب کی توجہ کا مرکز بنی رہو، اور یہ بندہ آپ کی ہر ادا پر مرحبا کیا کرے۔

بیوی۔ (گچھ تن کر) جی ہاں، میری ادائیں آپ کو کہاں اچھی لگتی ہوں گی آپ تو دوسروں کی محبت کی کہانیاں پڑھ کر خوش ہوتے ہیں اور جی، سچ پوچھو تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ بھی ناولی قسم کے آدمی نہ ہو جائیں۔

وکیل صاحب۔ ناولی قسم کے آدمی کیسے ہوتے ہیں؟

بیوی۔ اونہہ! آپ نہیں جانتے؟

وکیل صاحب۔ تمہیں بتا دو تو کچھ حرج ہے؟

بیوی۔ بس یہی کہ آدمی اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

وکیل صاحب اور جو ناول پڑھے وہ بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے؟

بیوی۔ تو اور کیا؟

وکیل صاحب۔ اچھا اب معلوم ہوا کہ مجھے ناول پڑھنے کی اجازت کیوں نہیں ملتی۔ مگر مجھے تو اس میں عذر نہ ہوگا۔ اگر تم ناول پڑھا کرو مجھے تو تم پر [illegible] نہیں گزرے گا۔

بیوی۔ [illegible] شک کی تائید [illegible] آپ کو ناول پڑھنے سے روک دیا [illegible]

وکیل صاحب۔ (بیوی کی [illegible]) [illegible] تم ناول پڑھو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کہ تم [illegible] قسم کی عورت بن جاؤ گی۔

بیوی۔ (دل کر) ہاں اب چاہے کچھ کہا کرو۔ جیسے میں سمجھتی نہیں۔ آپ بڑے شکی مزاج ہیں۔

وکیل صاحب۔ یہ کیا کہا! میں شکی مزاج کب سے ہو گیا؟ اگر سرکار پڑھا کریں تو اس طرح بات [illegible] نہ [illegible] کریں۔

بیوی۔ پڑھ بھی لوں، اگر آپ پڑھائیں تو۔

وکیل صاحب۔ کہا تو تھا کہ پڑھا کرو جو مشکل لفظ آئے نشان لگا کر رکھ لیا کرو۔ جب میں کچہری سے واپس آؤں تو مجھ سے پوچھ لیا کرو۔

بیوی۔ نہیں، آپ سبق کی طرح پڑھایا کریں۔

وکیل صاحب۔ اچھا تو سبق کی طرح ہی پڑھا دیا کروں گا۔ لاؤ وہ کتاب جو میں نے کل پڑھنے کو دی تھی۔

بیوی۔ وہ ناول؟

وکیل صاحب۔ ہاں وہی ناول

بیوی۔ وہ تو بالکل دلچسپ نہیں!

وکیل صاحب۔ بن پڑھے ہی پتہ لگ گیا کہ دلچسپ نہیں!

بیوی۔ نہیں، میں نے پہلے پانچ صفحے پڑھے تھے۔

وکیل صاحب۔ تو کیا وہ بالکل سمجھ میں آ گئے تھے؟ وہ ناول تو شروع ہی سے بہت دلچسپ ہے۔ پڑھنے لگ جاؤ تو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔

بیوی۔ بہت لفظ ایسے تھے جن کے معنی مجھے نہیں آتے تھے۔ اس لئے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوسکی۔

وکیل صاحب۔ تو لاؤ، وہ مشکل لفظ میں سمجھا دوں۔

بیوی۔ جی نہیں! وہ ناول تو میں نہیں پڑھوں گی۔ آپ نہ مانیں مگر وہ ناول بالکل دلچسپ نہیں ہے۔

وکیل صاحب۔ (جگہ سے اٹھ کر) اور وہ لائبریری سے؟

بیوی۔ (قمیص پکڑ کر) دیکھا! اٹھ کر جانے کا بہانہ ہی چاہتے تھے۔

وکیل صاحب۔ (بیٹھ جاتے ہیں) تمہارے لئے ناول لینے چلا تھا۔ لیکن جانتا ہوں کہ سرکار کا پڑھنے کا ارادہ ہی نہیں۔ یوں ہی باتیں بناتی ہو۔

بیوی۔ (ذرا منہ بنا کر) صبح سے اب تک کام میں لگی رہی۔ اب ذرا فرصت ہوئی تو بات چیت کو دل چاہا۔ مگر آپ ناول دے کر ٹالنا چاہتے ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ پڑھ رہے ہیں، ہمیں تو ناول چاہیے۔ آپ کو دراصل ناولوں کا سودا ہو گیا ہے۔ اگر پڑھنا ہی ہو تو کوئی قانون کی کتاب پڑھئے۔ میں بھی سمجھوں کہ کوئی کام کی چیز پڑھ رہے ہیں۔

وکیل صاحب۔ قانون بھی پڑھتا ہوں، رات کو لائبریری میں۔ اگر قانون نہ پڑھوں تو پریکٹس کیا خاک چلے اور آنجناب کے لئے یہ سمور کے کوٹ اور ریشمی ساڑھیاں کہاں سے آئیں؟

بیوی۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ قانون نہیں پڑھتے۔ یوں ہی ناحق کوٹ اور ساڑھیوں کے طعنے دینے لگ پڑے۔ (مجروح لہجے)

وکیل صاحب۔ طعنے میں کیوں دینے لگا؟ تم اچھے کپڑے اور ساڑھیاں اپنے لئے تھوڑا ہی پہنتی ہو؟ یہ تو سب میرے ہی لئے ہیں نا!

بیوی۔ اب پھر مذاق کی سوجھی!

وکیل صاحب۔ نہیں، سچ کہتا ہوں۔

بیوی۔ سچ کہتے ہو؟

وکیل صاحب۔ ہاں۔

بیوی۔ تو وہ ساڑھی جو پرسوں پھتو مل بزاز کے ہاں دیکھی تھی، کیوں نہیں لا دیتے؟

وکیل صاحب۔ چلو لے دوں گا، وعدہ کرو کہ مجھے پڑھنے سے نہیں روکو گی بلکہ خود بھی میرے کہنے کے مطابق پڑھا کرو گی۔ پیاری لتا! اگر میں تم کو ظاہری خوبصورتی کے لئے ساڑھیاں پہنتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں، تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم اچھی کتابیں پڑھ کر باطن بھی خوبصورت بنا لو۔

بیوی۔ تو کیا ناول پڑھنے سے ہی باطن خوبصورت بنتا ہے؟

وکیل صاحب۔ کہانی ہو، ڈراما ہو، نظم ہو، ناول ہو لیکن میرے خیال میں ناول سب سے اچھا ذریعہ ہے۔

بیوی۔ ہمیں تو آپ سے ہی معلوم ہوا کہ ناول پڑھنے کا بھی کوئی فائدہ ہے ہماری ہیڈ ٹیچر تو ہمارے ناول پڑھنے کے سخت خلاف تھی۔

وکیل صاحب۔ کوئی خر دماغ عورت ہوگی۔

بیوی۔ (ہنس کر) ہاں، ہم سب لڑکیاں اس سے نفرت کرتی تھیں، اور وہ چھوٹی مسٹریس جو نظمیں کہنا جانتی تھی، اسے ہم سب چاہتے تھے۔ بھلا نظم تو کوئی بات ہوئی، ناول میں کیا دھرا ہے۔ ایسے ہی ادھر اُدھر کی گپیں ہوتی ہیں۔

وکیل صاحب۔ تم کیا جانو اسکول کی لڑکی (ہو) ناول، لٹریچر کی قدر!

بیوی۔ جس کو سمجھ نہ ہو اسے سمجھا دینا چاہئے۔

وکیل صاحب۔ لیکن اگر بے سمجھ سمجھنا نہ چاہے تو۔

بیوی۔ نہیں، سمجھوں گی، سمجھائیے تو سہی۔

وکیل صاحب۔ ہنسو گی تو نہیں!

بیوی۔ (سر ہلا دیتی ہے)

وکیل صاحب۔ بات یہ ہے کہ سارے لٹریچر کا مدعا انسان کا تجربہ بڑھانا ہے اور ناول اس مدعا کو بہترین طور پر پورا کرتا ہے۔

بیوی۔ تجربہ بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تو کسی تجربے وجربے کی ضرورت نہیں معلوم دیتی۔ بس یہی چاہتی ہوں کہ آپ خوش رہیں اور مجھے بیل کی طرح اپنے سے لگی رہنے دیں (شوہر سے لپٹ جاتی ہے گویا سرو سے بیل لپٹ گئی ہے)

وکیل صاحب۔ (پیشانی کا بوسہ لے کر) تو تجربے کا کوئی فائدہ نہیں؟

بیوی۔ کیا فائدہ ہے؟ اگر سب لوگ تجربے کے پیچھے پڑ جائیں تو دھرم ایمان کہاں رہ جائے گا!

وکیل صاحب۔ دیکھا پھر وہی شوخی! جیسے سمجھتی ہی کچھ نہیں۔ میرا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم سب کو نیکی بدی کا تجربہ بذاتِ خود کرنا چاہئے۔ میں تو اس کے اُلٹ کہہ رہا ہوں۔ ناول پڑھ کر تجربہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اوروں کا تجربہ معلوم کر کے سب باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں (مفکرانہ انداز میں پھیل کر) ناول کا مصنف ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کا یا تو اپنا تجربہ وسیع ہوتا ہے۔ یا اس میں ایک ایسا خداداد ملکہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے تجربے کو خود ان سے کہیں بہتر سمجھتا ہے۔ اُسے وہ ناول میں ظاہر کرتا ہے اجسے پڑھ کر عام لوگوں کو تجربہ کئے بغیر ہی تجربہ کے نتائج حاصل ہو جاتے ہیں۔

بیوی۔ (ہنستی ہوئی اپنا ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال کر اٹھنا چاہتی ہے) یہ منطق میری سمجھ سے باہر ہے۔

وکیل صاحب۔ (نہیں چاہتے کہ وہ علیحدہ ہو جائے) سمجھنے کی کوشش کرو نا۔ پیاری، میں تو بہت سادہ الفاظ میں سادی بات کہہ رہا ہوں۔

بیوی۔ (مچل کر) اچھا، تو پھر کہئے۔

وکیل صاحب۔ پھر کیا کہنے کی بات ہے! یہی فرض کر لو کہ ناول میں ایک عورت کی کہانی ہے جو کسی وجہ سے اپنے خاوند سے بے وفائی کرتی ہے اور اس کے نتائج برے نکلتے ہیں۔ اب ناول پڑھنے سے پتہ لگ جائے گا کہ اس کا اصلی ذمہ دار کون ہے اور کہاں تک۔ بیوی کی سرشت میں نقص ہے یا خاوند کے وطیرے میں۔ چنانچہ اگر ہم سوچ سمجھ کر ناول پڑھیں گے تو کسی بدنصیب پر ناحق الزام نہیں تھوپیں گے اور خود بھی اس سے سبق لیں گے۔

بیوی۔ (جس کی ہمدردی قدرتاً عورت سے ہے) نقص خاوند کے وطیرے میں ہی ہوتا ہے، نہیں تو کون عورت بے وفائی کرنا چاہتی ہے۔

وکیل صاحب۔ (بیوی کا گال پیار سے تھپکتے ہوئے) سنو تو سہی، فرض کرو خاوند کا قصور زیادہ ہے تو جو سے خاوند ایسا ناول پڑھیں گے وہ خود میں ایسے نقص پیدا نہیں ہونے دیں گے اور اپنی بیویوں کو بے وفا ہونے پر مجبور نہیں کریں گے۔

بیوی۔ تو کیا ناول پڑھنے والے آدمی ہی اچھے خاوند بنتے ہیں! ناول نہ ہوئی ہدایت نامہ خاوند ہوا۔

وکیل صاحب۔ (ہنس کر) تم تو ہر بات کا مذاق اڑانا جانتی ہو۔ میں کہتا ہوں، ناول پڑھنے سے چونکہ آدمی کا تجربہ وسیع ہو جاتا ہے وہ کشادہ دل اور بردبار ہو جاتا ہے۔ وہ ہر بات میں دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور بے وجہ کسی بات

کے نتائج بد کا دوسروں کو ذمہ دار نہیں سمجھتا۔

بیوی۔ آپ تو ماں باپ ہی کشادہ دل نہ ہوئے۔ مجھ سے تو ہمیشہ تنگ دلی ہی سے پیش آتے رہتے ہیں۔

وکیل صاحب۔ واہ! مجھ سا کشادہ دل کون ہو سکتا ہے! جتنے قصور آپ کرتی ہیں، میری کشادہ دلی ہے جو کبھی ماتھے پر بل نہیں آنے دیتا۔

بیوی۔ واہ صاحب واہ! قربان جائیے آپ کی کشادہ دلی کے۔ کتنی وہ دلی ہی تو ہے کہ نوکر سے اور بزاز کی بات جو میں نے ایک ہفتہ سے تقاضا کر رہی ہوں اور آپ بر بحث دیئے جاتے ہیں۔ قصور ہو جائے تو خیر نہیں۔ آپ تو معاف کرنا جانتے ہی نہیں۔

وکیل صاحب۔ سینکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں جہاں آپ نے قصور کیا اور میں نے جتایا تک نہیں۔

بیوی۔ اچھا، کہیں ڈائری تو نہیں رکھتے میرے قصوروں کی؟ ذرا بتائیے تو سہی میں سے اٹھ کر سامنے بیٹھ جاتی ہے)

وکیل صاحب۔ اور کیا نہیں رکھتا! (کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ کی جیب میں سے ڈائری نکال کر، ورق الٹے پلٹنے کی کارگزاری ہی سن لو۔ یکم مئی۔ مجھ سے بے وجہ بحث کی اور دوران بحث میں بے وقوف کہا، جو ایک نیک بخت بیوی کے لئے بے حد نامناسب بات ہے۔

بیوی۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ حافظہ خراب ہو گیا ہے۔ یہ تو حافظے کی خرابی ہے کہ میں نے آپ کو بیوقوف کہا؟

وکیل صاحب۔ ۲ مئی۔ مجھ سے ناراض ہو کر بچے کو پیٹا۔ ایسی حرکت صرف بے وقوف اور بے رحم مائیں کیا کرتی ہیں۔ بچہ بہت رویا اور مجھے بھی بہت دکھ ہوا۔

بیوی۔ جتنا جھوٹ جی چاہے بولتے جائیے۔

وکیل صاحب۔ اچھا یہ بھی ڈائری میں نوٹ کرنا پڑے گا۔

بیوی۔ کر لو، ابھی کر لو۔

وکیل صاحب۔ ۶ مئی۔ جب میں کچہری سے واپس آیا تو بیوی تیوری چڑھائے پھرتی تھیں۔ نوکر پر خفا ہوئی ہوں گی۔ ایک دو دفعہ بلانے پر بھی نہ بولیں۔ پھر جب میں پندرہ منٹ آرام سے چپ چاپ لیٹا رہا تو اٹھلاتی ہوئی آئیں اور پہلو میں بیٹھ گئیں یعنی اگر پیار سے بلاؤ تو بولتیں ہی نہیں اور نہ بلاؤ تو چین نہیں لینے دیتیں۔

بیوی۔ پیار سے ضرور بلایا ہوگا۔ کام میں دھیان ہوگا تو نہیں بولی ہوں گی اور آپ عادت کے مطابق روٹھ گئے ہوں گے۔ اگر روٹھے کو منا لیا تو کیا برائی کی؟ یہ بھی عجب قصور ہے

وکیل صاحب۔ ۱۰ مئی۔ بزاز کی دکان پر کپڑا خرید رہے تھے۔ فردار کوٹ لینے پر اصرار کیا اور میرے نہیں نہیں کرنے کے باوجود بزاز سے کہہ دیا کہ بنڈل باندھ دو۔ میں سخت شرمندہ ہوا۔ وہ بزاز کیا خیال کرتا ہوگا؟ میں لوگوں میں زن مرید نہیں کہلانا چاہتا۔

بیوی۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ کوٹ کیوں لیا، باقی باتیں تو سب کہنے کی ہیں۔ آپ کے پاس تین گرم سوٹ ہیں۔ میرے پاس تین کوٹ ہو گئے تو کونسی قیامت آ گئی!

وکیل صاحب۔ ۱۲ مئی۔ دوپہر کے کھانے میں نمک بہت زیادہ تھا پوچھا تو نوکر کا قصور بنایا گیا۔ کہا کہ نوکر کے کام کی نگرانی کیوں نہیں کرتیں؟ تو اس پر بے فائدہ تکرار کی اور اپنی غلطی نہیں مانی۔

بیوی۔ اچھا، تو وہ نمک والی بات بھی اتنی ضروری تھی کہ ڈائری میں نوٹ کر لی جائے۔

وکیل صاحب۔ ۱۳ مئی۔ نوکر سے سخت درشت کلامی کی۔ یہ اچھے گھروں کی بیویوں کا قاعدہ نہیں۔ اس سے رعب قائم نہیں رہتا نوکر بے جھجک ہو جاتا ہے، اس کے دل میں مالکہ کی وقعت کم ہو جاتی ہے، سننے والے کے دل پر بھی برا اثر ہوتا ہے

بیوی۔ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ نوکر سے کچھ نہ کہوں تو کہتے ہیں ٹھیک نگرانی نہیں کرتی اور ذرا ڈانٹ ڈپٹ رکھوں تو درشت کلامی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ میں کس بھاڑ میں پڑوں (سسکیاں بھرنے لگ جاتی ہے)

وکیل صاحب۔ ۱۶ مئی۔ ہمسائی سے تو تو میں میں کی۔ میرے روکنے پر وہی توپ میری طرف کر دی۔ شام کو مجھے اس کے خاوند کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تو پھر مجھ پر برس پڑی کہ تم اس بدذات کے خاوند کے دوست ہو، حالانکہ وہ میری جان کی دشمن ہے۔

بیوی۔ اتنی بھی ہمدردی اگر نہ ہو تو خاوند بیوی کا رشتہ کیا ہوا؟

وکیل صاحب۔ ۱۹ مئی۔ اسی ہمسائی سے اب بھر بن گئی ہے۔ وہ آج گھنٹہ بھر یہاں بیٹھی رہی۔ میں بھی آج بابو جی کے ہاں ناشتہ

کھیلنے جاؤں گا۔ وہ نہایت خوش خلق آدمی ہیں، میں کیوں بے وجہ ان سے بگاڑے رکھوں! یہ تو آج جس سے لڑتی ہے۔ پرسوں اسی کی سہیلی بن جاتی ہے۔

بیوی۔ اچھا جو وہ مجھے بلائے تو میں کیا کروں۔ وہ خود بخود میرے ہاں آگئی تھی، میں تو اسے بلانے نہیں گئی۔ اچھا ہوتا جو کہہ دیتی کہ چلی جاؤ میرے گھر سے۔ پھر کہتے کہ تو تہذیب سے عاری ہے۔

وکیل صاحب۔ ۱۲ مئی۔ آج پھر نوکر کو بہت سخت سست کہا معلوم نہیں اسے ماں باپ نے کیسی تربیت دی ہے۔ نوکر تنگ آمد بجنگ آمد سامنے بول اٹھا میں نے اس میں اپنی بہت توہین سمجھی نوکر پر غصہ تو بہت آیا لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ قصور تو حضور ہی کا ہے۔ چپکا ہو رہا۔ اگر پھر ایسا ہوا تو نوکر کو جواب دے دوں گا اور پھر سب کام آنجناب کو خود ہی کرنا پڑے گا۔

بیوی (روتے ہوئے) تو مجھ سے نوکر اچھا ہوا۔ وہ میرے سامنے بولے اور آپ میرا قصور ٹھہرائیں اور چپکے پڑے رہیں، ناول پڑھے جائیں۔ یہ ہے میری قدر آپ کے دل میں (اٹھ کر چل دیتی ہے لیکن اب کے شوہر پکڑ کر نہیں بٹھاتا اور چند لمحے چپ بیٹھے رہنے کے بعد ناول اٹھا کر پڑھنے لگ جاتا ہے)

بیوی (رسوئی میں) ارے چندو، یہ گھی کدھر گیا!

نوکر۔ ختم ہو گیا بی بی جی۔

بیوی۔ ختم ہو گیا! پانچ سیر گھی ختم کر دیا اتنی جلدی!

نوکر۔ بی بی جی، مہینے میں پانچ سیر گھی بھی ختم نہ ہوتا!

بیوی۔ موئے، مہینہ کہاں ہوا ابھی! مشکل سے بیس روز ہوئے ہوں گے۔

نوکر۔ بی بی جی، دو دو کھانے دونوں وقت پکتے ہیں۔ گھی کا خرچ ہوتا ہی ہے۔ میں کہیں بیچ تو نہیں آتا۔

بیوی۔ (پارہ ۱۰۵ درجے پر) موا، لنگوٹا، باتیں بناتا ہے۔ تو اب تجھے بیچنے کو لا دوں گھی؟ کھاتا ہوگا، یونہی تو نہیں دُنبا بنا جاتا۔ دیکھو تو ہی منہ پر آنکھیں نہیں دکھائی دیتیں۔ ہائے ملعون دل بے رحم۔

نوکر۔ بی بی جی۔۔۔۔

بیوی۔ بکواس مت کر۔ میں جانتی ہوں تجھے۔ چور کہیں کا۔

نوکر۔ بی بی جی، ناحق گالی دیئے جاتی ہیں۔

بیوی۔ گالی دیتی ہوں تجھے بڑے شریف زادے کو۔ تو تو جوتیوں کے لائق ہے۔ جوتا رسید کروں گی اگر اور بکواس کی (نوکر بڑبڑاتا ہوا کام میں لگ جاتا ہے۔ بی بی کا دھیان لکڑیوں کی طرف جاتا ہے) ارے کم بخت روپے کی لکڑیاں ابھی پرسوں لایا تھا۔ جلا بھی دیں۔ کیا کرتا ہے تو لکڑیوں کو! اپنے اماں باوا کو جلاتا ہے ان سے!

نوکر۔ (ذرا گستاخ ہو کر) پرسوں کب لایا تھا! پانچ دن ہو گئے ہیں۔ پہلے بھی روپے کی لکڑیاں پانچ دن ہی جاتی ہیں۔ گالی مت دو بی بی جی، میں آپ سے کہے دیتا ہوں۔ میں یہاں گالیاں کھانے نہیں آیا۔

بیوی۔ تو ہم پر حکم چلانے آیا ہے، رائے زادہ کہیں کا۔ صبح چار بجے اٹھ کر تو آگ جلا کر تاپنے لگ جائے، رات کو بارہ بجے تک تاپتا رہے۔ گرم پانی کے بغیر تو نہا نہیں سکتا۔ لکڑیاں زیادہ نہ جلیں تو کیا ہو! تو کوئی نرا جہ آگیا ہے ہم پر حکم چلانے، اپنی مرضی کا گھی خرچ کرنے، من مانی لکڑیاں جلانے۔ پوچھیں تو آگے سے جواب دیتا ہے۔ کمبخت کہیں کا۔

نوکر۔ بی بی جی، آپ نوکر اور رکھ لیں، مجھ سے آپ کی نوکری نہیں ہوتی پہلی تاریخ کو میری تنخواہ کا حساب کر دیجئے اور مجھے چھٹی دیجئے آپ کی نوکری کرنے سے تو بھیک مانگ لینا اچھا۔

بیوی۔ ایک کوڑی نہیں دوں گی تنخواہ کی، چلا جا بے شک۔ بہتیرا گھی کھایا ہے اور چوری کا دودھ پیا ہے۔

نوکر۔ بی بی جی، ان ہونی باتیں کہتی ہیں۔ دو سیر روز کا دودھ لیتے ہیں۔ آپ پیتے ہیں، بابو جی پیتے ہیں، پھر دہی جماتے ہیں۔ لسی بناتے ہیں۔ میرے پینے کو دودھ بچتا کہاں ہے؟

بیوی۔ تو اچھا تین سیر لیا کریں۔ ایک سیر تجھ امیر زادے کے لئے؟

نوکر۔ میں دودھ نہیں مانگتا، بی بی جی۔ مجھے تو چھٹی چاہئے آپ کے ہاں سے۔

بیوی۔ بے شک جاؤ، چاہے آج ہی چلے جاؤ۔

نوکر۔ اچھا بابو جی سے پوچھ کر چلا جاؤں گا۔

بیوی۔ بابو جی ہی تو تیرا منہ کھلواتے ہیں میرے سامنے۔

(وکیل صاحب کے پاس سویا ہوا بچہ جاگ اٹھتا ہے اور رونے لگ جاتا ہے)

وکیل صاحب۔ لتا، ہریش جاگ اٹھا۔

(لتا نوکر کا پیچھا چھوڑ شوہر کے کمرے میں واپس آتی ہے، اور بچے کو

(تھپکتی ہے تاکہ بچہ سو جائے)

بیوی۔ ارے بیری، تو کیوں جاگ اٹھا ابھی سے۔ ابھی تو ایک گھنٹہ تیرے سو ہوئے ہیں۔ اب تو بھی میری جان کھائے گا۔ (زور زور سے تھپکتی ہے۔ لیکن بچہ سوتا نہیں، روئے جاتا ہے) ہائے رام سبھی میری جان کے لاگو ہیں۔

وکیل صاحب۔ سب سے زیادہ میں۔

(بیوی بولتی نہیں اور بچے کو تھپکے جاتی ہے)

بیوی۔ (اسے سو بھی جا، پھر تھپکتی ہے۔ لیکن بچہ روئے جاتا ہے)

وکیل صاحب۔ یہ نہیں سوئے گا۔ اب اسے باہر لے جاؤ۔

بیوی۔ آپ کو تو نہیں دیتی۔ ڈرتے کیوں ہیں۔ پڑھتے رہئے ناول بے فکر ہو کر۔ (بچے کو اٹھا کر باہر چل دیتی ہے) اسے چندو! (چندو دوڑا آتا ہے) ہاں بی بی جی۔

بیوی۔ لے اسے لے جا باہر باغ میں۔ آدھ گھنٹے سے پہلے نہ لانا۔ دودھ مانگے گا اور تنگ کرے گا ناحق۔

نوکر۔ (بچے کو لے کر) بی بی جی، دال کا خیال رکھنا، آگ تیز نہ ہو جائے۔

بیوی۔ تو دال ابھی نہیں بنی؟ کیا کرتا رہا ہے اتنی دیر؟

(نوکر کوئی جواب نہیں دیتا، بچے کو لے کر باہر چل دیتا ہے)

نوکر کیا ہے، میری جان کا دشمن ہے۔ ابھی تک دال نہیں بنائی اب ایک دم آگ زیادہ کر گیا ہے۔ دال خراب نہ ہوگی تو کیا ہوگا۔ اور غصہ مجھ پر اترے گا۔

(وکیل صاحب خاموشی سے ناول پڑھتے جا رہے ہیں۔ بیوی دو تین دفعہ کمرے میں سے ادھر ادھر گزرتی ہے۔ منہ لٹکا ہوا اور آنکھوں میں آنسو۔ آخر پاس کے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتی ہے)

وکیل صاحب۔ (کچھ دیر بعد) لتا روتی کیوں ہو؟ (کوئی جواب نہیں آتا) لتا، ادھر آجاؤ، روؤ نہیں۔ (کوئی جواب نہیں) لتا، کیوں رو رو کر آنکھیں خراب کر رہی ہو؟ (لتا کا رونا سسکیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے) ابھی سے دیکھو حلقے پڑ گئے ہیں۔ ہمیں پر رحم کرو، اور ہماری خوبصورت آنکھیں خراب نہ کرو۔ تمہیں ان کی قدر نہیں تو نہ ہو۔ ہمیں تو ہے (لتا سسکیاں بھرے جاتی ہے)

اچھا بھئی، آپ ہی اٹھ کر لاتے ہیں اپنی پیاری کو (یہاں ناول فرش پر پٹک دیتا ہے) اس کمبخت ناول نے تو میری لتا کو مجھ سے خفا کر دیا (جا کر لتا کی بغلوں میں باہیں ڈال کر اٹھاتا ہے اور کھینچ کر صوفے پر لے آتا ہے) دیکھو اب تو ناول نہیں پڑھ رہا۔ آؤ باتیں کریں (لتا کی سسکیاں بند ہو جاتی ہیں، لیکن وہ ابھی چپ چاپ روتے جاتی ہے) اچھا اگر مجھ سے پیار کرتی ہو تو باہیں گلے میں ڈال دو۔ (لتا کوئی حرکت نہیں کرتی) تو اس کا مطلب ہے پیار نہیں کرتیں۔ اچھا جی، ہمیں تو پیار آتا ہے (اسے بازوؤں میں بھینچتا ہے، وہ بھی ہولے سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے) پیار آتا ہے نا (وہ باہیں بھینچتی ہے) ہاں اس طرح۔ اچھی تو تم بہت ہو، لیکن عادت بری پڑ گئی ہے؛

بیوی۔ (بچوں کی طرح رونی آواز میں) وہ کیا؟

وکیل صاحب۔ یہی کہ لڑتی نوکر سے ہو اور غصہ مجھ پر۔

بیوی۔ ہمارے غصے کی پروا کون کرتا ہے۔

وکیل صاحب۔ پروا نہ کرتا تو مناتا کیوں؟

بیوی۔ آج منا لیا تو بڑا غضب ہو گیا۔ لکھ لینا اسے بھی ڈائری میں۔

وکیل صاحب۔ (ہنس کر) اس میں کچھ برائی نہیں۔

بیوی۔ میں نے سینکڑوں دفعہ آپ کو نہیں منایا؟ میں بھی اب سب کچھ ڈائری میں لکھ لیا کروں گی۔

وکیل صاحب۔ پھر تو ہماری ڈائریوں کا ایک ناول بن جائے گا۔

بیوی۔ (ہنس کر اور فرطِ محبت سے شوہر کے گلے لگ کر) سچ مچ! ہمارے متعلق بھی کسی کو ناول لکھنا چاہئے۔

وکیل صاحب۔ پڑھے گا کون؟

بیوی۔ ہم پڑھیں گے!

سنت سنگھ

ایم اے۔

Not Good.
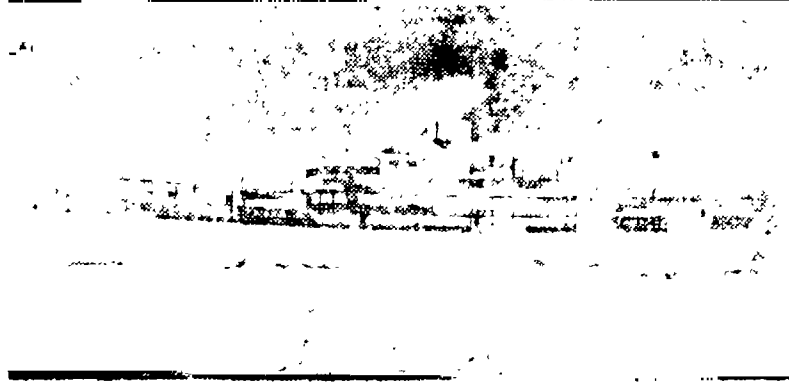
ہندوستانی حاجیوں کے لئے ہندوستانی کمپنی کے عظیم الشان تیز رفتار
جہازات
"المدینہ" اور "الہند"
حجاج اب مکمل آسائش اور اطمینان کیساتھ مختصر عرصہ میں اپنا فریضۂ حج ادا کر سکیں گے
حج لائن کے تمام جہازات "المدینہ" اور "الہند" وغیرہ جدید ترین آلات و ایجادات سے آراستہ حجاج کرام کے باآرام لیجانے کے لئے منتظر ہیں۔ اگر آپ امسال حج کا ارادہ فرما چکے ہیں تو پہلی فرصت میں ان جہازوں پر اپنی جگہ مخصوص کرالیں۔ چونکہ صرف یہی جہازات ہیں جن میں آپ
(۱) مخصوص اور صاف جگہ پر باجماعت نماز ادا کر سکیں گے (۲) مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں سے لبریز کتب خانہ کی موجودگی میں فرصت کے اوقات میں مطالعہ کر سکیں گے۔ (۳) ہر وقت میٹھا پانی برت سکیں گے۔ (۴) ڈک میں برقی پنکھوں کی کثرت اور قدرتی ہوا کی بہم رسانی کے لئے ہوادانوں کی کثرت کی وجہ سے یہ محسوس نہ کر سکیں گے کہ آپ بحر عرب یا بحر احمر میں سفر کر رہے ہیں۔ (۵) درجہ اول و درجہ دوم کے آرام دہ کمرے، عام تفریحی کمرے، اور شاندار سیلون کو اعلیٰ پر تکلف ساز و سامان سے سجا ہوا پائیں گے۔ (۶) ڈک سے سفر کرنے والی مستورات بھی اپنی مخصوص جگہ پر پہل قدمی یا ہوا خوری کر لیا کریں گی۔ (۷) ہمندر میں ہونے کے باوجود دنیا کی تازہ ترین خبروں سے بذریعہ ریڈیو واقف ہونگے۔ (۸) اس طول طویل سفر کو بالکل مختصر عرصہ میں طے کرنے کے علاوہ عمدہ و خوش ذائقہ غذا اپنے مذاق کے مطابق پائیں گے۔
مزید معلومات مندرجہ ذیل پتہ سے دریافت کریں:۔
حج لائن
(۱) دی سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ بلارڈ اسٹیٹ بمبئی
(۲) " " " " " نیپئیر روڈ۔ کراچی
(۳) " " " " " نمبر ۱۰ کلائیو سٹریٹ کلکتہ
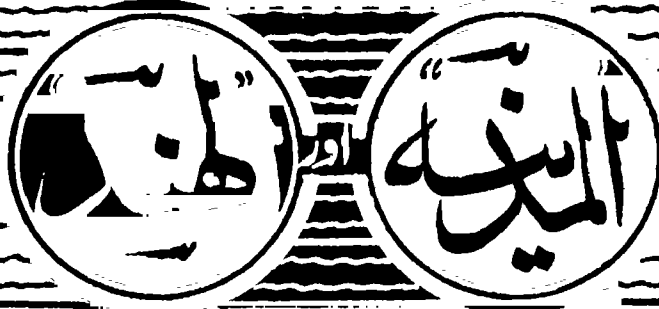
بھارت
بیمہ زندگی کی دنیا میں بھارت نے اپنی ٹھوس
اور تدریجی ترقی کا بیش بہا ریکارڈ قائم کر دیا ہے بیمہ پالیسیوں کی شرائط فراخدلانہ ہونے کے علاوہ
کمپنی پالیسی ہولڈروں کے حقوق کی پوری حفاظت کرتی ہے اسی وجہ سے بھارت کو بیمہ کمپنیوں میں ممتاز درجہ حاصل
پبلک اعتماد میں بہترین ہے
بھارت انشورنس کمپنی لمیٹڈ بھارت بلڈنگس لاہور
چیئرمین
سیٹھ رام کشن ڈالمیا
ڈائرکٹر انچارج
راجندر کمار جین
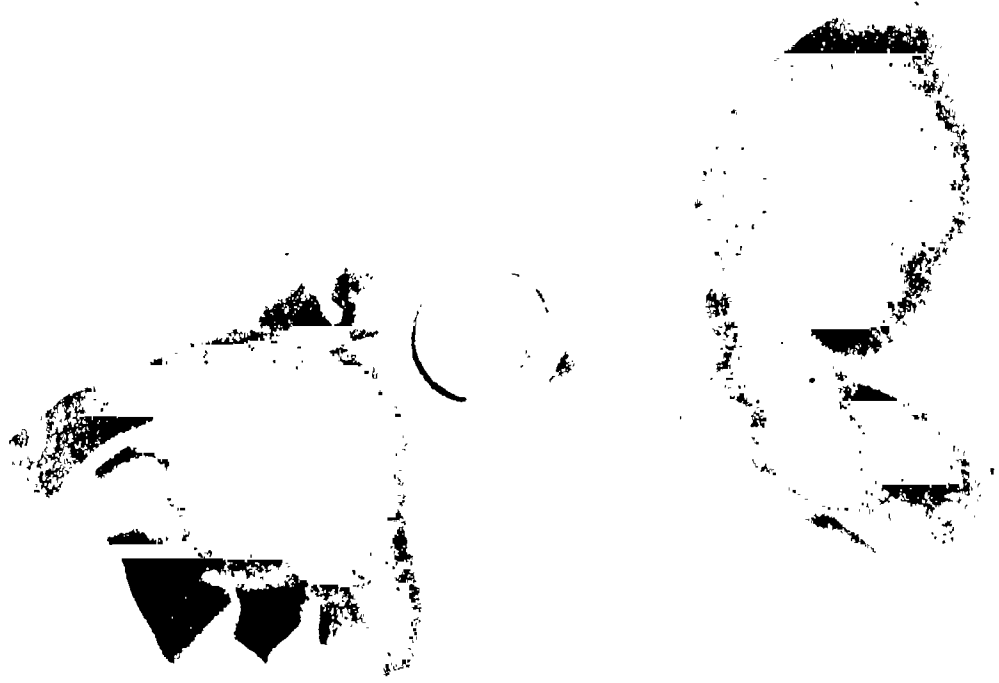
ہے

ں ہے،

یں ہے،

ں

...سا اچل

ہر سانچے میں ڈھل جا!

ہر کے موجوں کو نگل جا!

چل دے!

کو کچل دے!!

سکندر علی وجد

رقص بہار

پیامِ زیست

ـتے کیسے سحاب آئے خس و خاک پہ برسے — خالی ہی رہی روح تری نورِ سحر سے

لے تیرے واقف نہ ہوئے بامِ اثر سے — ہستی کو جلا سوزِ دلِ اہلِ نظر سے!

بے ذوقِ نمو غنچہ کبھی کھل نہیں سکتا

گر پیاس نہ ہو آبِ بقا مل نہیں سکتا

تو کرمکِ شب شعلۂ بے باک نہیں ہے

تیرا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

فہرستِ شجاعاں میں ترا نام نہیں ہے — فطرت کا ترے واسطے انعام نہیں ہے

تو مرغِ قفس مرغِ لبِ بام نہیں ہے — تیرے لئے حسنِ سحر و شام نہیں ہے

یا پہرۂ فطرت پہ بھی ڈالی ہیں نگاہیں؟ — کس وقت گلستاں میں سنکتی ہیں ہوائیں!

جی ہیں کبھی صبح کے سورج کی شعاعیں؟ — ہنگامِ سحر بھی کبھی مانگی ہیں دعائیں!

نصرت کا نشہ صرف دلاور کے لئے ہے

آسائشِ ساحل تو شناور کے لئے ہے

گر صبحِ سعادت کا پیمبر نہیں ہوگا

اونچا کبھی دنیا میں ترا سر نہیں ہوگا

غمگیں نہ ہو ادبار کے چھٹ جائیں گے بادل — میلی نہ ہو آنکھ اور نہ ابرو پہ پڑیں بل

مفتاحِ درِ عشق ہے تدبیرِ مسلسل — اقدام تو کر دہر میں پڑ جائیگی ہلچل

لاک پہ چھائی ہیں گہربار گھٹائیں — بادل سے سدا برق دکھاتی ہے ادائیں

ہر روز مچلتی ہیں طربناک ہوائیں — سو بار کرن لیتی ہے غنچوں کی بلائیں

درِ بخششِ فطرت کا کبھی بند نہیں ہے

افسوس یہ ہے تو ہی غرض مند نہیں ہے

تفریقِ شب و روز کوئی بات نہیں ہے

تقویمِ دلاور میں کہیں رات نہیں ہے

اک تیر کے مانند بلاؤں سے نکل جا! — سیماب صفت جلد ہر اک سانچے میں ڈھل جا!

بدلی ہے زمانے کی فضا تو بھی بدل جا — طوفاں کی دوا یہ ہے کہ موجوں کو نگل جا!

گونگے کے مقدر میں نہیں لطفِ فصاحت — معذور کی قسمت رہی محرومِ شجاعت

پتھر کو عطا ہو نہ سکا جوہرِ الفت — جو سوتے ہیں اور ان کو سلا دیتی ہے فطرت

ٹھوکر جو لگے راہ میں خاموش نہ چل دے!

گر امن کا طالب ہے تو فتنوں کو کچل دے!!

سکندر علی وجدؔ بی اے

مُسافر

مسافر آہستہ آہستہ بڑھا جا رہا تھا۔ اُس کی چال سے تھکن ظاہر تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ موسم سرما کی اندھیری رات تھی سیاہ بادلوں نے رات کی تاریکی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ بارش آہستہ آہستہ ہو رہی تھی ٹھنڈی اور نمدار ہوا بدن کو ناگوار محسوس ہوتی تھی۔ درختوں سے گھرے ہوئے ایک قدرتی تالاب کی سطح پر ہوا کے جھونکوں نے ایک بے چینی سی پیدا کر دی تھی اور جب بارش کے قطرے اُس کی سطح پر پڑ کر اُچھلتے تو بجلی کی چمک میں موتیوں کی طرح جھلملا اُٹھتے۔ درختوں کی آڑ میں سے گزرتی ہوئی ایک تنگ سڑک ایک ننھی سی پہاڑی کے گرد گھوم کر غائب ہوگئی تھی۔ اسی سنسان سڑک پر وہ مسافر تنہا چلا جا رہا تھا۔ اُس کیلئے ایک ایک قدم اُٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ شاید وہ کسی پناہ کی تلاش میں تھا۔ دائیں جانب دُور ایک دھیمی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ مسافر نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور اُسی طرف قدم بڑھائے۔ چلتا چلتا وہ اُس روشنی کے قریب آ پہنچا۔ یہ روشنی ایک چھوٹے سے مکان سے آ رہی تھی دُور تک اور کہیں آبادی کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ مسافر نے آگے بڑھ کر دروازہ پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے کسی نازک آواز نے سوال کیا۔

"میں ہوں۔ ایک مسافر"

"کیا چاہتے ہو؟"

"رات بسر کرنے کے لئے جگہ"

"اچھا ذرا ٹھیرو"

ایک لمحہ کے بعد مسافر نے سُنا وہی نازک آواز کہہ رہی تھی۔

"ماں! باہر کوئی مسافر کھڑا ہے۔ کہتا ہے رات بسر کرنے کے لئے جگہ چاہیئے"۔

"مسافر؟ کیسا مسافر؟" کسی نے جواب میں کہا۔ "ٹھیرو۔ میں دیکھوں"۔

چٹخنی کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ مسافر نے دیکھا ایک ادھیڑ عمر کی عورت کھڑی ہے۔ ایک نظر مسافر کو دیکھ کر اُس عورت نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"میں؟ ۔۔۔۔ "مسافر ذرا رُکا۔" ایک مسافر"

"وہ تو میں نے جانا۔ لیکن . . . . . بات دراصل یہ ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں ہے اور اگر . . ."

"اوہ سمجھا . . . . . اچھا" مسافر چلنے کے لئے گھوما۔

"مگر . . . . سنو تو!"

"کہیئے!" مسافر پھر رُک گیا۔

"تم اس رات میں کہاں جاؤ گے؟"

"جہاں جا رہا تھا"

"اس بارش میں؟"

"ہاں"

چند لمحوں تک دونوں خاموش رہے۔ پھر ذرا سوچ کر اُس عورت نے کہا۔

"میرا دل تو نہیں مانتا کہ اس بارش میں تم کو پریشان ہونے دوں۔ مگر دنیا بہت خراب ہے۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو"

"جانتا ہوں" مسافر کی آواز میں کسی قدر افسردگی آگئی تھی۔ اُس کی نظریں باہر کی تاریکی میں کسی نامعلوم چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عورت پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اپنی نظریں تاریکی سے ہٹا کر مسافر نے ایک دفعہ اُس عورت کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں"

"ذرا ٹھیرو" اُس عورت نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر زور سے

پکارا۔ "سُرمہ"

"آئی ماں" وہی نازک آواز مسافر کے کانوں میں آئی اور اُس کے ساتھ ہی ایک جوان لڑکی دروازے کی آڑ میں آکر کھڑی ہوگئی۔

"بیٹی" اُس عورت نے سُرمہ سے کہا۔ "آج رات بھر کے لئے یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

اور پھر مسافر کی طرف دیکھ کر بولی" آؤ ــــ آجاؤ!"

مسافر نے ہچکچاتے ہُوئے اندر قدم رکھا۔ کوٹھڑی کے ایک کونے میں اُس عورت نے کچے فرش پر ایک کمبل بچھا دیا۔ اوپر کے ایک دو کپڑے جن پر بارش کے پانی کا اثر زیادہ تھا۔ مسافر نے اُتار کر سُوکھنے کو پھیلا دیئے۔ مسافر کی طرف ایک کمبل بڑھاتے ہوئے وہ عورت بولی۔

"سردی بہت لگتی ہوگی۔ تاپنے کو آگ منگاؤں ــــ سُرمہ!"

اُس عورت کے ہاتھ سے کمبل لیتے ہُوئے مسافر بولا۔

"نہیں۔ نہیں آگ کیا کرنی ہے۔ یہ جگہ تو خوب گرم ہے۔ ہاں اُس دروازے سے ذرا سرد ہوا آ رہی ہے . . . ."

عورت نے سُرمہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ مسافر کمبل پر بیٹھ گیا۔ اُس عورت نے ہاتھ کی لالٹین ایک کونے میں رکھ دی اور آکر مسافر کے سامنے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تک بالکل خاموشی رہی۔ سُرمہ دیوار کے سہارے کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ مسافر ہاتھوں میں سر دبائے کسی خیال میں غرق تھا وہ عورت ٹکٹکی باندھے اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر مسافر نے سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کے اس اچھے سلوک کو میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس کی یاد سے مجھے خوشی ہوگی ــــ"

"چلو۔ اسی بہانے تم ہم کو یاد تو کیا کرو گے۔ کیوں؟"

"ہاں" مسافر نے اتنا آہستہ کہا کہ شاید صرف وہ خود ہی اُسے سُن سکا۔ ذرا خاموش رہ کر اُس نے سُرمہ کی طرف دیکھا۔

"تمہاری لڑکی ہے؟"

"ہاں"

"اور تمہارے . . . . ."

"وہ نہیں ہیں۔ ہم دونوں تنہا ہی رہتے ہیں"

"کہیں پردیس گئے ہونگے"

"ہاں"

"کب آئیں گے؟"

"شاید . . . . کبھی نہیں"

مسافر نے چونک کر اُس عورت کی طرف دیکھا۔ مگر وہ کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسافر نے سر جھکا لیا۔

ذرا خاموش رہ کر وہ عورت خود ہی کہنے لگی۔ گویا دیواروں سے کہہ رہی ہو۔

"وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے یا اپنی زندگی سے ــــ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہُوا . . . . . . لوگ کہتے ہیں وہ آئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اُن کو دیکھا بھی . . . . . مگر میں نے تو اُن کو نہیں دیکھا۔ میں تو نہیں مانتی کہ وہ آئے تھے . . . . . اور اگر آئے ہی تھے تو واپس کیوں چلے گئے؟"

آخری فقرہ اتنی دھیمی آواز سے کہا گیا کہ "کیوں چلے گئے" کسی نے نہیں سُنا۔ صرف ہونٹ ہلے گویا آواز نہیں نکلی۔

مسافر نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا۔ مگر پھر رُک گیا۔ اُسے رُکتا دیکھ کر اُس عورت نے پوچھا۔

"مسافر۔ تمہارے بھی تو بیوی بچے ہونگے؟"

مسافر نے اپنے جھکے ہُوئے سر کو ذرا سی جنبش دی۔ اس جنبش میں ایک افسردگی تھی۔

"تو کیا تم نے شادی نہیں کی؟"

"کی تھی"

"تو . . . . ؟"

"مر گئی"

"کوئی بچہ . . . . ؟"

"کوئی نہیں"

"اوہ تب تم جانتے ہو۔ کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کسی کو پا کر کھو دینے میں اور پھر جب انسان خود ــــ اپنی غلطی سے ــــ کھو دے اپنے پیروں سے ٹھکرا دے۔ تب کیا کوئی اپنے آپ کو معاف کر سکتا ہے، کبھی بھول سکتا ہے؟ . . . . . . پھر میں کیسے بھول جاؤں؟

مسافر نے نگاہ اُٹھا کر سُرمہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک یکسانہ انداز میں اُسی طرح دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ مسافر کا دل بھر آیا۔ اُس نے کہا۔

"بیٹی۔ تم کھڑی کب تک رہو گی۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ"

اُس عورت نے بھی جیسے چونک کر کہا۔

"ارہ سُرمہ! تو ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ نیند نہیں آئی۔ جا سو جا"

آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی سُرمہ وہاں سے چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد ایک لمبی سانس لے کر وہ عورت بولی۔

"یہ بیچاری بھی میرے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے۔ بدنصیب لڑکی! ماں ملی تو ایسی جو کبھی سکھ نہ دے سکی۔ اور باپ ایسا جس نے کبھی جانا ہی نہیں کہ یہ میری لڑکی ہے۔ آج اٹھارہ سال ہو گئے اس بات کو۔ اُس وقت سُرمہ صرف کچھ دنوں کی تھی۔ پورے اٹھارہ سال بیتے۔ مگر مجھے اب بھی ایک ایک بات اس طرح یاد ہے گویا اٹھارہ روز بھی نہیں گذرے اور شاید اسی طرح ہمیشہ یاد رہے گی۔ میری زندگی کا وہ آخری واقعہ تھا۔ اُس کے بعد! اُس کے بعد بہت کچھ ہوا۔ مگر میری زندگی میں نہیں۔ میری زندگی تو اُسی روز ختم ہو گئی جب وہ مجھ سے رُوٹھ کر چلے گئے۔ ویسے اب بھی میں زندہ ہوں۔ مگر میں اسے زندگی نہیں سمجھتی۔ یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔"

اپنے آنچل سے ایک دفعہ آنسو بھری آنکھوں کو پونچھ کر وہ پھر کہنے لگی۔" وہ رات مجھے خوب یاد ہے۔ میری زندگی کی وہ سب سے تاریک رات تھی۔ آندھی اور پانی نے ایک طوفان سا مچا رکھا تھا۔ سمندر کی لہروں میں اس قدر اضطراب تھا کہ اُن کے ساحل سے ٹکرانے کی بلند آواز بند دروازوں میں بھی داخل ہو کر دل کو دہلا رہی تھی۔ گھر میں میرے اور سُرمہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی کشتی پر بیٹھ کر کہیں گئے ہوئے تھے وہ اکثر اسی طرح جایا کرتے تھے مگر اس دفعہ جلدی آنے کا وعدہ کر گئے تھے میں ہر روز اُن کا انتظار کرتی تھی۔ اُس رات سُرمہ کو سینے سے لگائے میں سوچ رہی تھی کہ وہ سُرمہ کو دیکھ کر کتنے خوش ہونگے۔ جب یہ ننھے ننھے ہاتھ اُن کے استقبال کے لئے بڑھیں گے تو اُن کے دل میں اُمید اور خوشی کی نئی لہر پیدا ہو جائے گی۔

"اُسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں یہ سمجھی کہ وہ آئے ہیں میں نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر اشوک کھڑا تھا۔

"اشوک میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم برسوں ساتھ رہے تھے ہمیشہ ساتھ کھیلے تھے۔ مگر شادی کے بعد۔ جہاں زندگی کی اور عزیز چیزیں چھٹ گئیں، اشوک کا ساتھ بھی چھٹ گیا۔ عزیز چیزوں سے بچھڑ جانے کا نام ہی شاید زندگی ہے۔"

مسافر کمبل میں گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ بند دروازے میں سے بھی سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر آرہی تھی۔

"آگ بنا دوں۔ یوں ٹھنڈ نہیں جاتے گی۔" کہہ کر وہ اُٹھی اور مسافر کے منع کرنے پر بھی ایک مٹی کی انگیٹھی میں آگ بنا ہی لائی۔ انگیٹھی مسافر کے سامنے رکھ کر وہ کہنے لگی۔

"اُس رات اشوک کی بھی یہی حالت تھی۔ اُس آندھی اور پانی میں وہ تین میل چل کر آیا تھا۔ رگ رگ میں ٹھنڈ اکڑی تھی۔ اور وہ اُسی وقت واپس جانے کو تیار تھا۔ اُسی آندھی اور پانی میں"

"وہ صرف مجھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھ سے رخصت ہونے۔ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے۔ اُس نے فوج میں نام لکھوا دیا تھا۔ وہ جنگ میں جا رہا تھا۔"

وہ عورت ذرا رُکی۔ گویا کچھ یاد کر رہی ہو اور پھر کہنے لگی۔

"اشوک کی باتوں سے مجھے بے حد دُکھ ہوا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا یہ مجھے اُس نے نہیں بتایا۔ مگر پھر بھی میں نے محسوس کیا گویا میں اُس کی وجہ جانتی ہوں۔ میں نے اُسے سمجھانا چاہا مگر وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سُرمہ کے ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس نے ایک بار ۔۔۔۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لگایا اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر وہ ذرا رُکا اور پھر جیسے آخری رخصت مانگ رہا ہو اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کا خیال نہ کیا اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے اشوک کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کمرے میں کھینچ لائی ۔۔۔۔"

آخری بات کہتے کہتے اُس عورت کا گلا بھر آیا وہ کچھ آگے نہ کہہ سکی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مسافر نے اپنا جُھکا ہوا سر ذرا سا اُونچا اُٹھا کر اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ نظر جمائے اُن بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتا رہا۔ شاید اُن کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر اپنی نظریں انگیٹھی کی چھوٹی چھوٹی لپٹوں پر جما کر اُسے دلاسا دینے کی آواز میں کہنے لگا۔

"جانے دو اس قصے کو۔ اپنا دل دُکھی مت کرو۔ بھُولی ہوئی باتوں کو یاد کرنے سے فائدہ؟"

"یہ گذری ہوئی باتیں ہیں۔ مگر بھُولی ہوئی نہیں ہیں اور جن پر گذری ہیں وہ اُن کو بھول نہیں سکتا . . . . . . ان کو بھلا دینے کے معنی ہیں اپنے آپ کو بھلا دینا . . . . . ."

"یہ میں جانتا ہوں۔ مگر بھُلا دینے کی کوشش تو . . . . "

"کوشش! . . . . آج اٹھارہ برس سے اس بات کی کوشش کر رہی ہوں۔ اپنے دل کی بات کبھی کسی سے نہیں کہی، تم سے بھی نہیں۔ آج تم سے کہہ رہی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار، اور شاید آخری بار بھی۔

وہ مجھ سے رُوٹھ کر چلے گئے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ سب کہتے ہیں۔ مگر کیوں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ شاید خود میں بھی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہم نے اُن کو کشتی پر روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ شام ہی سے زبردست طوفان کے آثار نمایاں تھے اور ہم نے اُن کو جانے سے روکنا بھی چاہا۔ مگر وہ گھر واپس جانے کے لئے اس قدر بیتاب تھے گویا اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر کوئی قیمتی چیز وہاں چھوڑ آئے ہوں۔ وہ بھی جانتے تھے۔ کہ طوفان آئے گا۔ مگر اُن کا خیال تھا کہ میں طوفان سے پہلے ہی گھر پہنچ جاؤں گا مگر شاید اُن کا خیال غلط تھا —— وہ گھر کبھی نہ پہنچ سکے۔ وہ طوفان کوئی معمولی طوفان نہیں تھا اور اُس میں ایک چھوٹی سی کشتی کا . . . . تمہارا کیا خیال ہے مسافر؟"

"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے"

"مگر لوگ نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں ہم نے اُس رات اُن کو اپنے گاؤں میں دیکھا وہ ساحل سے اپنی کشتی باندھ رہے تھے اور اس کے بعد بارش میں بھیگتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ بعض کہتے ہیں ہم نے اُن کو اپنی کشتی پر بیٹھے دیکھا۔ کشتی ساحل سے بندھی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔ اُس وقت رات کافی جا چکی تھی۔ . . . . مگر مجھے تو لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں آتا۔ میں تو اُن کا کہا نہیں مانتی۔ یہ ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ اگر وہ گاؤں میں پہنچ جاتے تو کیا گھر نہ آتے؟ اور پھر جب لوگوں نے اُن کو گھر کی طرف آتے دیکھا تو وہ گھر پہنچے کیوں نہیں؟ اور پھر سوچو تو ہی۔ اُس آندھی اور پانی میں اور پھر کافی رات گئے اُن کو کشتی پر بیٹھ کر سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اُن کے لئے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اپنا گھر نہیں تھا۔ جو اس طرح کشتی پر بیٹھے بارش میں بھیگتے رہتے؟ اور پھر آئے ہی تھے۔ تو چلے کیوں گئے۔ اور بغیر کسی سے کچھ کہے اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے! . . . . . . مگر لوگ کہتے ہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھا —— اپنی آنکھوں سے!"

اُس عورت نے ایک سرد آہ کھینچ کر گردن جھکالی۔ مگر فوراً ہی پھر سر اُٹھا کر کسی قدر بے تابی کے لہجے میں بولی "کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ مسافر؟" مسافر نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں "کیا؟"

"یہی" وہ بولی۔ "کہ لوگوں نے جس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اُن کی روح ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر انسان دل ہی کوئی حسرت لے کر ہی مر جائے تو . . . . اُس کی روح بھٹکتی رہتی ہے۔ اُسے چین نصیب نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کی حسرت پوری نہ ہو جائے . . . . وہ بیچارے سُرمہ کو دیکھنے کی حسرت دل میں ہی لے کر . . . . جب ہی تو اُن کی روح رات بھر گاؤں میں بھٹکتی رہی . . . . اور اُسے ہی لوگوں نے دیکھا! کیوں ایسا ہو سکتا ہے نا؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے"

"مگر کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ یونہی دل میں خیال آجاتا ہے۔ کہ شاید لوگوں کا کہنا ہی ٹھیک ہو۔ اگر ایسا ہو تو !"

عورت انگیٹھی کو اپنی جانب کھینچ کر اُس کی راکھ جھاڑنے لگی۔ اور پھر انگیٹھی کو واپس دھکیل کر اُس نے مسافر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی آنکھیں اس طرح بند کئے بیٹھا تھا گویا اُس نور رکھی لالٹین کی دھیمی روشنی بھی اُسے بُری معلوم ہو رہی ہو۔

"کیا۔ نیند آ رہی ہے۔ مسافر؟"

"ہاں" مسافر نے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے بغیر ہی جواب دیا۔ "شاید رات کافی جا چکی ہے؟"

"جا تو چکی ہے۔ اچھا اب سو جاؤ"

وہ اُٹھ کر دوسری کوٹھڑی میں چلی گئی۔ سوئی ہوئی سرمہ کو ایک نظر دیکھ کر وہ خود بھی لیٹ گئی۔ بہت دیر تک وہ پڑے پڑے سوچتی رہی۔ شاید اُس اجنبی مسافر کے متعلق —— اور پھر وہ بھی نیند کے آغوش میں مُنہ چھپا کر خواب دیکھنے لگی۔

اُس نے دیکھا وہ سمندر کے کنارے کھڑی کسی کا انتظار کر رہی ہے کس کا۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتی مگر اس بات کا جیسے اُس کو یقین ہے کہ جس کا وہ انتظار کر رہی ہے اُس کو دیکھ کر ضرور پہچان لے گی۔ اُس کو اس طرح کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی۔ بہت سی کشتیاں آئیں اور نکل گئیں۔ مگر جس کا اُس کو انتظار تھا۔ وہ صورت دکھائی نہ دی۔ آخر بہت دیر کے بعد ایک چھوٹی سی کشتی دُور سے آتی ہوئی نظر آئی۔ کشتی پر صرف ایک ہی سوار تھا جو خود ہی اُس کو چلا بھی رہا تھا۔ مگر اس انداز سے گویا اُس کو خود بھی معلوم نہ ہو کہ اُس کو کہاں جانا ہے، سمندر کی بیتاب ہریں ہی اُس کی رہبر تھیں۔ کشتی آہستہ آہستہ نزدیک آ رہی تھی۔ اُسی طرف جدھر وہ کھڑی تھی وہ آس باندھے اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر کشتی بالکل نزدیک آ گئی۔ اتنی نزدیک جتنی کہ اب تک کوئی کشتی نہ آئی تھی۔ کشتی کے سوار نے نگاہ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا مگر یہ وہ نہ تھا جس کے انتظار میں وہ کھڑی تھی۔

وہ کشتی بھی گذر گئی۔ اُس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔ لیکن اُس وقت اُس نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اُس کے کان میں بہت آہستہ سے کہا "یہی وہ کشتی ہے"۔

اُس نے گھبرا کر سمندر کی طرف دیکھا۔ کشتی کافی دور جا چکی تھی۔ اُس کا سوار اُسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ لہروں کے تھپیڑے کھا کھا کر کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس نے پکارنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر اُسی وقت اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اُس نے دیکھا اُس کے سرہانے کھڑی سُرمہ پکار رہی ہے۔ "ماں، ماں!"

"کیوں؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا۔ "سُرمہ۔ کیا ہے؟"

"ماں" سُرمہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی یہاں کوئی آیا تھا میں سوئی ہوئی تھی کہ کوئی سرد چیز میری پیشانی سے لگی۔ میری آنکھ کھل گئی میں نے دیکھا ایک آدمی میرے سرہانے سے ہٹ کر جلدی سے باہر چلا گیا۔

"پگلی ----!"

"نہیں ماں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کوئی ضرور تھا"۔

"تو مسافر آیا ہوگا"

"مسافر کیا کرنے آتا؟"

"ابھی پتہ چل جاتا ہے۔"

وہ اُٹھی اور "ابھی سو رہے ہو۔ مسافر۔ . . . ؟" کہتی ہوئی مسافر والے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر چونک کر رُک گئی۔ مسافر کا بستر خالی تھا مسافر وہاں نہ تھا۔ سامنے کا دروازہ کھلا تھا۔

عورت جھپٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ باہر ویسی ہی تاریکی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی اور فضا بالکل خاموش تھی۔ اُس نے زور سے پکارا "مسافر! مسافر!" فضا لرز گئی مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔

اُسی وقت بجلی چمکی اور اُس کی چمک میں اُس عورت نے دیکھا کہ ایک آدمی دور سڑک پر جلدی جلدی چلا جا رہا ہے۔

——— شاید یہ مسافر ہی تھا!

ایم بقایا

گاؤں کی صبح

مشرق کے چھلکتے ساغر میں سورج کی شعاعیں تیرتی ہیں
مغرب میں افق کے سینے پر متوالی گھٹائیں تیرتی ہیں

چڑیوں کی قطاریں کھیتوں کی وسعت میں چہکتی جاتی ہیں
مسجد کی مقدس دیواریں کرنوں سے دمکتی جاتی ہیں

گاؤں سے صدائیں آتی ہیں ننھے بچوں کے رونے کی
اور گونج رہی ہیں ہر جانب آوازیں دودھ بلونے کی

لاٹھی کو جما کر کاندھے پر گھر سے نکلا ہے چرواہا
گلّے کی چاپ سے دیکھو اب تک گونج رہا ہے چوراہا

پنہاریاں پنگھٹ کی جانب تیزی سے تھرکتی جاتی ہیں
اور ہولے ہولے اوڑھنیاں سینوں سے سرکتی جاتی ہیں

اِک تنگ گلی میں کھلتے ہیں دروازے چند دکانوں کے
قسمت کے نوشتے رکھے ہیں جن میں مفلس دہقانوں کے

چوپال پہ رونق ہے — شاید تھانے کے سپاہی آئے ہیں
مقروض غریب کسانوں کے وارنٹ بنا کر لائے ہیں

وہ اِک بوسیدہ کٹیا سے فریادوں کا طوفان اُٹھا
تھانے کی طرف جانے کے لئے اک خستہ دل دہقان اٹھا

فریاد کی اک گھنگھور گھٹا گاؤں کی فضا پر چھائی ہے
آنکھوں سے شرارے برساتی کیا صبح کی دیوی آئی ہے!

احمد ندیم قاسمی

بابر کی موت

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں ظہیر الدین محمد بابر کی موت بھی عجیب چیستان ہو کر رہ گئی ہے۔ چار سو برس سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے لیکن آج تک کسی کو اس واقعہ کی صداقت میں کلام نہیں ہوا۔ مصیبت یہ ہے کہ جب مذہب اور خوش اعتقادی کسی واقعہ کی صحت یا غیر صحت پر پردہ ڈال دیتی ہے تو زبانیں سی جاتی ہیں، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور دل و دماغ مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بابر کی موت کے واقعہ میں انتہائی خوش عقیدگی کو جگہ دی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح راویانِ خوش بیان نے اس کو سنایا اسی طرح وہ سینہ بسینہ اور تاریخ در تاریخ محفوظ ہوتا چلا گیا اور اب تو یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ نے اس پر ایسی گہری مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ اس کی ہر دلعزیزی کو مغلوب کرنا ذرا آسان کام نہیں۔ انصاف آپ ہی کے ہاتھ ہے پہلے سنئے تو کہ واقعہ کیا ہے؟ مستند مورخین کے الفاظ میں قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

ہمایوں کی بیماری ۱۵۳۰ء کا آغاز تھا۔ ہمایوں مرزا بدخشاں کا صوبہ دار تھا کہ دفعتہ بغیر اطلاع کے دربار میں آ موجود ہوا۔ وقت گیا بات گئی، چندے قیام کے بعد شہزادہ سنبھل کا گورنر بنا دیا گیا۔ جہاں اس کا قیام کئی ماہ تک رہا۔ اتفاق کہ اسی دوران میں وہ بیمار پڑ گیا اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ اس کی حالت سقیم ہے۔ خشکی کے راستے سے مسافت زیادہ تھی لہذا سفر کی تکان اور تعجیل کا خیال کر کے اس کو دریا کے راستہ سے آگرہ لایا گیا۔ شاہی طبیب اپنی سی سب کر گزرے لیکن مرض میں افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار جب بالکل مایوسی ہو گئی اور خدا ہی سے لو لگ گئی تو شاہی محلات میں ایک اضطراب برپا ہو گیا۔ مساجد میں ختم قرآن دگرسفند ہوئے۔ نمازوں کے بعد دعائیں ہوئیں۔ تعویذ گنڈے، صدقے، چلے سبھی جتن کئے گئے لیکن ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر کار کسی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ جہاں پناہ! جان کا فدیہ جان ہے بادشاہ سمجھ گیا، اور وہ تین بار بیمار کے صدقہ ہوا۔ اس وقت سے شہزادہ کو بلوں صحت ہونا شروع ہو گئی اور دوسری طرف بابر جو اپنی تندرستی میں ہمیشہ بے پروا رہا کرتا تھا۔ بیٹے کی بیماری کے فکر و اندیشے نے اس کے جسم کے خون کو خشک کر دیا تھا۔ صاحبِ فراش ہو گیا۔ مرض میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور آخر کار ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو جان بحق تسلیم کر گیا۔

اسناد اس واقعہ کے ثبوت میں بہت سی اسناد پیش کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے اس کی ابتدا ابوالفضل نے "اکبر نامہ" میں کی اس کے بعد اقبالنامہ جہانگیری میں اس پر چلا ہوئی۔ مگر واقعہ کی تفصیلات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد سے جس تذکرہ یا تاریخ میں بابر کی موت کا ذکر آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مورخ نے حرف بحرف ابوالفضل کی پیروی کی ہے۔ حالانکہ بعض مورخین کے ذرائع معلومات ابوالفضل سے زیادہ موثق تھے مثال کے لئے بخشی نظام الدین کو لیجئے۔ بخشی کا باپ جیسا کہ اکبرنامہ سے ثابت ہے بابر کے عملے میں تھا اور اس کو بادشاہ کے عالم انتزاع میں حاضر باشی و خدمت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے آقا کی آخری خدمت بہ نہایت وفاداری سے انجام دی تھی، اس شخص نے ہمایوں کے ساتھ بھی حق نمک ادا کر دیا اور اس کی تخت نشینی میں اپنی جان کھپا دی، بایں ہمہ افسوس و حیرت ہے کہ بخشی نے بھی ابوالفضل کی کورانہ تقلید کی اور کبھی بھی واقعہ کی صحت کی تحقیق نہ کی۔

عبدالقادر بدایونی کی بھی زبان خاموش ہے۔ نہ احمد یادگار نے جس نے ۱۰۰۱ھ اور ۱۰۲۰ھ کے درمیان میں "تاریخ سلطنت افغانیہ" لکھی ہے کوئی تحقیق اس واقعہ کے متعلق کی ہے۔ بلکہ اس نے ابوالفضل کی روایت پر اعتماد کر کے بجنسہ اس کو نقل کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا مورخین نے اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں محسوس کی اور اس کو

ارادتاً نظرانداز کر دیا۔ اس کو بھی آپ ان کی خوش عقیدگی تصور کر لیجئے یا یوں سمجھ لیجئے کہ واقعہ زبان زد خلائق ہو کر اس قدر عام شہرت حاصل کر چکا تھا کہ اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ لیکن اب آپ کے پیش نظر مذکورہ بالا تاریخوں سے مستند تر ایک اور تذکرہ ہے جس کی مصنفہ خود بابر کی دختر گلبدن بیگم ہے۔ اس تذکرہ کا نام ہمایوں نامہ گلبدن بیگم ہے

ہمایوں نامہ گلبدن بیگم

قبل اس کے کہ ہم گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے کوئی انتخاب موضوع زیر بحث پر روشنی ڈالنے کی غرض سے پیش کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم اور اس کی گراں بہا تصنیف کا تعارف مختصر الفاظ میں کرا دیں۔

گلبدن بیگم بابر کی دختر اور ہمایوں کی دوسری ماں سے بہن تھی اور اپنے عہد کی عالمہ۔ اس کو ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی، ہمایوں نامہ عہد ہمایوں کا تذکرہ ہے اور بادشاہ کے حکم سے لکھا گیا ہے جیسا کہ بیگم اپنے دیباچہ میں تحریر کرتی ہے۔

"حکم ہوا کہ تم فردوس مکانی (بابر) اور جنت آشیانی (ہمایوں) کے جس قدر حالات و واقعات جانتی ہو لکھو۔ چنانچہ حسب الحکم تحریر کرتی ہوں . . . . . "

گلبدن بیگم کی عمر بابر کی وفات کے وقت صرف آٹھ سال کی تھی خود تحریر کرتی ہیں۔

"حضرت فردوس مکانی (بابر) نے جس وقت عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرمایا ہے اس وقت اس کنیز کی عمر آٹھ سال کی تھی اس لئے ممکن ہے کہ اس وقت کے حالات میرے حافظے میں بہت کم محفوظ رہے ہوں۔ بہرنوع بادشاہ کا حکم! جو کچھ میں نے سُنا اور دیکھا اور جو کچھ اس وقت تک مجھے یاد ہے حوالۂ قلم کرتی ہوں"

بدقسمتی سے عہدِ مغلیہ کی تاریخوں میں سے کسی میں بھی گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کا ذکر نہیں۔ خود ابوالفضل نے ہمایوں نامہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کا اصلی نسخہ شاہی کتب خانہ میں محفوظ رہا اور کسی مورخ کو اس کی جھلک بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ جب دہلی لُٹی اور اس کے کتب خانے کے بیش بہا نسخے کوڑیوں کے مول بِک بِک کر فرنگیوں کے ہاتھ پہنچے تو ہمایوں نامہ نے بھی روشنی دیکھی غالباً سب میں پہلا شخص جس نے ہمایوں نامہ کو عہدِ مغلیہ کی تاریخوں کی فہرست میں شامل کیا وہ ڈاکٹر ریٹو ہے۔ اب تو اس کا اردو ترجمہ[1] بھی ابن حسن شارق نے کیا ہے اور انگریزی ترجمہ[2] اس سے پہلے مسز بیورج کر چکی ہیں۔

یہ امر بھی معرض بحث میں ہے کہ ہمایوں نامہ ترکی زبان میں تھا یا فارسی میں لیکن ڈاکٹر ہلٹن[3] کا نسخہ جس سے شارق نے اردو ترجمہ کیا ہے فارسی میں ہے البتہ اس میں جا بجا ترکی الفاظ و فقرات استعمال کئے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمایوں نامہ دراصل فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ مسز بیورج نے بھی فارسی نسخہ سے ترجمہ کیا ہے لیکن بیورج نے اکثر مقامات پر ترجمہ میں افسوسناک غلطیاں کی ہیں۔

بابر کی بیماری اور موت

ہمایوں نامہ کا پہلا باب بابر کے حالات پر مشتمل ہے اس میں بابر کی علالت اور وفات ایک مخصوص فصل ہے۔ چنانچہ ہمایوں کی بیماری کے تحت میں بیگم لکھتی ہے۔

"ہمایوں مرزا کی علالت کے زمانے میں حضرت بادشاہ (بابر) نے حضرت علی مرتضٰے مشکل کشا کا روزہ رکھا۔ یہ روزہ بدھ کے دن سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن بادشاہ نے منگل ہی کے دن روزہ رکھا اور اس روز نہایت خضوع و خشوع سے درگاہ حضرت رب العزت میں دعا کی کہ اے مالک میرے! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر جان کا فدیہ جان ہو سکتا ہے تو یہ باپ اپنے لخت جگر کی جان کے عوض میں اپنی جان کو نذر کرتا ہے

اُس دعا کے بعد ہمایوں مرزا کو صحت ہونے لگی اور انہوں نے کچھ دنوں کے بعد غسل صحت کیا اور سلام حاضری کی اجازت دی دوسری طرف حضرت فردوس مکانی (بابر) کا ضعف و نقاہت اس قدر بڑھ گیا کہ وہ صاحب فراش ہو گئے۔ بیماری میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں اور حالت روز بروز سقیم ہونے لگی آخر کار اُن کو محل میں لے آئے"۔

"حضرت بادشاہ دو تین ماہ تک مسلسل بیمار رہے اس اثنا میں ہمایوں مرزا کالنجر چلے گئے لیکن جب حضرت کا عالم انتزاع ہوا تو ہمایوں مرزا کو بلا لیا گیا۔

"ہمایوں مرزا حضرت کی حالت زار و نزار کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اطبّا طلب کئے گئے اور ان سے پوچھا کہ میں تو حضرت ظل سبحانی کو تندرست و توانا چھوڑ کر

---

[1] ہمایوں نامہ گلبدن بیگم مترجمہ ابن حسن شارق مطبوعہ علی گڈھ [2] ترجمہ از مسز بیورج
[3] ڈاکٹر جارج ہلٹن

گیا تھا۔ یکایک یہ کیا ہو گیا کہ حالت اس قدر متغیر ہو گئی۔ طبیبوں نے نبض دیکھ کر کہا کہ زہر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ علاج اب ہمایوں مرزا کی خاص نگرانی میں ہونے لگا۔

. . . .

[illegible] کی حالت [illegible] سبب سے بہت [illegible] ہمایوں [illegible] [illegible] ان کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

یہ سب اسی زہر کا اثر تھا جو سلطان ابراہیم کی والدہ نے حضرت بادشاہ کو دیا تھا۔ . . .

زہر؟ اب ذرا اس زہر کی داستان کو بھی گلبدن بیگم ہی کی زبانی سن لیجئے وہ کہتی ہے:

"حضرت بادشاہ کو زہر دینے کا واقعہ یہ ہے کہ سلطان ابراہیم کی بدبخت ماں نے ایک ہندی خادمہ کو تولہ بھر سم قاتل دے کر یہ کہا کہ احمد باورچی کو دے دے اور کہہ دے کہ جس طرح ممکن ہو بادشاہ کے کھانے میں ملا [illegible] . . .

. . . .

[illegible] کا کرنا ایسا ہوا کہ باورچی اندھا ہو گیا اور اس نے زہر کو بجائے کسی کھانے میں ملانے کے نان پر چھڑک دیا۔ بادشاہ نے تھوڑی سی روٹی تناول فرمائی تھی۔ مگر جس قدر بھی نوش کی تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت [illegible] [illegible] تاریخ سے روز بروز بدحال ہوتے گئے۔ چہرہ کا رنگ [illegible] اور [illegible] کا رس سب نکل گیا۔

اصل بیماری یہ تھی . . . .

یہ بھی مدنظر رہے کہ ابراہیم لودھی کے پانی پت کی جنگ میں کام آنے اور بابر کے تخت دہلی پر متمکن ہونے کے بعد بابر نے شاہی خاندان کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا اور اس کی ماں کی تو وہ توقیر کی کہ اس کو اپنی ماں سمجھا اور ان سب کو اپنی شایان شان زندگی بسر کرنے کے لئے بڑی بڑی جاگیریں دیں۔ لیکن ماں نے اپنے بیٹے کے خون کا انتقام بابر سے لے

سنہ ۱۵۲۶ء؁ سنہ مسز بیورج کا ترجمہ ہمایوں نامہ صفحات ۱۰۴ تا ۱۰۸

بی لیب۔ قصہ مختصر

اس واقعہ کے تین دن کے بعد حضرت فردوس مکانی نے پانچویں جمادی الاول ۹۳۷ھ؁ دوشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔"

ہمایوں نامہ اور دوسری بابر نامیں

بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی وقعت اکبر نامہ و اقبال نامہ کے مقابلے میں نہیں۔ لیکن یہ صحیح کب ہے؟ اس لئے کہ گلبدن بیگم کی تائید فرشتہ، عبدالقادر اور نظام الدین بھی کرتے ہیں اور سب ہم زبان ہیں کہ "جب بابر کی حالت زیادہ [illegible] ہوئی تو ہمایوں کو کالنجر سے طلب کیا گیا۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بابر کی وفات ہمایوں کی صحت یا کم از کم بیماری کے کچھ مابعد واقع ہوئی جس وقت ہمایوں اچھا ہو گیا اس وقت بابر نحیف و ناتواں ضرور تھا۔ لیکن اس کا فوراً صاحب فراش ہو جانا ثابت نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو ہمایوں تخت کے لالچ سے کبھی کالنجر نہ جاتا۔

ہمارے نظریے کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب ہمایوں کالنجر سے لوٹ کر آیا اور اس نے بادشاہ کو حالت انتزاع میں پایا تو اس کو سخت حیرت ہوئی اور اس نے معالجین سے کہا کہ "میں تو حضرت ظل سبحانی کو اچھا چھوڑ کر گیا تھا۔ دفعتہً یہ کیا ہو گیا؟"

یہ واقعہ متفق علیہ ہے اور ابوالفضل بھی اس کو لکھتا ہے۔

سچ پوچھئے تو یہ افسانہ فی الحقیقت ابوالفضل کی اختراع ہے کیونکہ مؤرخین نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب ابوالفضل کے حوالے سے لکھا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت گلبدن کا ہمایوں نامہ کسی مصنف کے پیش نظر نہ تھا ورنہ یہ ناممکن تھا کہ ابوالفضل کا افسانہ تاریخ میں اس قدر وقعت پا جاتا۔ قرائن و حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک بابر کی موت کے واقعات کا تعلق ہے گلبدن بیگم بہ نسبت ابوالفضل کے زیادہ قابل وثوق ہے اور اس کے وجوہ میرے خیال میں حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) گلبدن بیگم کی شہادت عینی ہے اور ابوالفضل کی سماعی۔

(۲) ماں باپ یا کسی عزیز قریب کی موت بچوں کو کبھی نہیں بھولتی۔ اور پھر آٹھ برس کی مغل شہزادی تو کبھی بھی اپنے باپ کی دفات کے واقعہ کو نہیں بھول سکتی تھی۔

(۳) بابر کا ہمایوں کے صدقہ ہونا صحیح ہے لیکن ابوالفضل اور گلبدن بیگم

...ی روایت میں فرق صرف اتنا ہے کہ ابوالفضل ہمایوں کی صحت اور بابر کی موت کے زمانے میں کوئی فصل نہیں دیتا۔ گلبدن کے قول کے مطابق بابر کی موت ہمایوں کے غسل صحت کے مہینوں بعد واقع ہوتی ہے۔ البتہ مرض الموت کی ابتدا کے تعین زمانہ کے لئے وہ یہ ضرور تسلیم کرتی ہے کہ صدقہ ہونے کے بعد سے ہمایوں مرزا کو صحت ہونا شروع ہو گئی اور بادشاہ کے اضمحلال کا اسی روز سے آغاز ہوا۔

(۴) اس واقعہ کو اہمیت اس وقت ہوتی جب صدقہ ہوتے ہی حالت اتنی نازک ہو جاتی جتنی اس روز ہمایوں کی تھی۔

یورپین مورخین اور ابوالفضل کی کورانہ تقلید،

افسوس اس کا ہے کہ یورپین مورخین نے بھی جنہوں نے عہد مغلیہ کی تاریخیں لکھی ہیں ابوالفضل کی صرف کورانہ تقلید کی ہے بلکہ اس واقعہ کو اس پیرائے میں لکھا کہ پڑھنے والوں کے یہ ذہن نشین ہو گیا کہ بابر کی موت تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جو چیستان کہے جانے کا مصداق ہے۔ مجھے صدقہ سے انکار نہیں۔ نہ میں اپنے اسلامی عقائد سے منحرف ہوں لیکن جہاں تک بابر کی موت کا تعلق ہے یہ اب راز نہیں رہتا کہ اس کی موت محض زہر کے اثر سے جو چند سال پہلے اس کو دیا گیا تھا واقع ہوئی۔

قصہ کوتاہ لیڈن[1]۔ ارسکن[2]۔ لین پول[3] اور الفنسٹن[4] سب ہی نے تو اکبرنامہ کی تقلید کی ہے ان سب سے قطع نظر کیجئے تو ڈاکٹر رشبرک ولیمس ہمارے عہد کے مورخ ہیں اور بابر کے وقائع نگار بھی۔ فاضل ڈاکٹر کا قلم بھی بابر کے واقعہ وفات کی تفصیل میں ابوالفضل کے نقش قدم پر چلا ہے مگر ذرا رک رک کر بے دھڑک نہیں[5]۔

کاش رشبرک ولیمس گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیتے اور تاریخ مغلیہ کے دور اولین کا یہ راز سربستہ یورپین مورخین کی وسیع نگاہوں کے سامنے منکشف ہو جاتا۔

شہنشاہ حسین رضوی

١۔ Irskine ٢۔ Leydon
٣۔ Elphinstone ٤۔ Lanepoole
٥۔ Dr. Rushbrook Williams, An Empire-builder of the Sixteenth Century p.p. 173-74.

نعرۂ عشق

میری ہستی کیا ہے اک طوفان ہے
موت میرے دل کا اک ارمان ہے

میری نظروں میں ہیں شعلے نور کے
غرق ہیں آنکھوں میں جلوے طور کے

میں قضا کے نام سے ڈرتا نہیں
تیغ خوں آشام سے ڈرتا نہیں

چلچلاتی دھوپ ہو برسات ہو
دوپہر ہو کالی کالی رات ہو

میری دشمن گردشِ ایام ہو
میرے سر پر بارشِ آلام ہو

تند طوفاں برسرِ پیکار ہوں
جان لینے کے لئے تیار ہوں

میرا استقلال خم کھاتا نہیں
میری پیشانی پہ بل آتا نہیں

ایک لرزش میرے پیچ و تاب کی
توڑ دیتی ہے کمر گرداب کی

مذہب و ملت سے مجھ کو بیر ہے
میری منزل کعبہ ہے نے دَیر ہے

موت سے لڑنا مرا ایمان ہے
میرے دم سے زندگی کی شان ہے

خاور قریشی

دیہات سدھار و امداد باہمی پر نادر کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	داستان دہقان - - -	عظ	۷	جمہوریت امداد باہمی - -	۴ر
۲	دیہاتی زندگی - - -	عہ	۸	امداد باہمی اور برہما -	۴ر
۳	مناظر امداد باہمی - - -	عہ	۹	معاشیات دیہات -	۱۲ر
۴	امداد باہمی اور ہندوستان	۳ے	۱۰	ہائے عوام - -	۳ے
۵	مالیات دیہات - -	۳ے	۱۱	حیات دیہات - -	۸ر
۶	آئینہ پنجاب - - -	۱۲ر	۱۲	رسالہ کواپریشن (ماہواری) سالانہ چندہ	۳ے

رجسٹر برائے انجمن امداد باہمی کفایت شعاری و قرضہ

نمبر شمار	نام رجسٹر	قیمت	نمبر شمار	نام رجسٹر	قیمت
۱	روکڑ باہی - - -	عہ ۱۲ر	۷	قسط بندی - - - -	عہ ۴ر
۲	کھاتہ باہی - - -	عہ ۱۲ر	۸	حصہ واری - - -	۱۲ر
۳	تمسک - - -	عہ ۲ر	۹	ضمانت نامہ - - -	۱۲ر
۴	کارروائی - - -	۱۲ر	۱۰	پاس بک - - -	۱ر
۵	حد قرضہ - - -	۱۲ر		- - - - -	
۶	ممبران - - -	۱۲ر		- - - - -	

محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ ہر کتاب مجلد ہے

ملنے کا پتہ:۔ پنجاب کواپریٹو یونین۔ لاہور

خام مواد

میں افسانہ نگار ہوں! قصے کہانیاں لکھ کر اپنی روزی کماتا رہا ہوں۔

میں نے نہایت معمولی تعلیم پائی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے بالکل نہیں پائی۔ چنانچہ میں افسانہ نگاری سے بحیثیت فن کے واقف نہیں ہوں۔ کوئی نقاد اپنی مخصوص تنقیدی زبان میں میرے افسانوں پر نکتہ چینی کرتا ہے اور اُن کا کھرا کھوٹا بتاتا ہے تو میری سمجھ میں خاک نہیں آتا۔ لیکن افسانہ لکھنے کا جہاں تک تعلق ہے مجھے اس میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ خود میری زندگی ہزاروں طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر میں دنیا کے نت نئے ہنگاموں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف اپنی ہی زندگی کے حالات کہانیوں کی شکل میں تلمبند کرتا رہوں تو اردو زبان کے افسانوی ادب میں متعدد ضخیم جلدوں کا اضافہ کر سکتا ہوں۔ آج میں افسانہ نگار ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کیا کچھ نہیں رہا ہوں۔ اور کیا کچھ میں نے نہیں کیا ہے۔ کھیتوں میں ہل میں نے چلائے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوری میں نے کی ہے۔ دیہاتی مسجدوں میں مؤذن اور ملا بن کر میں رہا ہوں۔ خلافت کا والنٹیر ہو کر ہندوستان بھر میں میں گھوما ہوں۔ مصیبتیں میں نے جھیلی ہیں فاقے میں نے کئے ہیں۔ سڑکوں پر اور دوکانوں کے تختوں پر میں سویا ہوں۔ غرض یہ کہ میری گذری ہوئی زندگی گوناگوں حوادث و واقعات سے لبریز ہے۔ اگر بیان کرنے بیٹھوں تو یہ اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ کبھی نبڑ نہیں سکتا۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر مجھے افسانہ لکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی یہ ہے کہ جب میں اپنے اردگرد کی زندگی کو دیکھتا ہوں تو مجھے ہر طرف اپنے افسانوں کے لئے مواد نظر آتا ہے جس طرح دنیا بھر کے سرمایہ داروں کو اپنی صنعتوں کے لئے خام مواد کی ضرورت ہوتی ہے اُسی طرح مجھے بھی اپنے افسانوں کے لئے خام مواد درکار ہوتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے خام مواد کی خاطر لاکھوں بے گناہوں کا خون بہا کر ملک فتح کرتے ہیں۔ نوآبادیات قائم کرتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کو سیاسی اور اقتصادی غلامی کا طوق پہناتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے افسانوں کے خام مواد کے لئے کسی کو ایذا نہیں پہنچانی پڑتی۔ یہ خام مواد میرے چاروں طرف بکھرا پڑا ہے۔ بھوک، افلاس، بے روزگاری، بیماری، جہالت، محکومیت، پستی، ذلت، محرومیاں، آہیں، آنسو —— ان چیزوں کی دنیا میں کمی نہیں اور یہی میرے افسانوں کا خام مواد ہے۔

راستہ چلتے میں، بازار سے سودا خریدنے میں، کتاب پڑھنے میں، اخبار دیکھنے میں، کسی سے بات کرنے میں —— غرض زندگی کے ہر کام میں اور ہر مشغولیت میں مجھے یہ خام مواد ملتا ہے۔

ابھی کل رات کا ذکر ہے میں دیہاتی زندگی کے متعلق ایک مرہٹی ادیب کا مقالہ پڑھ رہا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

شاعر اگر چرواہے کی بانسری پر ایک نظم لکھتا ہے تو اُس کی یہ کوشش رائگاں ہے۔ اگر وہ دیہاتی دوشیزہ اور اُس کی چھلکتی ہوئی گاگر کے گیت گاتا ہے تو اپنی شاعری کو ضائع کرتا ہے۔ اس لئے کہ دیہاتی دوشیزہ پانی کا گھڑا ڈھونے سے زیادہ امکانات اپنے اندر رکھتی ہے۔ اُس کی داستان اُن ہزاروں لاکھوں لڑکیوں کی داستان ہے جن کے ماں باپ اُن کو ابتدائی تعلیم دلانے کا مقدور بھی نہیں رکھتے۔ کتنے آنسو ہیں جو آنکھوں سے بہ جاتے ہیں —— نوعمر لڑکوں کے آنسو! کتنی آہیں ہیں جو دل سے اُٹھتی ہیں اور سینے کے اندر گھٹ کے رہ جاتی ہیں —— کمسن لڑکیوں کی آہیں! یہ آنسو کس لئے ہیں اور یہ آہیں کیوں؟ تعلیم کے لئے! علم کی اُس روشنی کے لئے جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن جس سے بیشتر انسان محروم ہیں۔ آج تک کسی شاعر نے اس موضوع پر نظم نہیں لکھی۔ کبھی افسانہ نگار نے مایوس، ناکام اور محروم تعلیم بچوں کی داستان رقم نہیں کی کہ یہ انسانی زندگی کی سب سے زبردست ٹریجڈی ہے

ماندگی

میں نے یہ سطور پڑھیں اور سوچنے لگا۔ یقیناً مجھے ایک ایسا افسانہ لکھنا چاہیئے ـــــ ایک ناشاد و نامراد لڑکے کی داستان جو تعلیم حاصل کرنے کا بے انتہا شوق رکھتا ہے لیکن حصولِ تعلیم کے تمام ذرائع سے بالکل محروم ہے۔ مگر پلاٹ کیا ہونا چاہیئے؟

میں افسانے کا پلاٹ سوچ رہا تھا کہ پنڈت جی کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ارے بھئی ہو؟"

"ہاں بھئی ہیں" میں نے کمرے میں سے کہا۔

"اماں باہر آؤ۔ کہاں گرمی میں اندر گھُسے بیٹھے ہو!"

"پنڈت جی اندر آ جایئے۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"باتیں واتیں کچھ نہیں کرنیں۔ میں ٹہلنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا آیا۔"

"یار۔ کیسے بدمذاق آدمی ہو۔ اتنی پیاری چاندنی رات ہے اور تم کمرے میں بند کتابوں سے سر پھوڑ رہے ہو ـــــ یہ مصنف بھی عجیب چیز ہوتا ہے۔"

"چل رہا ہوں بھائی چل رہا ہوں۔ کیوں جان کو آ گئے۔"

میں پنڈت جی کے ساتھ ہو لیا۔ واقعی رات نہایت حسین تھی۔ زمین سے لے کر آسمان تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی ـــــ روشنی اور نور کا ایک بے پایاں سیلاب جو اپنے دھاروں پر دنیا کو ایک کشتی کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا۔ وہ سیدھی اور لامتناہی سڑک جس پر ہم چل رہے تھے ایک ایسی ندی معلوم ہوتی تھی جس کا پانی ساکن ہو گیا ہو۔ چاندنی اس قدر تیز اور اتنی شفاف تھی کہ درختوں کے پتے بلکہ زمین کے ذرّے تک گنے جا سکتے تھے۔

پنڈت جی خاموش نہیں رہ سکتے تھے اور حقیقت میں یہ خاموش رہنے کا موقع بھی نہ تھا۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن میرا حصہ اس گفتگو میں "ہوں ہاں" سے زیادہ نہ تھا۔ میرا دھیان افسانے میں تھا۔ میں اپنی نئی کہانی کا پلاٹ سوچ رہا تھا۔ کبھی غور سے چاند کو دیکھتا کبھی درختوں کا جائزہ لیتا اور کبھی فضا میں دور کسی چیز کو تکنے لگتا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس چاندنی رات اور اپنے افسانے کے ہیرو میں کوئی تعلق پیدا کر سکوں۔

اتنے میں پنڈت جی کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا۔ اور وہ ذرا خاموش ہوئے۔ کوئی بیس قدم خاموشی کے ساتھ چلے ہوں گے کہ مجھے معلوم ہوا کہ افسانے کا پورا پلاٹ میرے ذہن میں موجود ہے۔ ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ چاند کی شعاعیں میرے دماغ میں داخل ہو گئی ہیں۔ پلاٹ یہ تھا۔

ایک کم عمر دیہاتی لڑکا ـــــ بے حد غریب ـــــ باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ـــــ حصولِ تعلیم کا دلدادہ ـــــ ذہین ـــــ ہر وقت پڑھتے رہنے کا آرزومند ـــــ لیکن رات کو نہیں پڑھ سکتا ـــــ روشنی کا انتظام نہیں ہے ـــــ چاندنی راتوں میں چاند کی روشنی میں پڑھا کرتا ہے ـــــ آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔

میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا۔ بے اختیار پنڈت جی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"ہائیں ہائیں! کیوں خیریت تو ہے؟"

"آج میں بہت خوش ہوں پنڈت جی!"

"اماں کچھ بات بھی ہو۔"

"تم بڑے پیارے معلوم ہوتے ہو پنڈت جی"

"ارے یار کیوں گرمی میں لپٹے جا رہے ہو؟ ـــــ ارے بھئی ہٹو۔ کیا مصیبت ہے! ـــــ اُفّوہ! ـــــ اماں یہ کیسا دورہ پڑا تم کو؟ ـــــ"

بمشکل تمام پنڈت جی نے اپنے آپ کو چھڑایا۔

"یہ کیا وحشت ہے؟"

میں جوشِ مسرت سے رقص کر رہا تھا۔

"آخر کیا مطلب اس دیوانگی کا؟"

میں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"میں سمجھا" پنڈت جی بولے۔ "تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

"ہرگز نہیں"

"پھر کیا بات ہے؟ کیا کسی سے آنکھ لڑائی ہے؟ کیوں صاحب! یہ کھل کھیل رہے ہو۔ مگر میاں بتائے دیتا ہوں زمانہ بڑا نازک ہے۔ پٹ پٹا جاؤ گے۔ بڑا خطرناک میدان ہے یہ!"

"آپ کہاں بھٹک گئے پنڈت جی! یہ بات بالکل نہیں ہے"

"اچھا پھر ٹھیک ٹھیک بتاؤ کیا قصہ ہے۔"

"میرے ذہن میں افسانہ کا ایک پلاٹ آیا ہے۔"

"کیا؟"

"ایک پلاٹ سوچا ہے میں نے افسانے کا"

"بات تمہارے کی! بالکل ہی بیوقوف ہو۔ یہ مصنف بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں خدا بچائے ان مراقیوں سے — کیا پلاٹ سوچا ہے آپ نے؟ ذرا معلوم تو ہو!"

میں نے جیسے جس طرح سوچا تھا، اُس طرح شروع سے آخر تک بیان کیا۔

"چھی! کیا قصہ گھڑا ہے آپ نے!" پنڈت جی سُن کر بولے۔ "اور میں ایک اصلی واقعہ سناؤں آپ کو جو اس سے کہیں زیادہ پُر اثر ہے"

"سنائیے"

"میں پہلے جس مکان میں رہتا تھا وہ مکان تو تم نے دیکھا ہے"

"نہیں میں نے نہیں دیکھا۔"

"خیر اُس مکان میں ایک داروغہ جی میرے شریک تھے۔ وہ مکان ہی اس وضع کا تھا کہ دو گھرانے اس میں رہ سکیں۔ آدھے میں میں رہتا تھا۔ آدھے میں وہ۔"

"کس قسم کے داروغہ تھے وہ؟" میں نے پوچھا

"پولیس کے داروغہ! سب انسپکٹر پولیس"

"اچھا اچھا"

"تو یہ داروغہ بڑا ہی موذی تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مچھر یہاں بہ کثرت سے ہوتے ہیں تم جانتے ہی ہو!"

"جی ہاں بارہ مہینے رہتے ہیں۔"

"اور گرمیوں میں تو عجیب مصیبت ہوتی ہے۔ اگر مچھردانی لگاؤ تو گرمی بہت لگتی ہے اور نہ لگاؤ تو رات بھر مچھر سونے نہیں دیتے۔"

"ٹھیک ہے"

"تو یہ داروغہ جانتے ہو کیا کرتا تھا، کمرے میں سوتا تھا"

"اندر کمرے میں؟"

"ہاں اندر کمرے میں اور رات بھر پنکھا کھنچواتا تھا"

"اوہ! کیا خوب حل ڈھونڈا ہے مشکل کا۔ اچھی ترکیب تھی"

"جی ہاں اچھی ترکیب تھی مگر اُس کے دل سے پوچھئے جو رات بھر پنکھا کھینچتا تھا۔"

مجھے اپنی بے حسی پر بہت شرم آئی۔ میں نے جھینپ مٹانے کے لئے کہا۔ "کیوں بجلی کا پنکھا نہیں تھا اُس کے پاس؟"

"ابی بجلی کا پنکھا کہاں سے آیا اس ——— کے پاس" فقرے میں پنڈت جی نے داروغہ کے لئے ایک ایسا وزن دار استعمال کیا کہ میری تحریر اُس کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔

میں سچ مچ متاثر ہو رہا تھا۔ "پھر کیا ہو

"بس اُس نے ایک گاؤں کا آدمی پکڑ لیا تھا۔ کچھ پولیس دھونس، کچھ دو وقت کی روٹی کا سہارا۔ غریب رات بھر پنکھا کھ تھا۔"

"کوئی نوجوان تھا؟"

"نہیں، ادھیڑ عمر کا آدمی تھا ——— اور لطف کی بات کہ رات بھر پنکھا کھینچنے کے بعد اُسے دن میں بھی سونے کو نہیں ایسے ہی گھنٹہ دو گھنٹے آنکھ لگا لیتا ہو تو لگا لیتا ہو ورنہ میں تو دن بھر کام میں مصروف دیکھتا تھا — گرمیوں بھر اُس نے پنکھا اور اُس کے بعد — جانتے ہو کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"وہ اندھا ہو گیا۔"

"اندھا ہو گیا؟"

"ہاں! ایک آنکھ بالکل ضائع ہو گئی۔ دوسری سے ذرا دیتا تھا۔ وہ بھی اُس وقت! اب معلوم نہیں کیا حال ہے۔ میں سمجھتا ہوں بالکل اندھا ہو گیا ہو گا۔"

بہت دیر تک ہم دونوں خاموشی کے ساتھ چلتے رہے۔ پنڈت جی بولے "اچھا اب لوٹنا چاہیئے۔ دس بج چکے ہوں گے"

"چلئے" میں نے مڑتے ہوئے کہا۔ اور ہم واپس گھر روانہ ہوئے۔ راستے میں بہت کم بات چیت ہوئی کیونکہ یہ کے بعد میری ساری زندہ دلی ختم ہو چکی تھی۔

رخصت ہوتے وقت پنڈت جی بولے۔ "تو یہ قصہ لکھو افسانے کی شکل میں؟"

"ضرور لکھوں گا" میں نے جواب دیا۔

یہ وعدہ میں نے کل کیا تھا اور آج چوبیس گھنٹے کے ا ——— اس کو پورا کر رہا ہوں۔

وہ افسانہ جو مرہٹی ادیب کی عبارت پڑھ کر میرے ذہ ہے پھر کسی وقت لکھوں گا۔ دنیا میرے افسانوں کے لئے خام بھری پڑی ہے!

اختر انصاری دہلو

دیوانہ

چہرہ کچھ اترا ہوا سا چشم تر غمناک سی — لب پہ ہلکی ہلکی آہیں اور سر پر خاک سی

دل میں پوشیدہ جنوں کا جذبۂ بے اختیار — بال بکھرے پریشاں جیب و داماں تار تار

آنکھ میں دیوانگی کا عکس لہراتا ہوا — اور ماتھے پر جلال عشق بل کھاتا ہوا

ذرے ذرے میں کسی کی جستجو کرتا ہوا — اور اپنے آپ سے کچھ گفتگو کرتا ہوا

سنگریزوں اور کانٹوں کے ستم سہتا ہوا — پاؤں کے چھالوں سے خوں رستا ہوا بہتا ہوا

انگلیوں کو عالم وحشت میں چٹخاتا ہوا — اور کچھ بے ربط سے الفاظ دہراتا ہوا

پھیرتا ہے ہر طرف وحشی نگاہوں کو کبھی — اور گھماتا ہے غبار آلودہ باہوں کو کبھی

انگلیوں سے کر رہا ہے کچھ اشارے بار بار — کتنی بے تابی ہے اس کے دل میں کتنا اضطرار

اس کے بے معنی اشاروں میں بھی کوئی راز ہے — ہر نظر دل کے تلاطم کی خموش آواز ہے

حاصل جوش جنوں ہے اس کا پیہم اضطراب — جانے کیا کیا راز دل میں کھا رہے ہیں پیچ و تاب

چشم ظاہر بیں تری اس راز سے واقف نہیں — ایک دیوانے کے سوز و ساز سے واقف نہیں

تو سمجھتا ہے کہ اس کی عقل ہے کھوئی ہوئی — تو سمجھتا ہے کہ اس کی روح ہے سوئی ہوئی

تو سمجھ سکتا نہیں جذبات کی آواز کو — تو سمجھ سکتا نہیں دیوانگی کے راز کو

تو جسے سمجھا ہے دیوانہ وہ دیوانہ نہیں — عقل کے اسرار سے واقف ہے بیگانہ نہیں

اس کو اپنی زندگی کا مدعا معلوم ہے — دور صبح و شام کا مقصد ہے کیا معلوم ہے

جانتا ہے وہ جہاں کی انتہا کچھ بھی نہیں — زندگی بس ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں

جانتا ہے وہ طلسم رنگ و بو کیا چیز ہے — آرزو کیا چیز ہے اور جستجو کیا چیز ہے

جانتا ہے وہ جہاں ہے رنگ و بو کا اک حجاب — جس کی تہ میں کھا رہے ہیں راز فطرت پیچ و تاب

تو مگر اس راز بے پایاں کو پا سکتا نہیں — جو نظر آتا ہے اس کو تجھ کو آ سکتا نہیں

سوز و ساز عشق سے واقف ہے دیوانے کا دل — شمع کی لو کو سمجھ سکتا ہے پروانے کا دل

اس کی نظروں کے لئے اسرار ہستی بے نقاب — تیری نظروں کے لئے ہر راز پر سو سو حجاب

ہر نفس اس کا جنون عشق کی روداد ہے — اور ہر فریاد اس کی حاصل فریاد ہے

عشق سے اور عشق کی منزل سے بیگانہ ہے تو — محفل دنیا میں اک بے سوز پروانہ ہے تو

اس کی وحشت پر حریم زندگی کو ناز ہے
اس کی ہستی راز ہے اے بے خبر اک راز ہے

باقی صدیقی

قبرستان کی ساحرہ

پانچ دوست کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان میں سے دو ابھی کنوارے تھے اور تین شادی شدہ۔ سب کے سب ادھیڑ عمر کے تھے اور امیر بھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار، گذرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے وہ اس طرح جمع ہوتے تھے اور کھانا کھا چکنے کے بعد رات کے دو دو بجے تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ انہیں یوں آپس کا ملنا جلنا بہت پسند تھا۔ یہ شامیں جو اکھٹے بیٹھ کر وہ گذارتے، ان کی زندگی کی بہترین شامیں تھیں۔ وہ ہر بات کے متعلق گفتگو کرتے ——— ہر ایسی بات کے متعلق جو اہلِ پیرس کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے ——— جیسا کہ عام دیوان خانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو صبح کے اخبارات پر تبصرہ آرائی تک محدود تھی۔

ان زندہ دل دوستوں میں سے ایک جوزف بارڈوں تھا۔ جو ابھی کنوارا تھا۔ اس کی زندگی آوارگی میں گذری تھی مگر اس کے اخلاق پر کسی قسم کا دھبہ نہ تھا۔ ایسی زندگی اسے بہت مرغوب تھی۔ اور اس "نوجوانی" میں بھی ——— کہ ابھی بمشکل چالیس برس کا تھا ——— وہ پوری گرمجوشی کے ساتھ اس سے لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ الغرض حقیقی معنوں میں وہ ایک جہاندیدہ آدمی تھا۔ فہم و ادراک میں سے ایک معتد بہ حصہ اسے ودیعت کیا گیا تھا۔ اس کی واقفیتِ عامہ بہت وسیع تھی گو حقیقی علم سے وہ عاری تھا۔ وہ بہت زود فہم تھا لیکن بالغ نظری سے مبرا۔ اس کی مہمات اور اس کے مشاہدات نے اسے بہت سی دلچسپ کہانیوں کا "مجموعہ" بنا دیا تھا۔ ان واقعات کو وہ اس قدر فلسفیانہ اور مزاحیہ رنگ دے کر بیان کیا کرتا کہ لوگ اس کی ذکاوت کی داد دیتے تھے۔

اس کی صحبت بہت مرغوب ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ ضرور کوئی نہ کوئی فرمائشی کہانی سنایا کرتا تھا اور سب دوست اس کے منتظر رہتے تھے۔ آج اس نے ہماری درخواست کے بغیر ایک کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ اس کمرے کی دھندلی فضا میں میز سے سہارا لئے ہوئے، جس پر شیمپین سے آدھا بھرا ہوا گلاس پڑا تھا۔ وہ یوں مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ جس طرح بعض جاندار، بعض جگہوں میں بعض حالات میں بڑے آرام سے زندگی گذارتے ہیں۔ مثلاً سنہری مچھلی، پانی کے اندر اور پاکباز عورت گرجے میں۔

سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے وہ بولا۔ "تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک عجیب سا واقعہ مجھے درپیش آیا"۔

سب نے متوجہ ہو کر کہا۔ "پھر؟"

اور اس نے اسی وقت وہ واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ "تم سب جانتے ہو کہ مجھے اس شخص کی طرح جو پرانی اور نادر چیزوں کو جمع کرنے کی غرض سے ادھر اُدھر پھر تا رہے، شہر میں گھومنا بہت پسند ہے۔ لوگوں کو پاس سے گذرتے دیکھ کر اور ہر واقعے کا مشاہدہ کر کے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے ستمبر کے وسط کا ذکر ہے کہ موسم نہایت خوشگوار تھا اور میں دن کو پچھلے پہر بغیر کسی مقصد کے باہر نکل آیا۔ ہم مردوں کے دل میں ہمیشہ یہ موہوم سی خواہش جاگزیں رہتی ہے کہ کسی خوب صورت عورت سے ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ ہم اس کا تصور اپنے دل میں بٹھائے رکھتے ہیں۔ ہم ایک عورت کی دلکشی کا دوسری عورت کی دلکشی سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کس عورت کے خیال سے ہمارے جذبات زیادہ مرتعش ہو جاتے ہیں اور پھر ایک کے انتخاب میں اپنا آخری فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔

"مگر جب سورج خوب چمک رہا ہو اور ہوا خوشبودار ہو تو بعض اوقات ہمارے دل میں ایسی خواہش ناپید ہو جاتی ہے۔

"اس روز سورج تیزی سے چمک رہا تھا اور ہوا خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سگرٹ سلگایا اور باہر کو چل پڑا۔ چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ چلو آج مانٹ مارٹر کے قبرستان کو دیکھتے چلیں۔ مجھے قبرستان دیکھنے کا بہت شوق ہے کیونکہ قبروں کو دیکھ کر میرا دل غم اور افسوس سے

لبریز ہو جاتا ہے اور یہ حالت بعض اوقات میرے لئے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میرے چند بہترین دوست وہاں آخری نیند سو رہے ہیں اور میں بھی کبھی ان کی رفاقت میں جا رہنے کا آرزومند ہوں۔

عرصہ ہوا میں نے اپنی ایک دلآویز محبوبہ کو اسی قبرستان میں دفن کیا تھا۔ یہ دلفریب نوجوان عورت مجھے بہت محبوب تھی اور جب اس کی یاد مجھے ستاتی ہے تو میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور مجھے یوں معلوم ہوتا ہے گویا میں اس کی قبر کے قریب ہی کھڑا ہوں۔

"قبرستان مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ بڑا قبرستان آبادی سے دور ان تمام مردہ انسانوں کو سمیٹے ہوئے ہے جو یہاں مدفون ہیں۔ اور پیرس کی ان تمام ان گنت نسلوں کی تعداد کتنی ہے جو اس زمین کے ساتھ ہمیشہ کے لئے پیوست ہو گئی ہیں اور جو قبر کی گہرائی میں سے نیچے بہایت ہی محدود جگہ میں دائمی نیند سو رہی ہیں۔۔۔ مگر زندہ انسانوں کی حالت کو دیکھئے کہ یہ ناتواں روحیں جن کے لئے کتنی وسیع جگہیں ملتی ہیں اور یہاں کس قدر وسیع ہو گئے ہیں۔

قبرستان میں بعض یادگاریں ایسی ہیں جو کہیں عجیب نمائش میں نظر آتی ہیں۔ سانسن مارٹری کو کستان کی یادیں سے روشنی کا ایک عظیم الشان عمارت ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

"میں قبرستان میں داخل ہوا۔ میرے دل پر کچھ کچھ رنج والم طاری تھا۔ یہ کیفیت اتنی گہری نہ تھی۔ میرے دل میں خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اس جگہ کی زندگی اتنی خوشگوار نہیں۔ کچھ بھی ہو یہی یہاں کی رہائش سے مجھے گریز چاہئے۔

خزاں کے آغاز بھیگے ہوئے مردہ پتوں کی بو اور سورج کی زرد روشنی، یہ چیزیں اس [illegible] موت کی تنہائی کے احساس کو زیادہ کر رہی تھیں اور ہر چیز کی بے ثباتی پر شاہد تھیں۔

"میں آہستہ آہستہ قبروں کے درمیانی راستوں پر چلتا گیا۔ میں نے کتبے پڑھنے شروع کئے۔ دنیا میں اور کوئی چیز کتبوں کے پڑھنے سے زیادہ دلچسپ نہیں۔ یہ صلیبی پتھر اور سنگ مرمر کی سلیں جن پر گذرے ہوئے لوگوں کے پسماندہ عزیزوں نے الفاظ کے ذریعے سے اپنے رنج کا اظہار کیا ہے اور ان کی نجات کے لئے دعا مانگی ہے۔ پال کاک کی سب سے اچھی کہانیوں سے کہیں زیادہ قابل مطالعہ ہیں۔ مگر قبرستان میں سب سے زیادہ جو چیز میری توجہ کو جذب کرتی ہے وہ صنوبر اور شمشاد کے درخت ہیں جو خالی جگہوں میں اُگے ہیں اور جو کبھی ان گذرے ہوئے آدمیوں کی آرام گاہ ہوا کرتے تھے۔ آہ! ایک روز یہ سرسبز درخت جو شاید مردہ انسانوں کے اجسام سے نشو و نما پاتے ہیں گرا دیئے جائیں گے تاکہ آنے والی نسلوں کو مزید خاک کرنے کے لئے جگہ مہیا ہو سکے۔

"تھوڑی دیر تک بے مقصد پھرنے کے بعد میں تھک گیا اور اپنی محبوبہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ارادہ لئے میں اس کی قبر پر پہنچا۔ میرا دل سخت غمگین تھا۔ بے چاری۔۔۔۔ کس قدر دلکش اور دلربا تھی۔ اور کس قدر خوبصورت اور سفید فام ——— اور اب ———اگر اس کی قبر کو کھولا جائے تو۔۔۔۔!

"قبر پر جھکتے ہوئے میں نے آہستگی سے اپنے افسوس کا اظہار کیا۔ جو شاید اس تک نہ پہنچا ہوگا۔ میں واپس جانے کے لئے مڑا کہ یکایک ایک عورت پر میری نظر پڑی جو ساتھ والی قبر پر سیاہ لباس پہنے ہوئے گہرے رنج میں مبتلا تھی۔ کریپ کی نقاب پیچھے کو ہٹ گئی تھی اور اس کے دلربا اور خوبصورت بال نظر آ رہے تھے ———میں واپس جانا بھول گیا۔

"وہ ازحد غم سے بے حال سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا ——— اور رنج والم کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی یوں معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی بُت بنا کھڑا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی الم انگیز یاد میں کھل کھل کر ایک نعش کے قریب نعش بنی کھڑی ہے۔ یکایک وہ رونے لگی۔ روتے وقت اس کی کمر اس طرح جنبش کر رہی تھی جس طرح ہوا کی شدت کے ساتھ سرکنڈے متحرک ہو رہے ہوں۔ پہلے وہ نرم آواز میں بولی۔ پھر اپنے کندھوں اور اپنی کمر کو بہ شدت جنبش دیتی ہوئی وہ بلند آواز میں رونے لگی۔ اچانک اُس نے اپنے چہرے کو بے نقاب کر دیا۔ اس کی آنکھیں، جو آنسوؤں سے لبریز تھیں، دلربا معلوم ہوتی تھیں۔ چند لمحوں تک وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی گویا وہ کسی ہیبت ناک خواب سے بیدار ہوئی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس پر اپنی نظریں گاڑے بیٹھا ہوں تو اس نے اپنا چہرہ دوبارہ چھپا لیا۔ گویا وہ بے حد شرمسار ہو رہی تھی۔ اب اس نے دل دوز آہوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنا سر قبر کے پتھر پر جھکایا۔ اپنی پیشانی کو اس کے ساتھ پیوست کر دیا۔ اس کی نقاب اس کے جسم کے گرد پریشان پڑی تھی جس کے سائے سے سنگ قبر کی سفیدی سیاہی مائل ہو رہی تھی۔

میں نے اس کا گریہ و شیون سنا اور معاً اسے غش کھا کر زمین پر گرتے دیکھا۔

"میں اس کی جانب بھاگا اور اس کے ہاتھوں کو ملنا اور سر پر ہوا کرنا شروع کی۔ اسی اثنا میں قبر کے مندرجہ ذیل کتبے پر بھی نظر ڈالی۔

"پیارا مہ فوج کا کپتان لوئی گیری، جو ٹانگن کے مقام پر دشمن کی گولی سے جاں بحق ہوا، اس جگہ سو رہا ہے۔"

کتبے کی تاریخ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ موت چند ماہ قبل واقع ہوئی تھی مجھ پر اس درجہ رقت طاری ہوگئی کہ قریب تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے مگر میں نے استقلال سے کام لے کر لڑکی کے پریشان حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر اسے ہوش آگیا۔ میرے چہرے سے میری پریشانی ظاہر تھی۔ اس کی پہلی ہی نظر سے جو اس نے مجھ پر ڈالی، یہ مترشح تھا کہ وہ ضرور میری بروقت امداد سے متاثر ہو کر میری ممنون ہوگی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بتا دیا کہ کس طرح اس افسر کے ساتھ اس کی شادی ہوئی اور کس طرح وہ ٹانگن میں شادی کے ایک سال بعد مارا گیا۔ اس نے محبت کی بنا پر اس سے شادی کی تھی۔ یہ یتیم رہ گئی تھی۔ اور اس کے پاس شادی کے لئے بمشکل ہی کافی روپیہ تھا۔

"میں نے اس کی غمگساری کی۔ اسے دلاسا دیا اور کھڑا ہونے میں اس کی مدد کی۔ میں نے کہا۔

"تم یہاں نہ ٹھہرو۔ آؤ چلیں"۔

وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی "میں چل نہیں سکتی"۔

میں نے کہا "آؤ۔ میں تمہاری مدد کروں"۔

وہ بولی "آپ کا شکریہ۔ آپ بڑے مہربان ہیں کیا آپ بھی کسی بچھڑے ہوئے عزیز پر آنسو بہانے آئے ہیں؟"

"ہاں مادام"

"کیا کسی عورت کی جدائی پر؟"

"ہاں مادام"

"اپنی رفیقہ پر؟"

"نہیں اپنی محبوبہ پر"

وہ کہنے لگی "آدمی اپنی محبوبہ سے بھی اتنی ہی محبت کر سکتا ہے جتنی اپنی بیوی سے۔ کیونکہ محبت کی دنیا میں کوئی قانون نہیں"۔

میں نے جواب دیا "ہاں مادام"

اس گفتگو کے بعد ہم اس جگہ سے ہٹ گئے۔ وہ میرا سہارا لئے چل رہی تھی اور میں اسے قبرستان کے راستوں میں سے تقریباً اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ جب ہم قبرستان سے باہر آئے تو وہ دھیمی آواز میں کہنے لگی "مجھے ڈر ہے کہیں مجھ پر غشی نہ طاری ہو جائے"۔

"میں نے پوچھا "مادام! کیا تم کوئی چیز کھانے کی خواہش محسوس کرتی ہو؟"

اس نے کہا "ہاں"۔

"مجھے قریب ہی ایک ریسٹوران مل گیا۔ جہاں پر صدمہ رسیدہ دوست تدفین کا غم انگیز فرض ادا کرنے کے بعد جمع ہوتے ہیں۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ میں نے اسے گرم گرم چائے کی ایک پیالی پلا دی جس سے اس میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

"ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگا اور اس نے اپنی رام کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ کہ گھر کی چار دیواری میں تنہا رہ کر زندگی کے لمحے ــــ گذارنا بھی کس قدر مشکل ہے اور یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ ایک انسان کے پاس کوئی ایسا رفیق نہ ہو جس سے وہ محبت کر سکے اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے دل کے راز اسے بتا سکے۔

"یہ کلمات اس کے دل سے نکلتے ہوئے کس قدر پر خلوص اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دل بھر آیا۔ وہ نوجوان تھی شاید بیس سال کی ہوگی۔ میں نے اس کے سامنے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوئی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے اسے گاڑی میں بٹھا کر اس کے مکان تک پہنچانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ گاڑی میں ہم ایک دوسرے کے اس قدر قریب بیٹھے تھے کہ ہم لباس میں بھی جسموں کی حرارت کو محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ احساس حقیقتاً دنیا بھر کے احساسات سے کہیں زیادہ انبساط انگیز ثابت ہو رہا تھا۔

"گاڑی اس کے مکان کے سامنے رکی۔ وہ کہنے لگی "میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں اس قابل نہیں کہ سیڑھیوں کی مسافت طے کر سکوں کیونکہ میں چوتھی چھت پر رہتی ہوں آپ نے اس سے پہلے مجھ پر اتنی عنایات کی ہیں کہ میں اب اپنے کمرے تک پہنچنے کے لئے دوبارہ آپ کی امداد طلب کرنے کی جرأت کرتی ہوں"۔

"میں نے مسرت کا اظہار کیا۔ وہ آہستہ آہستہ ہر ایک سیڑھی پر سانس لے لے کر اوپر چڑھتی گئی۔ اپنے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ بولی "آئیے چند منٹ کے لئے اندر آجائیے تاکہ میں آپ کی عنایات کا شکریہ ادا کر سکوں"

"میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس کا کمرہ درمیانے درجے کا تھا بلکہ یوں کہئے کہ درمیانے درجے سے بھی کچھ کم ہی۔ مگر ہر ایک چیز سلیقے اور قرینے سے پڑی تھی۔

"ہم دونوں ایک کوچ پر بیٹھ گئے۔ اس نے دوبارہ اپنی تنہائی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے خادمہ کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی تاکہ میرے لئے کوئی پینے کی چیز مہیا کرے۔ مگر وہ حاضر نہ ہوئی میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ یہ خادمہ کسی کسی وقت ہی اُسکے پاس آتی ہوگی۔

اس نے اپنی ٹوپی اتار دی۔ کیسی اب وہ کتنی دلربا معلوم ہوتی تھی اس کی چمکیلی سحر انگیز آنکھیں میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھیں۔ میرے دل میں اس وقت جذبات کا ایک طوفان برپا تھا جس کے آگے میری عقل و خرد بے بس ہو چکی تھی میں نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے

ایک گھنٹے کی دلنشین گفتگو کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ تم کھانا کس جگہ سے کھایا کرتی ہو؟

"یہیں ایک معمولی سے ریسٹوران سے!"

"اکیلی ہی؟"

"ہاں تو۔"

"کیا آج تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی؟"

"کہاں پر؟"

"کسی اچھے سے ریسٹوران سے!"

"وہ ذرا جھجکی۔ مگر اس خیال کے پیش نظر کہ وہ اکیلی رہ جائے گی بالآخر مان گئی۔ اور کہنے لگی "تو میں ذرا ہلکا سا گون پہن لوں"

"وہ اپنی خواب گاہ میں گئی۔ باہر آئی تو اس نے ہلکا پھلکا سا دلکش اور بیم مانی لباس پہن رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس قبرستان جانے کے لئے علیحدہ لباس تھا اور بازار کے لئے علیحدہ۔

"کھانا بہت پر لطف رہا۔ شمپین کی تھوڑی سی مقدار ہی نے اسے جلا دیا اور وہ کہیں زیادہ دلکش معلوم ہونے لگی۔

ہم دونوں اکٹھے ہی مکان پر واپس آگئے۔

"یہ تعلق جس کا آغاز قبرستان میں ہوا تھا تین ہفتے تک قائم رہا۔ مگر آدمی ہر ایک چیز۔ بالخصوص عورتوں سے اُکتا جاتے ہیں۔ میں نے ایک ضروری کام کا بہانہ تراش کر کے اسے خیر باد کہہ دی۔ علیحدہ ہوتے وقت میں اس سے بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اس نے بھی میرا بہت شکریہ ادا کیا اور مجھ سے حتمی وعدہ لیا کہ میں ضرور دوبارہ اس سے ملوں گا۔

" مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میرے لئے اس کے دل میں الفت موجود ہے۔

اُس سے جدا ہو جانے کے بعد مجھے اور بہت سی مصروفیات در پیش آگئیں۔ اور ایک مہینہ یا کچھ اتنا ہی عرصہ گذر گیا اور اس محبت کی شبیریں یاد تازہ رہنے کے باوجود بھی میں قبرستان کی محبوبہ سے دوبارہ ملاقات نہ کر سکا۔ بہر حال ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے اور کسی راز، علم النفس کے کسی ایسے لاینحل عقدے کی طرح جس کا تجزیہ ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے، میرے دل میں جاگزیں ہے۔

"میں نہیں بتا سکتا کہ کیوں مگر ایک روز میرے دل میں خیال آیا کہ میں مانٹ مارٹری کے قبرستان میں جا کر اسے دیکھوں۔ میں وہاں پہنچا اور دیر تک وہاں پھرتا رہا۔ بجز ان بدستور آنے والے سوگوار لوگوں کے، جنہوں نے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے اپنا رشتہ محبت منقطع نہیں کیا تھا اور جو عام طور پر وہاں آیا کرتے تھے، کسی اور شخص سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ اس کپتان کی قبر، جو ٹانکن میں مارا گیا تھا، پھولوں اور ہاروں کے بغیر سونی پڑی تھی۔

جونہی میں موت کے اس بہت بڑے شہر کے دوسرے حصے میں سے گذر رہا تھا میں نے ایک جوڑے کو گہرے سوگ میں دیکھا۔ یہ دونوں قبروں سے بنے ہوئے تنگ راستے سے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی . . . . میں نے اُسے پہچان لیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور کھسیانی سی ہو گئی۔ جب میں تیزی سے اس کے پاس سے گذرا تو اُس نے میری طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا جو صاف صاف یہ کہہ رہی تھیں کہ "مجھے نہ پہچانو، میرے پیارے"۔

"آج جو آدمی اس کے ساتھ تھا تقریباً پچاس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس کی اُسی طرح مدد کر رہا تھا جس طرح کہ قبرستان سے باہر نکل کر میں نے کی تھی۔

میں یکسر حیران سا ہو کر رہ گیا۔ میری آنکھوں نے جو کچھ

ابھی ابھی دیکھا تھا، مجھے اس پر یقین نہ آتا تھا میں حیرانی کے عالم میں کھویا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ بنی نوع انسان کا کونسا فرقہ ہے جس سے قبرستان کی یہ شکارن تعلق رکھتی ہے۔ کیا وہ فی الحقیقت ایک چالاک اور سرگرم رنڈی تھی، جو قبرستان میں اُن بے قرار انسانوں کا شکار کرنے کے لئے پھرتی رہتی تھی جو محبوبہ یا رفیقہ کے کھو جانے پر اپنی گُم شدہ محبت کی تلاش میں وہاں آتے ہوں۔ کیا یہی ایک ہے جو وہاں شکار کھیلتی ہے! کیا اس جیسی اور بھی وہاں موجود ہیں؟ کیا یہ ان کا مستقل پیشہ ہے؟ کیا عام مقامات کی طرح قبرستانوں میں بھی ایسے افعال کا ارتکاب ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا میں قبرستان کی رنڈیاں بھی موجود ہیں! یا صرف اسی ایک کے دل میں ان الفت زا حسرتوں سے کھیلنے کا یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ جو اس مدفن میں پرورش پاتی ہیں ــــ

اس روز وہ کس شخص کی بیوہ تھی! میں یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہوں ؛

(رموپساں) **طاہر قریشی**

رباعی

سب ہو رہے چارہ گر دوا دے مجھ کو
اٹھ کھول کے آنکھ زہر پلا دے مجھ کو
بعد اس کے اٹھا ہاتھ دعا کے لئے تو
یارب کی مناجات خدا دے مجھ کو

سید احمد اعجاز

شعور تحت الشعور

اک غنچۂ ناشگفتہ اک باغ میں تھا ناگہ اس کے قریب اک پھول کھلا
اُس غنچے کو رنگ و بوئے گل نے مارا ہو کر حیران رہ گیا بے چارا
نظارۂ حسنِ گل میں دیوانہ ہوا وہ آتشِ گل پہ گویا پروانہ ہوا
آخر فکرِ وصال میں ڈوب گیا ہمت کر کے قریبِ محبوب گیا

پوچھا کہ ترے وصل کی صورت کیا ہے
گل نے ہنس کر کہا
"کہ زحمت کیا ہے"
فیضانِ نسیمِ صبح سے مل کر دیکھ!
تو خود بھی تو پھول ہے، ذرا کھِل کر دیکھ!

امجد

نوائے یگانہ

خدارا میرے اُن کے اور کوئی درمیاں کیوں ہو
پیمبر کیوں بنے آخر کسی کا راز داں کیوں ہو؟

بہارِ زندگی ناداں بہارِ جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرام جاں کیوں ہو!

جفا کو ہم وفا سمجھے نہیں تو چل بسے ہوتے
مگر وہ پوچھتے کیا ہیں کہ تم اب تک جواں کیوں ہو؟

کبھی جلوہ دکھاتے ہو تو آئینہ در آئینہ!
کھلا پردہ سہی، پھر بھی یہ پردہ درمیاں کیوں ہو؟

کوئی ناگفتنی مطلب ہے اِن نیچی نگاہوں کا۔
زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو؟

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ اُمیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضلِ الٰہی ناگہاں کیوں ہو!

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو!

اک آنکھیں ہیں کہ تکتی ہیں کسی کو ٹکٹکی باندھے
یہاں سر ہے نہ سودا ہے تو سجدوں کا نشاں کیوں ہو!

تجھی سے اُڑ چلے ہیں پَر لگا کر خاک کے پتلے
خداوندا زمیں سے پست اتنا آسماں کیوں ہو!

ریاضت سے جو حاصل ہو وہی سچی مسرت ہے
میسر آ سکے غافل تو اِن داموں گراں کیوں ہو؟

بشر ہوں میں فرشتہ کیوں بنوں جیسا ہوں اچھا ہوں
بغاوت اپنی فطرت سے نصیبِ دشمناں کیوں ہو؟

یگانہ سے بھڑکتا کیوں ہے ظالم ماجرا کیا ہے؟
تجھی میں چور ہے، ورنہ یہ کھٹکا درمیاں کیوں ہو؟

میرزا یگانہ لکھنوی
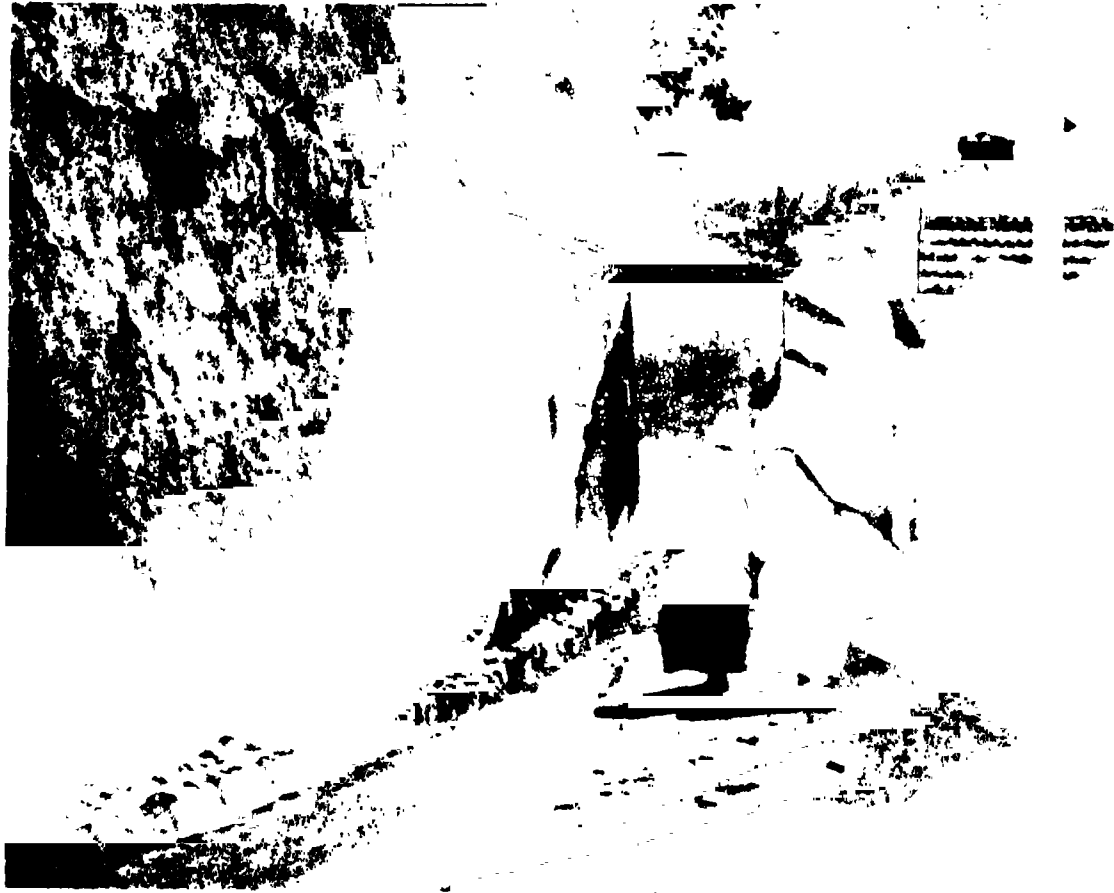
سراجیوو کا ایک اسلامی محلہ

سراجیوو کے بازار میں

مہنجو دڑو کا ویرانی محلوں کی سب سے پہلی ولایت کا سروے شہادت ہے

مدامت و شکایت

یورپ کا مکّہ

سراجیوو

۱۹۱۴ء میں ایک ہیبت ناک آگ نے جنگ عظیم کی صورت اختیار کر کے دنیا کو اپنی آتشیں لپیٹ میں لے لیا۔ اس آگ کا اولیں شعلہ آسٹریا کے ولی عہدِ سلطنت اور اُس کی بیوی کے قتل کا واقعہ تھا۔ یہ شعلہ سراجیوو ہی سے اُٹھا تھا۔ اس اہم واقعہ نے سراجیوو کا نام اقصائے عالم میں مشہور تو کر دیا لیکن اس بات سے بہت کم لوگ واقف تھے اور غالباً اب بھی بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ خطہ یورپی مسلمانوں کے نزدیک مقدس ترین مقامات سے ہے۔ سراجیوو کی زیارت حج مکہ کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ آس پاس کے باشندے عموماً غریب ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو سفرِ عرب کی استطاعت رکھتے ہوں۔ جنوب مشرقی یورپ میں لاکھوں مسلمان آباد ہیں اور صرف پولینڈ میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ سب مسلمان سراجیوو کو سارے برِ اعظم میں علومِ دینیہ کا واحد مرکز تصور کرتے ہیں۔ یہاں ایک یونیورسٹی بھی موجود ہے جسے "زواب" کہتے ہیں۔ یوگوسلافیہ، پولینڈ، بلگیریا اور رومانیہ کے وہ طالب علم جو قاضی بننا چاہتے ہوں اسی یونیورسٹی سے علومِ دینیہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں داخلے کی اجازت صرف اُن اُمیدواروں کو دی جاتی ہے جو پہلے سراجیوو کے شریعت کالج سے بی اے کی سند حاصل کر لیں۔ نیز اس کے لئے عربی اور ترکی زبان کی تحصیل لازمی ہے۔ غرضکہ "زواب" ایسی درسگاہ ہے جہاں دینیات کی تعلیم تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں کا کتب خانہ قلمی نسخوں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کے اہم ترین کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

مملکتِ یوگوسلافیہ کی حدود کے اندر بوسینیا، ہرسیگونیا اور اس کے صدر مقام سراجیوو کے مسلمان عموماً وہ عیسائی ہیں۔ جو ترکوں کی صدہا سال کی حکومت کے دوران میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یوگوسلافیہ کے جنوبی علاقے میں حقیقی مسلمان آباد ہیں۔ یعنی وہ ترک جنہیں آپ رومانیہ اور بلگیریا میں دیکھتے ہیں اور جو اس سے پہلے یونان میں بھی بہت بڑی تعداد میں آباد تھے۔ صرف آخر الذکر ملک نے ترکی کے ساتھ اپنے ہم قوموں کا تبادلہ کر لیا چنانچہ یونان کی مسجدیں اب مومنوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے سُونی پڑی ہیں اور مرمت نہ ہونے کے باعث زمیں بوس ہوتی جا رہی ہیں۔ پولینڈ کے مسلمان تاتاریوں کی اولاد ہیں۔

بوسینیا۔ ہرسگونیا اور جنوبی یوگوسلافیہ کے قریباً تمام باشندے مشرقی طرز کا لباس اور فیض (ترکی ٹوپی) پہنتے ہیں۔ آپ ایک مسلمان اور ایک عیسائی میں تمیز صرف اُس کی پیٹی کے رنگ سے کر سکیں گے۔ کیونکہ مسلمان کی پیٹی کا رنگ ہمیشہ سبز ہوگا۔ یا پھر اُن کے چلنے کے طریق سے پہچانیں گے۔ مسلمان ہمیشہ اُس گھوڑے یا گدھے کے آگے آگے چلے گا جس پر اُس کی بیوی سوار ہوگی۔ لیکن ایک عیسائی ہمیشہ آگے آگے سوار جا رہا ہوگا۔ اور اُس کی بیوی پاپیادہ پیچھے آ رہی ہوگی۔

لیکن آپ کو یہ باتیں یوں اجمالاً بتانے کا کیا فائدہ۔ آئیے میں آپ کو اپنے ساتھ سراجیوو کی سیر کراؤں۔ میں آپ کو یہاں کی ہر چیز دکھاؤنگا۔ یہاں کے مرد، عورتیں، بازار اور گلیاں اور یہاں کے رسم و رواج اور وہ ہر چیز جو اس متبرک شہر میں موجود ہے۔

ساحل اڈریاٹک کے راستے سے سراجیوو کی طرف آتے ہوئے بوسینیا ہرسیگونیا کا قریب قریب تمام علاقہ عبور کرنے کے بعد ہم ایسی وادیوں میں سے گذرتے ہیں جن کے گرداگرد سُوکھی اور برہنہ پہاڑیوں کی گھور گھٹی ہوئی ہے آپ دُور دور تک نظر دوڑائیے۔ آپ کی حدِ نگاہ تک مشکل ہی سے کوئی درخت نظر آئے گا۔ کسی زمانے میں یہ پہاڑیاں سرسبز جنگلوں سے لہلہا رہی تھیں۔ لیکن گرد و نواح کے تمام راستے اور آبادیاں اُن ڈاکوؤں کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔ جو اپنا خونیں کام

سرانجام دینے کے بعد ان گھنے جنگلوں میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے چنانچہ ملک کو ان رہزنوں کے قہ بانی وجود سے پاک کرنے کے لئے یہ جنگل کاٹ ڈالے گئے۔

آج کل یہ سڑکیں بلکلیتہ محفوظ ہیں۔ اور اُن عورتوں اور مردوں سے آباد نظر آرہی ہیں جو یورپ کے مکہ کو جا رہے ہیں۔ اب ان پہاڑیوں کے خشات اور برہنہ رہنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ ہر طرف امن و امان نظر آرہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات کہیں کہیں کوئی برقعہ پوش عورت سڑک کے گرد و غبار میں یکہ و تنہا سفر کرتی دکھائی دے جاتی ہے۔

عام طور پر گھوڑوں اور خچروں کے بڑے بڑے کارواں دکھائی دیتے ہیں۔ جن پہ توڑے، چوبی صندوق، بوریاں، عورتیں اور بچے لدے ہوتے ہیں۔ اور پھر کہیں کہیں برقعہ پوش عورتوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ جن کے آگے آگے ایک آدھ مرد بڑا سا سفید پگڑ سر پہ رکھے اور سبز ٹیکا باندھے چلا جا رہا ہے۔ یہ سب لوگ اسی مقدس شہر کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم بھی اسی سمت کو چلتے ہیں کیونکہ ہمارا مقصود بھی وہی ہے۔ لیکن ذرا تیز تیز چلئے۔ جوں جوں ہم سراجیوو کے نزدیک پہنچتے جاتے ہیں۔ بھیڑ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ بعض گروہ تو ایسے ہیں کہ اُن کے چلنے سے گرد و غبار کے بگولے اُٹھتے ہیں اور آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ کل حج کا دن ہے مسلمانوں کا وہ بڑا میلہ جو رمضان سے دو مہینے دس دن کے بعد منعقد ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہی ہوں گے۔ "حج بیرم[1]" چار روز تک منائی جاتی ہے اس کی ابتدا بھیڑوں کی قربانی سے ہوتی ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اس کا عملی مفاد و مقصد ملک کے نادار اور غریب افراد کو کھانا بہم پہنچانا ہے۔

سڑک پر یا گاؤں میں یہاں سے بھی ہم گذریں ہم کسی کو سلام کرتے ہیں۔ سوائے عورتوں کے۔ کیونکہ یہاں کا رواج اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مرد غیر عورت کو سلام کرے۔ ہر مسلمان سے ہم سلام علیک کہتے ہیں۔ اور ہر عیسائی کو "دوبرودان" (روز بخیر) آپ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم ٹیکے کے رنگ سے ہر شخص کو پہچان لیتے ہیں۔ ہم جلد ہی شہر کے اندر داخل ہو جاتے ہیں ایک ایسی سہانی صبح کو جو سراجیوو جیسے خوبصورت مقام کے حسن کو اور بھی نکھار دیتی ہے۔ رنگا رنگ زندگی کے توقلموں نظارے یکایک ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے کانوں میں مصروف زندگی کا ایک مدھم سا نغمہ پہنچتا ہے اور یہ دوگونہ سحر اپنے حسن و لطافت سے ہمیں مسحور کر دیتا ہے۔ سنئے۔ مینارۂ مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوتی ہے۔ وہ ایمان والوں کو نماز کے لئے بلا رہا ہے اُس کی سریلی آواز ایک مسرت زا نغمے کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ ایسی مسرت جو صرف زاہدوں کو عطا ہوتی ہے۔ اور پھر بعض اوقات اسی نغمے سے ایسے ہلکے اور امن و سکون کی کیفیت طاری کرنے والے سُر نکلتے ہیں جو اس دنیا کے بجائے کسی اور دنیا سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ مؤذن کی آواز شہر کے گلی کوچوں پر چھا جاتی ہے۔ جامع بیگووہ کا مینار سراجیوو کا ہوشیار پہرہ دار ہے جو اسلام کے پیرو کو اُس کے فرائض یاد دلاتا رہتا ہے۔ مبادا دنیا کی دلفریبیاں اِسے اپنے پیغمبر کے احکامات سے غافل کر دیں۔

مسجد کے صحن میں ایک سکوت کا عالم طاری ہے۔ کھجور کے صد سالہ درخت خاموش کھڑے ہیں اور اُن کی ٹہنیوں کے سائے اُن کے سالخوردہ تنوں پر اٹکھیلیاں کر رہے ہیں۔ پرانے چشمے میں سے پانی کی ہلکی ہلکی گنگناہٹ نمازیوں کی دعاؤں کی آوازیں اُنہی کی ہمنوا معلوم ہوتی ہے۔ اور مسجد کی پُر ہیبت اور شاندار عمارت اس چمکتی ہوئی دھوپ میں اپنے بنانے والوں کی عظمت و جلال کا اظہار کر رہی ہے سورج کی گرم گرم کرنیں سایوں کو چیرتی ہوئی اندر تک جا پہنچی ہیں۔ اور ستونوں کے گرد اگرد سنہری فرش بچھا رہی ہیں۔

اور مسجد سے باہر زندگی کے کاروبار اپنے تمام زور و شور کے ساتھ جاری ہیں۔ مسجد بیگووہ کے گرد و نواح میں تمام تر مشرقی آبادی ہے جو ایک طرف تو نیچے دریائے ملاشکا تک چلی گئی ہے۔ اور دوسری طرف اوپر پہاڑیوں کی چوٹی تک جا پہنچی ہے۔ بازار میں زندگی کی ایک لہر چل رہی ہے۔ مسلمان عورتیں "فریجوں" میں لپٹی ہوئی اور مسلمان مرد فیض (ٹوپی) اور سبز ٹیکے پہنے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ قہوہ خانوں میں سے گانے والی لڑکیوں کی یکساں آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

"سراجیوو ایک بلند پہاڑی پر ہے
"میرا محبوب دور پردیس میں گیا ہوا ہے۔"

چھوٹی چھوٹی دوکانیں گرانبہا مشرقی سازوسامان سے اٹی پڑی ہیں۔ محمد کی دوکان میں مختلف النوع اشیاء کی نمائش سے متاثر ہو

[1] بیرم بمعنی عید

کہ ہم اندر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں نہ صرف جواہرات، زنگار رنگ کی زنجیریں اور عہدِ عتیق کے ایرانی زربفت و کمخواب ہیں بلکہ زمانۂ قدیم کے سنہری اور روپہلی ہتھیار اور گذری ہوئی شان و شوکت کی ہزاروں دوسری نشانیاں بھی موجود ہیں۔

محدل اپنے ہم وطن مسلمان بھائیوں کی روایات پر پوری طرح عمل کرتا ہے۔ وہ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ہم کیا خریدنا چاہتے ہیں وہ صرف ہماری خاطر تواضع کرے گا کیونکہ سراجیوو کا یہی دستور ہے۔ سب سے پہلے وہ ہمیں چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں ترکی قہوہ پیش کرتا ہے اور پھر ہم اُن گذرے ہوئے اچھے دنوں کا ذکر لے بیٹھتے ہیں جو اب کبھی نہ لوٹیں گے۔ ترکوں کی حکومت کا زمانہ، اس کے اہل و عیال کی خیر و عافیت، اور پھر آخر کار گفتگو اُن چیزوں کی طرف لوٹتی ہے جن سے اس کی دُکان بھری پڑی ہے۔ ہمارے عین سامنے سناروں کا بازار ہے۔ جہاں سے بے شمار ہتھوڑوں کے چلنے کی آواز آ رہی ہے لیکن یہ تمام شور محدل کی دلچسپ کہانیوں کے سننے میں مخل نہیں ہوتا۔

اس کی دُکان میں آئے ہوئے ہمیں قریباً ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اور یہ وقت خوب کٹا ہے بوڑھا محدل بڑا تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص ہے۔ یکایک وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہم حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ ایسی حرکت اس کی طبیعت کے سراسر خلاف ہے۔

"ماشاء اللہ" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔ آنے والا یقیناً عیسائی ہے اور ہمیں اس سے کچھ دلچسپی سی ہو جاتی ہے۔ ہم خاموشی سے ان کے مزاج پُرسی کے فقرات سنتے رہتے ہیں۔ آخر وہ دونوں قالین پر بیٹھ جاتے ہیں "ڈاکٹر ہاروٹس آفندی" اس کے بعد محدل ہمارا تعارف کراتا ہے۔ اس دفعہ ہم اسی رسمی علیک سلیک اور مزاج پُرسی میں اُلجھ جاتے ہیں . . . . ہاتھوں کو سینے پر رکھتے ہیں . . . . اور پھر جلد ہی ہم سراجیوو کے متعلق باتیں کرتے کرتے گرد و پیش کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ہاروٹس غیر معمولی ذہانت کا مالک اور ایک مہذب انسان ہے۔ وہ بیرسٹر بھی ہے اور جنوبی یورپ کے مسلمانوں کے حالات پر اسے پورا عبور حاصل ہے۔ "میں عیسائی ہوں" اس نے کہا "لیکن میرے دل میں اپنے ہم مذہب بھائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ عزت اور محبت ہے عیسائیوں میں ابھی بے شمار ایسی باتیں موجود ہیں جن پر انہیں شرمسار ہونے کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں اور میرے دوستوں کی ذہنیت کا مسخرا اڑاتے ہیں۔ یہی دوسروں کو چڑانے والا طرزِ عمل اُس خلیج کو وسیع تر کرتا چلا جا رہا ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان حائل ہے۔"

دوپہر ہونے کو آئی ہے، ہم محدل کی دُکان سے رخصت ہوتے ہیں۔ بازاروں اور گلیوں کی بھیڑ میں سے ڈاکٹر ہاروٹس ہماری رہنمائی کر رہے ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ یہاں کا ہر بازار ایک علیحدہ تجارت کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ ان بازاروں کو یہاں "چارشیا" کہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم "باش چارشیا" یا "اصلی چارشیا" ہے یہ ایک چھوٹا سا چوک ہے جس کے عین درمیان ایک اخبار فروش کی دُکان ہے۔

یہاں روزانہ ایک بازار لگتا ہے۔ اس جگہ نقاب پوش عورتیں بھی انڈے، مکھن اور چوزے بیچتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر ہاروٹس کہتے ہیں کہ جنگ عظیم سے قبل کوئی مسلمان خاتون اس طرح شارع عام میں آنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ لیکن افلاس و غربت نے رسوم و رواج اور روایات کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔

"ہاں، اسی طرح رفتہ رفتہ تمام روایات غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ پردے کے رواج کو بھی بڑا ضعف پہنچا ہے۔ اگرچہ دوسری رسوم کے مقابلے میں کم۔ یہاں سراچی بازار میں جہاں صرف موچی ہی بیٹھا کرتے تھے ابھی سے کئی دوسری دکانیں کھل گئی ہیں۔

تجارتی مقابلہ سخت تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کارخانے ہر قسم کی دستکاریوں کو تباہ کر رہے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی پکا مسلمان کسی راہرو کو اپنی دکان میں بلانے کے لئے کبھی متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ صبح سے شام تک وہ اپنی دُکان میں سامانِ تجارت سے گھرا ہوا آلتی پالتی مارے قالین پر بیٹھا رہے گا بعض اوقات اس کے پاس دوست یا گاہک بھی آ بیٹھیں گے جن کی تواضع وہ قہوے اور حقے سے کرتا رہے گا۔ وہ اپنی "تقدیر" پر شاکر ہے۔ جو اگر یاور ہوئی تو گاہک کو خود ہی اس کی دُکان پر لے آئے گی۔ "انشاء اللہ" "اگر خدا نے چاہا" — اور اگر خدا نے نہ چاہا تو بھی وہ راضی بہ رضا ہے۔ کیونکہ "خدا کی مرضی یہی تھی" چنانچہ دولت اور تجارت آہستہ آہستہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔

دولت کی کمی کے ساتھ ساتھ تعلیم کے امکانات بھی لازمی طور پر

کم ہو رہے ہیں اور وہ اپنے آپ کو غلط روایات کی پابندی سے ایک پس ماندہ قوم بنا رہے ہیں اور دل میں سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مشیّت اسی میں ہے۔"

سراجیوو میں سو سے کچھ اوپر مساجد ہیں لیکن ان سب میں دو مسجدیں اپنی عظمت و شان کے لحاظ سے اہم ترین خیال کی جاتی ہیں۔ "جامع زاریوہ" اور "جامع بیگووہ"۔ ان میں آخر الذکر بزرگ تر اور زیادہ قیمتی ساز و سامان سے مزین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کے پنج صد سالہ دورِ حکومت میں مشرقی رسم و رواج اور خیالات یوگوسلاویہ کے باشندوں کے رگ و ریشے میں ایسے سرایت کر گئے کہ اب ان کی غالب اکثریت ہو چکی ہے اور وہ مشرقی خصوصیات کے پتلے بن گئے ہیں۔ وہ نوشتۂ تقدیر کے قائل ہیں لیکن انہوں نے ترکی تاثرات کے ماتحت اس خصوصیت میں بھی مبالغے کی حد تک ترقی کر لی ہے۔ یہ حقیقت کی بات ہے کہ ایک مغربی قوم نے مشرقیت کو اس قدر جذب کر لیا ہے۔ اس حقیقت کو ڈاکٹر ہارونس نے مندرجہ ذیل کہانی کے ذریعے سے واضح کیا۔

"میرے ہم وطن بھی "الف لیلہ" اور "سخی آقا اور وفادار خادم" جیسی کہانیوں سے بہت شغف رکھتے ہیں۔ آپ نے غالباً محسوس کیا ہو گا کہ "جامع زاریوہ" یعنی شاہی مسجد بہت ہی چھوٹی ہے اور سراجیوو کی سب سے بڑی مسجد پر سلطنت کے ایک عہدہ دار خسرو بیگ کا نام کندہ ہے۔ لوگوں نے اس معمے کی توجیہ پر بہت غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کا نتیجہ مندرجہ ذیل افسانے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں استنبول میں سلطان فاتح حکمران تھا جو بڑا صاحب دل اور خدا دوست انسان تھا۔ اس نے اپنے وزیر خسرو بیگ کو ہمارے شہر میں دو مسجدیں تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بیگ شہنشاہ کا بڑا وفادار اور فرمانبردار خادم تھا۔ اس نے شہنشاہ کے احکام کی پوری پوری تعمیل کی۔ چنانچہ اس نے جو بڑی مسجد تعمیر کرائی اس پر شہنشاہ کا نام لکھا گیا اور چھوٹی مسجد پر اس کا اپنا نام نقش کیا گیا۔ اور یہی اس کے آقا کے احکام تھے۔ استنبول میں واپس جا کر اس نے بادشاہ کی مسجد کی بہت تعریف کی۔ شہنشاہ نے کہا میرے بیٹے تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا لیکن میں چاہتا ہوں کہ آج سے اس بڑی اور خوبصورت مسجد پر تیرا نام لکھا جائے اور چھوٹی مسجد میرے نام سے مشہور ہو۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے نزدیک بہت چھوٹا اور حقیر سمجھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

ہمارا مہربان راہبر ہمیں ایک عجیب جگہ دکھاتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ایک عمارت تھی جس کا نام "طاشلی خان" (دھان خانہ) تھا۔ یہ عمارت کئی منزلوں پر مشتمل تھی اور شہر کے تجارتی مرکز میں واقع تھی۔ اس کی عجیب و غریب خصوصیت اس کے مالکانہ حقوق کی نوعیت تھی۔ سب سے نچلی منزل کا مالک زمین کا مالک بھی تھا لیکن اوپر کی منزل کے مالک کو صرف ہوا پر مالکانہ حقوق حاصل تھے۔

"جامع زاریوہ" کے نزدیک جس پر مسلمانوں کا سبز جھنڈا لہرا رہا ہے پاڈوا کے سینٹ انطون کا گرجا بھی واقع ہے۔ جمعہ کے روز پانچ بجے شام کے قریب ڈاکٹر ہارونس ہمیں لئے ہوئے وہاں پہنچتے ہیں۔ گرجے کی عمارت میں کوئی تعمیری حسن نہیں ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ ہر منگل اور جمعہ کے روز تیسرے پہر کے قریب عیسائی، مسلمان اور یہودی زائر دور و نزدیک سے آ کر یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ سینٹ انطون گمشدہ چیزوں کی بازیافت میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ خدا جانے یہ غیر معمولی قبولیت انہیں کس طرح حاصل ہوئی کہ ہر مذہب و ملت کے انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اپنی ارادت اور عقیدت کے پھول ان کے بت پر چڑھاتے ہیں۔

نصف گھنٹے کے بعد ہم "تابش چار شیشہ" سے آگے ایک ڈھلوان گلی میں چڑھتے ہیں۔ یہاں "تسنان تکیہ" یعنی رقص کرنے والے مسلمان درویشوں کی خانقاہ ہے۔ ہمارے دائیں ہاتھ کو ایک تنگ سی گلی میں ایک تنہا مینار آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ "گمشدہ مینار" ہے۔ اس سے متعلقہ مسجد نیچے شہر کی آبادی میں واقع ہے لیکن مینار اس جگہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس حصہ شہر کے لوگ موذن کی آواز سے محروم نہ رہ جائیں۔

جیننا بازار میں متمول مسلمان رہتے ہیں۔ اگرچہ عام مسلمان افلاس و غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن بعض کے پاس ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کا کچھ نہ کچھ اندوختہ باقی ہے۔ مسلمانوں کے گھروں کی حالت ان کی نکبت و افلاس کی آئینہ دار ہے۔ بازار سے گذر کر ہمیں گھروں کی چاردیواری کے اوپر لکڑی کے پردے نظر آتے ہیں۔ یہ پردہ گھر کی عورتوں کو ہمسایوں اور رہ گذروں کی گستاخ نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ گھر کی عورتوں میں ایک بیوی، ماں، بہنیں اور بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یہاں کے مسلمان تعدد ازدواج کے قائل نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو ہمسائے کی جائیداد خریدنے کے لئے حق شفع

حاصل ہے حق شفع اختیاری حق ہے جس سے استفادہ کرنا اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ ایک مشہور قول ہے :-

"اپنی جائداد کو نامرغوب ہمسائگی سے بچاؤ . . . "

ہم "باش چارشبہ" کی طرف واپس آتے ہیں جہاں بڑی بھیڑ ہو رہی ہے۔ آؤ دیکھیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس بھیڑ کے درمیان ایک عجیب ہیئت کا آدمی ایک سفید گھوڑے پر بیٹھا ہے۔ باوجود مقطع صورت ہونے کے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک معلوم ہوتا ہے۔

"یہ شیخ عثمان ہے" ڈاکٹر ہارولٹس ہمیں بتاتے ہیں "بدقسمت عاشق اس کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ دیکھئے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر تعویذ لکھ لکھ کر اپنے عقیدت مندوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ اور انہیں کہہ رہا ہے کہ متواتر تیرہ دن تک انہیں ہر روز علی الصباح بازار کے نلوں سے پانی پینا ہوگا۔ چودھویں صبح کو دلکی مراد حاصل ہو جائے گی۔ اس کا فوٹو نہ اتاریئے اسے ان باتوں سے نفرت ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اسے اپنی ہر تصویر میں جان ڈالنی پڑے گی"۔

رات کے وقت بازار سنسان ہو جاتے ہیں اور گلیوں پر سکوت چھا جاتا ہے۔ سوائے مسجدوں کے جہاں کھجور کے پرانے درخت ایک ہلکا اور میٹھا راگ الاپ رہے ہیں لیکن شہر سے پرے پہاڑ کی اُن گھاٹیوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں محبت بھرے اور غمناک گیتوں کی لے تاریک فضا میں گونجتی ہوئی ستاروں سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ ان گیتوں کو "سیودا لیوک" کہتے ہیں اور انہیں کے ذریعے سے شیخ عثمان کے معتقد اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ ان میں کچھ عشاق زیادہ خوش قسمت بھی ہیں جو اپنے محبوب کے مکان کی کھڑکی کے نیچے کھڑے ہوئے سرود شبانہ کے ذریعے اپنا افسانۂ محبت سنا سکتے ہیں انہیں اس بات کا علم ہے کہ ان کی محبوبہ کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے پیچھے موجود اس نغمۂ محبت کو سن رہی ہے۔ عاشق و معشوق کی اس قسم کی ملاقات کو "آشک لیوک" کہتے ہیں۔ بوسنیا کے نوجوان مسلمانوں کو دوسرے اسلامی ملکوں کے رسم و رواج کے خلاف اس طور پر اپنی محبوبہ سے ملاقات کرنے کی اجازت ہے۔ لڑکا اپنے لئے ایک لڑکی کا انتخاب کر لیتا ہے اور پھر صرف والدین سے اجازت حاصل کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں صرف ایک پابندی لازمی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ نوجوان عاشق اپنی محبوبہ کو حرم کی کھڑکی سے ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ جمعہ کی شام کو دیکھ سکتا ہے۔

ان تکلیف دہ ڈھلوان گلیوں میں سے ہم اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہم اُس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں جو سرائیوو کے نواح میں سب سے بلند ہے شہر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بے شمار جگنوؤں کی طرح دور نیچے نظر آ رہے ہیں اور ان کا عکس دریائے "ملاشکا" کی سطح پر پڑ کر شہر کے حسن کو دو بالا کر رہا ہے۔ شہر کے شور و شغب کی جگہ ایک مدھم سی میٹھی راگنی ہم تک پہنچ کر فضائے آسمانی میں غائب ہو رہی ہے . . . . ایسے جیسے کوئی ان دیکھا عاشق اس زندۂ جاوید شہر کا مدحی نغمہ ہلکے ہلکے سروں میں گا رہا ہو۔

چارلس لطراش

رُباعی

ہے فیضِ بہار سے ہوا ابھی مخمور
ہے مست عنادل کی نوا ابھی مخمور
مے خواری و مستی سے معاف آج ہیں ہم
لا جام کہ آج ہے خدا ابھی مخمور

سعید احمد اعجاز

سالنامہ ادبی دنیا

آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا سکتا ہے

اوکاسا جرمنی کے ڈاکٹروں کی ایسی حیرت انگیز ایجاد کردہ دوا ہے کہ جس کے مقابلہ کی یا اس کے برابر اثر رکھنے والی دوسری دوا اب تک تیار نہیں ہو سکی۔ دنیا کے ہر ملک میں لاکھوں مرد و عورت اوکاسا کے استعمال سے اپنی زندگی، تندرستی، طاقت اور پوری جوانی دوبارہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہزار لاکھوں کی تعداد میں لوگ اوکاسا کا استعمال کر رہے ہیں۔ اوکاسا کے اثرات کا راز اس میں ہے کہ اس کے استعمال سے جسم کے ہر حصہ کو غذا پہنچتی ہے۔ خصوصاً ان غدود یعنی گلینڈز جن پر تمام زندگی اور صحت کا دار و مدار ہے یہ بات تصویر میں اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے۔ صرف تین ہفتہ کے استعمال سے معلوم ہو جائیگا کہ **اوکاسا** دراصل آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا دے گا۔ آپ کی طاقت آپ کی صحت اور جوانی از سر نو واپس آجائے گی۔ آپ کے چہرے پر رونق اور تازگی پیدا ہوگی۔ اور آپ کے جسم کی رگیں اور پٹھے اور تمام اعضا، خصوصی طاقتور بن جائیں گے۔

اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنیوالی دوا نہیں ہے

برخلاف اور تمام طاقت کی دواؤں کے جن میں کشتہ جات۔ کچلہ۔ دھاتیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ اوکاسا بالکل بے ضرر اور قطعی اشتعال انگیز یا گرمی کرنے والی دوا نہیں ہے کیونکہ اوکاسا میں کسی قسم کا کشتہ یا دھات یا کچلہ وغیرہ شامل نہیں ہے۔ اوکاسا ان اجزا سے بنی ہوئی ہے۔ جن کو انگریزی میں گلینڈز کہتے ہیں۔ گلینڈز یا غدود جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے آدمی کے جسم کا اہم ترین جزو ہیں۔ اس لئے اوکاسا آپ کے گلینڈز کو طاقتور بناتا ہے۔ گرمی پیدا کرنیوالی اور اشتعال انگیز نہیں ہے ہر حالت میں اور ہر موسم میں اوکاسا استعمال کر سکتے ہیں

اوکاسا کے متعلق مفصل کتاب آپ مفت طلب کیجئے۔ پتہ:- اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ پوسٹ بکس ۲۹۶ بمبئی

اوکاسا آج ہی استعمال کرنا شروع کر دیجئے
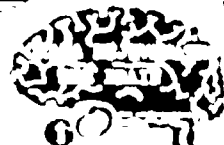
غزل

وفائے تو پہ تری کیوں نہ سوگوار ہوں میں
فریب خوردۂ الطاف بے شمار ہوں میں

زمانہ مجھ کو بٹھاتا ہے اپنی آنکھوں پر
کہ تیرے دردِ محبت کی یادگار ہوں میں

تری نگاہِ کرم کے یہ سب کرشمے ہیں
دماغ عرش پہ ہے، گرچہ خاکسار ہوں میں

مرے ہی عشق سے ہے یہ فروغِ حُسن ترا
تو گلستانِ لطافت تری بہار ہوں میں

میں کس امید پہ اپنی وفا پہ ناز کروں
جو اُٹھ گیا ترے دل سے وہ اعتبار ہوں میں

تو مجھ کو عذرِ تغافل سے شرمسار نہ کر
کہ تجھ سے ذکرِ ستم کر کے شرمسار ہوں میں

وہ راز ہوں کہ سمجھنا محال ہے میرا
اگرچہ سارے زمانے پہ آشکار ہوں میں

مری نوا سے دلِ کائنات لرزاں ہے
کسی کی یاد میں اس طرح بے قرار ہوں میں

حفیظ ہوشیارپوری

نکہت

کلبۂ احزاں میں نکہت آئی اور آ کر گئی
ایک خوشبو تھی، مشامِ جاں کو مہکا کر گئی

سامنے آئی نگاہیں شرم سے نیچی کئے
دلکشی کی دل نشیں تصویر دکھلا کر گئی

خوشبوؤں کے قافلے لائی وہ اپنے ساتھ ساتھ
ہر قدم پر ایک باغِ خلد مہکا کر گئی

نیلگوں ملبوس، پھر رفتار کی شوخی غضب
اُف گھٹا کی تیرگی میں برق لہرا کر گئی

جس طرف نکلی چمک اٹھی فضائے تیرہ فام
ہر طرف اک نور کا طوفان برپا کر گئی

تاب لا سکتی نہ تھی میری نگاہِ شوخ کی
لاجونتی سے بھی شرمیلی تھی شرما کر گئی

اپنے پیکر کی گل افشانی میں شرما کر چھپی
میری آنکھوں پر حیا کے پھول برسا کر گئی

چھپ گئی اک پل میں نظروں سے پسِ دیوار در
آہوئے رم خوردہ کی مانند گھبرا کر گئی

مہدی علی خاں

غزل

وہ شوخ دلنواز جو مجھ سے خفا ہے آج
کیا غم کہ شوق و جرأت لا انتہا ہے آج

آ دوست میرے پاس کہ ہستی کو بھول جائیں
جاں بخش و دلگداز تری ہر ادا ہے آج

کیا صبحدم بہار نے پھولوں میں مے بھری
ہر گل فروغِ رنگ سے ساغر بنا ہے آج

ہے سجدۂ نیاز کو اُس بُت کی آرزو
جس کی نگاہِ ناز میں رنگِ وفا ہے آج

آیا شباب و شعر کے عالم میں انقلاب
ہر گوشہ حسن و عشق کی دنیا بنا ہے آج

جور و جفا کا نقش زمانے سے مٹ گیا
وہ بانیِ ستم جو کرم آشنا ہے آج

کیسے چھلک رہی ہیں نگاہوں کی مستیاں
وہ رشکِ ناز گھر میں مرے آ رہا ہے آج

مرغوب جامِ شعلۂ جوالہ پیش کن
لختے ز دل بطرزِ گل و لالہ پیش کن

نذیر احمد خاں مرغوب

ایک شوہر کا روزنامچہ

میری بیوی کا سنسار میں بہت مان ہے وہ کچھ بہت پڑھی لکھی نہیں ہے۔ نہ بی اے ہے نہ ایم اے۔ نہ اُس نے کسی اسکول کالج کی تعلیم پائی ہے گھر ہی میں تھوڑا بہت اپنی کوشش سے سیکھا ہے ہندی کا مطالعہ اچھا کرلیا ہے۔ تھوڑی سنسکرت اور انگریزی بھی جانتی ہے۔ مگر اُسے سمجھ بہت اچھی ملی ہے بات کی تہ تک پہنچتی ہے اور ہر چیز کی جانچ پڑتال اچھی کرتی ہے۔ اُس کی دنیا جس میں اُس کا مان ہے کچھ بہت بڑی نہیں ہے وہ نہ لیڈر ہے نہ مشہور قومی کارکن۔ اس لئے اس کو جاننے والے بہت نہیں ہیں اپنے کنبہ برادری کے لوگ یا میل ملاقات والے ہی اُسے جانتے ہیں مگر معلوم نہیں اُس میں کیا بات ہے کہ جو اُس سے ملتا ہے اُس کا ادب کرتا ہے اور ادب ہی نہیں محبت بھی کرنے لگتا ہے۔ میں بھی اُس سے محبت کرتا ہوں مگر میرے دل کو اُس جیسی بیوی پاکر اطمینان نہیں ہے۔ میں بہت سوچتا ہوں کہ کیا سبب ہے کہ جسے سبھی جاننے والے پسند کرتے ہیں جس کے میل ملاپ میں سب لوگ ایک طرح کی مٹھاس اور پریم پاتے ہیں اُس کا ملنا جلنا طور طریقہ میرے دل کو شانتی نہیں دیتا اُس سے اور مجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ برسوں بیت گئے پر میں نے نہیں دیکھا کہ اُس نے میری کسی بات پر غصہ کیا ہو یا میری کسی بات کی مخالفت کی ہو لیکن پھر بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف میری ہی نہیں تو کیا اس کا دل کسی دوسرے کی طرف مائل ہے یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ میں نے تو کبھی اُس کو کسی مرد سے کھُل کر بات کرتے نہیں دیکھا۔ اور پھر وہ تو اتنی اچھی اور مذہبی خیال کی ہے کہ اُس کے متعلق میں خیال بھی نہیں کرسکتا کہ وہ خواب میں بھی اپنے خاوند کے سوا کسی دوسرے کا خیال کرے گی۔ پھر کیا سبب ہے کہ میں اُس کے اور اپنے بیچ میں ایک پردہ سا محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے پاس بیٹھی بھی ہوتی ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے گویا وہ مجھ سے بہت دور ہے اُس میں مجھ میں کوئی بڑا راز ہے! کیا ہے؟ یہ تو میں بتا نہیں سکتا لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں اور وہ دو الگ الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اُس کا دھیان مجھ میں رہے جو باتیں مجھ کو پسند ہیں وہ اُس کو پسند ہوں اور جو مجھ کو ناپسند ہیں وہ اُس کو بھی ناپسند ہوں۔ وہ پورے دل سے میری پسند اور ناپسند، میرے کام دھندے میں، میرے اچھے بُرے میں شریک رہے وہ میری شریک نہیں رہتی۔ یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اکثر وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ جسم سے میری شریک ہے دل سے نہیں ہے۔ اس بات کا مجھے دُکھ رہتا ہے کیونکہ میری خواہش تو یہ رہتی ہے کہ جس شوق اور سرگرمی سے میں کسی کام کو کروں اُسی شوق اور سرگرمی سے وہ بھی اُس میں شریک ہو اور جو بات مجھے ناپسند ہو وہ میری ہی طرح اُسے ناپسند کرے۔ لیکن میری بیوی جو کچھ کرتی ہے۔ اُس میں ایک طرح کی بے تعلقی اور مجبوری دکھائی دیتی ہے۔ کسی بات کے نہ کرنے سے یا کسی چیز کے نہ ملنے سے اُسے دُکھ نہیں ہوتا ہے اور کرنے یا ملنے سے اُسے بہت خوشی بھی نہیں ہوتی۔ مجھے سیر، تماشے اور پکنک وغیرہ کا بہت شوق ہے جب کبھی میں اُس کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں تو مجھے اُتنا لطف نہیں ملتا جتنا غیر عورتوں کے ساتھ ملتا ہے۔ کھیل تماشے سینما تھیٹر کا اُس پر وہ اثر نہیں پڑتا جو غیر عورتوں پر پڑتا دیکھتا ہوں۔ نہ اُس میں وہ ہنسی ہے نہ وہ جان ہے نہ وہ جوبن اور اُمنگ ہے جو مجھے غیر استریوں میں بھلی معلوم دیتی ہے۔ کھیل کود میں بھی وہ اکثر بیگانہ سی رہتی ہے بھاگنا دوڑنا کھیل کود میں اپنی جان لڑا دینا یہ بات اُس میں نہیں ہے۔ ہندوستانی عورتوں کو یہ سب سکھایا ہی نہیں جاتا۔ پھر بھی اگر وہ اسکول کالج گئی ہوتی اور وہاں ہم سبقوں کے ساتھ انگریزی ڈھنگ کے کھیل کھیلے ہوتے تو شاید یہ بات اُس میں آجاتی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ استریوں کے لئے اسکول کالج کی تعلیم بہت ضروری ہے اس کے بغیر اُن میں جیون کا رس لینے اور اُس کا سُکھ حاصل کرنے کی طاقت نہیں آتی۔ وہ کسی مغربی تعلیم پائے ہوئے مرد کو لُبھا نہیں سکتیں اسی کے سبب سے میری استری بھی میری

بھی شریک زندگی نہیں بن سکی۔

میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگتی۔ میں اپنے گھر میں سولہ آنے مالک ہوں۔ میرا سب روپیہ پیسہ میرے ہی ہاتھ میں رہتا ہے اور میں ہی خرچ کرتا ہوں کہیں کہیں میں دیکھتا ہوں کہ مرد اپنے روپے پیسے پر اپنی جائیداد پر سب اختیار اپنی عورتوں کو دے دیتے ہیں میں اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ محنت مشقت کر کے اپنی دولت کو دوسرے کے ہاتھ میں سونپ دینا مجھے ٹھیک نہیں جچتا۔ میں اپنے دھن دولت کو اپنی ہی مرضی کے مطابق خرچ کرتا ہوں۔ جس کو جیسے مناسب سمجھتا ہوں دیتا لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کنجوس نہیں ہوں۔ دھن جمع کر کے رکھتے جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اسی لئے دولت میرے پاس رہتی بھی نہیں جیسے آتی ہے ویسے نکل جاتی ہے۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں اپنی عورت کو بھی کچھ دوں لیکن کیا دوں وہ تو کبھی کچھ مانگتی ہی نہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کو کسی چیز کی خواہش بھی نہیں۔ دینا اُس کو اچھا لگتا ہے جو خوشی سے یا آرزو سے تحفہ کرے اور شوق سے اُس کا استعمال کرے۔ لیکن جس کے لئے کسی چیز کا ملنا نہ ملنا ایک جیسا ہو اُس کو کیا دے۔ مجھے یاد نہیں کہ آج تک میں نے اُس کو کوئی زیور یا کپڑا بنوا کر دیا ہو۔ پھر کبھی اُس نے اس کا برا مانا ہو یہ بھی مجھے یاد نہیں ہے میرا دل چاہتا ہے کہ وہ مجھ سے اس بات کا گلہ کرے مجھ سے کچھ مانگے کسی چیز کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کرے جس میں اُس کو کچھ دینے کا اُس کی کسی خواہش کو پورا کرنے کا موقعہ ملے لیکن اُس کے دل میں کسی خواہش کے نہ ہونے سے میں یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتا کہ میں اُسکی غلطی کیسے کروں اُس کا آنا ادا س رہنا مجھے برا لگتا ہے اور ایک دوبار میں نے اس کا گلہ بھی کیا ہے۔ میں نے کہا "تم غرور کے باعث مجھ سے کچھ مانگتی نہیں۔ تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ تمہارے دل میں یہ گھمنڈ ہے کہ تم مجھ سے کیوں کچھ لو اسی سے تم ایسا کرتی ہو نہیں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی تمہارا دل کسی چیز کے لینے کو نہ چاہتا ہو۔" اس گلہ کا جواب وہ آہستگی کے ساتھ بہت میٹھا دیتی ہے۔ لیکن مجھے اُس کا پورا یقین نہیں ہوتا وہ مجھے جھٹلا دیتی ہے۔ "آپ کیا بات کرتے ہیں۔ کبھی کسی ہندو بیوی کے دل میں اپنے خاوند کے سامنے غرور یا گھمنڈ کا خیال آ سکتا ہے۔ آپ میرے خاوند ہیں سر کے تاج ہیں میری آرزوؤں کو پورا کرنے والے ہیں جو کچھ مجھے چاہیئے آپ ہی سے تو ملتا ہے کھاتی ہوں پیتی ہوں آرام سے رہتی ہوں۔ اور مجھے کیا چاہیئے آپ یا میں کوئی الگ الگ تھوڑے ہیں۔ آپ جو خرچ کرتے ہیں وہ سب میں ہی تو کرتی ہوں ایک ہاتھ سے نہ ہوا دوسرے سے ہوا۔ آپ کے ہاتھ کو میں اپنا ہی ہاتھ مانتی ہوں اور آپ کی مرضی کو اپنی مرضی۔ میرے آپ کے بیچ میں لین دین کی بات تھوڑی چل سکتی ہے کہ میں آپ سے مانگوں اور آپ دیں یا آپ مجھ سے مانگیں اور میں دوں میں تو اپنے آپ کو آپ ہی کا ایک حصہ مانتی ہوں جو آپ کا ہے سب میرا ہی ہے اسی لئے جو کچھ آپ خرچ کرتے ہیں وہ سب میں ہی کرتی ہوں۔ آپ اس کو یقین جانیئے۔"

لیکن اُس کے یہ کہنے پر یقین کیسے کروں میں تو کبھی خرچ کرتے ہوئے پوچھتا نہیں اور اکثر تو اُس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میں کیا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ پھر میں کیسے مان لوں کہ جو کچھ میں صرف کرتا ہوں اُس کی مرضی سے کرتا ہوں اور وہ اپنے آپ کو میرے ساتھ برابر کی مالکن سمجھتی ہے ایسے مالک تو میں نے کبھی نہیں دیکھے کہ اُن کا روپیہ پیسہ اس طرح خرچ ہو رہا ہو۔۔ وہ سچ مچ ایسا سمجھتی تو ضرور کبھی مجھ سے حساب مانگتی کبھی میرے خرچ کے ڈھنگ کی پوچھ کرتی۔ کبھی اپنی مرضی سے خرچ کرنا چاہتی۔ یہ سب وہ نہیں کرتی۔ اسی سے مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ اپنے مان میں بھری بیٹھی رہتی ہے اور میرے پیسہ کا جتنا کم ہو سکے، اُتنا کم استعمال کرتی ہے یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے ایسا لگتا ہے اس کی کوئی بھی ایسی آرزو نہیں جس کو میں ہی پورا کر سکوں اس لئے وہ کہے یا نہ کہے ایک طرح سے وہ مجھ سے بے تعلق اور آزاد ہے۔ مجھے اُس کی یہ آزادی کیسے بھا سکتی ہے میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ایسے رہے جیسے شاخ درخت کے ساتھ رہتی ہے شاید میرا ہی غرور ہی ہو جس کے سبب میرے دل میں یہ خواہش ہو لیکن جو کچھ بھی ہو اُس کا غرور ہو یا میرا گھمنڈ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا یہ ڈھنگ مجھے پسند نہیں اس سے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ عورتیں اچھی ہیں جو رات دن لباس کے تقاضوں سے خاوندوں کو دم نہیں لینے دیتیں۔ اس سے خاوند کو اُن کی خدمت کا موقعہ تو ملتا ہے۔

وہ تو مجھ سے کبھی لڑتی ہی نہیں میں دانستہ یا نادانستہ بہت سی ایسی باتیں کرتا ہوں جن کے سبب سے دیکھتا ہوں کہ بڑے بڑے گھروں میں جنگ ہو جاتی ہے۔ بہت بار میں اُس سے اُلجھ جاتا ہوں۔ خانگی امور میں، رائی بھر بھول ہو جانے سے گھنٹوں بھر کا لیکچر دے ڈالتا ہوں۔ "تمہیں گھر کا انتظام کرنا نہیں آتا دیکھو ہر عورت کیسی خوبی سے گھر کو

چلاتی ہے تمہیں چار آدمیوں میں بات کرنا نہیں آتی دیکھو ہر عورت کیسی تیز باتیں کرتی ہے۔ دس آدمیوں کے دل کو ایک ساتھ اپنی باتوں میں لگائے رہتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں سبھا سوسائٹی میں باتیں کرنا بھی ایک گہرا آرٹ ہے جسے ہر عورت کو سیکھنا چاہیئے۔ تم تو بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتیں" وہ یہ سب شانتی سے سنتی ہے اور کوئی جواب نہیں دیتی ایک بار میں اشنان کر جا رہا تھا۔ ہمیشہ کی جگہ پر مجھے اپنا تولیہ نہیں ملا۔ اُس کو اتنے ہی پر میں نے خوب ڈانٹا لیکن پھر بھی وہ چُپ کی چُپ رہی میں جانتا ہوں کہ میں بہت دفعہ اُس سے غیر مناسب سلوک کر جاتا ہوں لیکن اُس کی اس بے حد شانتی سے میں کبھی کبھی جھنجھلا اُٹھتا ہوں۔

۔۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنے لگتا ہوں۔ کسی بات کا جواب نہ ملنے پر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ہڈی اور گوشت کی بنی عورت سے سلوک کر رہا ہوں یا کسی بے جان پُتلی سے جسے نہ کوئی بات اچھی لگتی ہے نہ بُری۔ جس سے نہ کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور کوئی سُکھ نہیں ملتا۔ میں نے سُنا ہے اور دیکھتا بھی ہوں کہ عورت کے خمیر میں رشک کا مادہ بہت ہوتا ہے وہ اپنے خاوند کا کسی دوسری عورت سے ہنسنا بولنا۔ ملنا جلنا نہیں سہہ سکتی۔ فوراً چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کا دل جلنے لگتا ہے میں نے سوچا کہ اپنی بیوی کو سمادھی سے جگانے کے لئے یہ ایک اچھا ذریعہ ہوگا۔ میں نے اُس کی سکھی سہیلیوں سے سنگ ساتھ کیا عورتوں سے ایسی روش اختیار کی کہ جس سے میری بیوی کے دل میں جلن پیدا ہو اُن کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا ہمیشہ آئے دن کی بات ہو گئی انہیں سینما تھیٹر میں لے جاتا ہوٹل میں چائے پلاتا تاش شطرنج کھیلتا غرضکہ اسی طرح میرا وقت بیتنے لگا میں سمجھتا تھا کہ اب تو یہ دیوی ضرور ہی غصہ کرے گی گلا کرے گی۔ شاید کچھ رونا دھونا بھی ہو لیکن میرا یہ خیال بھی غلط نکلا۔ وہ سب کچھ دیکھتی لیکن اُس کی شانتی میں کسی طرح کا بھی فرق نہ آیا۔ انہیں باتوں سے میرے دل میں یہ شک ہونے لگا۔ کہ یہ مجھ سے محبت ہی نہیں کرتی بلکہ میرے ساتھ نباہ رہی ہے نہیں تو کونسی عورت ایسی ہوگی جو اپنے خاوند سے پریم کرتی ہو اور اُسے غیر عورتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر بُرا نہ مانے اپنے دل پر میں ہاتھ رکھ کر اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ یہی میری استری کسی غیر مرد کے ساتھ وہی باتیں کرے جو میں غیر عورتوں کے ساتھ کرتا ہوں تو غصہ اور رشک سے میں شاید اپنے آپے میں نہ رہوں۔ کیا جانے کیا کر بیٹھوں۔

۔ پھر وہ بھی تو آخر انسان ہے اُس پر ان باتوں کا فطری اثر کیوں نہیں ہوتا۔

ایک بار میں نے اُس سے پوچھا "تمہیں کیا میری کوئی بات بُری نہیں لگتی۔ کیوں تم میری کسی بات پر جھگڑا نہیں کرتیں۔ عورتیں تو ذرا ذرا سی باتوں پر اپنے خاوندوں سے جھگڑا کرتی ہیں۔ محبت کی لڑائی کے بعد جو آنند ملتا ہے۔ اُس کا تو ہمیں اور تمہیں علم ہی نہیں ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "مجھے تمہاری کوئی بات بُری نہیں لگ سکتی۔ ہندو عورت اپنے خاوند کی صورت میں بھگوان کو دیکھتی ہے وہ کیسا ہے کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا۔ اس سے اُس کو کوئی سروکار نہیں اُس کے لئے اتنا ہی بس ہے کہ وہ اُس کا خاوند ہے میں تمہیں اپنے بھگوان کا روپ مانتی ہوں۔ بھگوان کی رضا میں راضی ہونا بڑا دھرم ہے اس لئے تمہاری رضا میں راضی ہونا مجھے کچھ مشکل نہیں۔ میں اپنے آپ کو تمہیں سونپ چکی ہوں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ میں نے اپنی مرضی اور خواہش سب بھگوان کو سونپ دی ہے۔ جب میں اپنا سب کچھ دے چکی ہوں تب مجھے بُرا کیسے لگ سکتا ہے۔ اچھا بُرا تو تب لگتا ہے کہ جب انسان اپنی ہستی کو الگ بنائے رکھے جب تمنائیں اور آرزوئیں اپنی رہیں لیکن اپنا الگ کوئی مفاد ہی نہیں رہا تب کوئی بات بُری کیسے اور کیوں لگے"۔

"تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میرے ساتھ تمہارا بیاہ ہو گیا ہے اس لئے تم نے مجھے اپنا بھگوان مان لیا ہے۔ تمہیں میری ذات سے پریم نہیں۔ اگر میری بجائے کوئی اور ہوتا تو تم اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتیں"۔

اُس نے کہا "ٹھیک ایسا ہی ہے تمہاری جگہ پر کوئی اور خاوند ہوتا تو وہ بھی میرا دیوتا ہوتا۔ بھگوان کی جستجو میں تمناؤں کے سمندر سے پار اُترنے کے سلسلہ میں میرا خاوند میرا ایک ذریعہ ہے۔ مندر میں جا کر میں نے پتھر کی مورتی کو نہیں پُوجا گھر میں بیٹھ کر اپنے خاوند کی پُوجا کی بس اتنا ہی میں جانتی ہوں اور اسی کو اپنا فرض جان کر میں نے اپنی زندگی کو ڈھالا ہے۔ لیکن ایسا مت سمجھو کہ مجھے تم سے پریم نہیں ہے۔ سب سے پریم ہے پریم تو جتنا بھی بڑھے کم ہے"۔ ایسا وہ کہتی ہے لیکن مجھے اُس کے کہے پر یقین نہیں آتا۔ وہ پریم جو سب سے ہو میری نظر میں اُس کی کوئی قیمت نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے پریم میں کوئی شریک نہ ہو۔ اُس کی نجات کا ذریعہ بننے کی مجھے کوئی آشا نہیں ہے۔ میں اُس کا دیوتا بھی بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ میں تو اُس کا ساتھی پریمی دوست بن کر

رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اِس دنیا کی رہنے والی گُن دوشوں سے بھری ہوئی بیوی چاہیئے۔ مجھے دیوی استری کی ضرورت نہیں ہے۔ نجات کے لئے بندگی کرنی ہو تو اُس کے لئے زیست کی کونسی ضرورت ہے۔ جب تُلسی داس جی کو بھگوان سے پریم ہوا تو اُنہوں نے بھگوان کو اپنے روپ میں تو نہیں دیکھا۔ کپلوستو کے شہزادے بھگوان بُدھ کو نجات کی تلاش ہوئی تو بیوی بچوں کو چھوڑ کر گرہست تیاگ کر جنگلوں میں چلے گئے۔ شاستروں میں کہیں بھی کسی رشی مُنی کے متعلق ایسا نہیں لکھا ہے کہ اُس نے اپنی بیوی کو اپنی نجات کا ذریعہ بنایا ہو۔ تب ہندو دھرم نے یہ فرق مرد عورت میں کر کے مردوں کے ساتھ بڑا ظلم کیوں کیا ہے۔ گرہستی اور سنیاس ساتھ ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ پھر نجات کے طالب کے لئے تو چل بھی سکیں جسے نجات کی خواہش نہیں ہے۔ وہ کیا کرے۔ خاوند کے گھر میں رہ کر دنیاداری کے طریقہ کا جیون بنانا چاہیئے۔ اور بیوی نجات کی کھوج میں رہ کر آنے والی دنیا کی تیاری کرتی رہے تو دونوں کی کیسے بن سکتی ہے۔ نجات اور دنیا دونوں ہی ہاتھ سے جاتی ہیں۔ سنسار کا سکھ سب مٹی میں مل جاتا ہے۔ اور نجات کے ذریعہ میں جو نقص پیدا ہوتا ہے وہ الگ۔ اس لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ میری بیوی بیکار ہے مجھ پر ظلم کرتی ہے میرے سُکھ کو اُس نے مٹی میں ملا دیا۔ اُس کو اگر بھگوان سے پریم کرنا تھا اور اپنی نجات کی خواہش تھی تو گھر چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر تپسیا کرنی چاہیئے تھی۔ بن پہاڑ گُٹی گپھا اِسی لئے ہیں۔ یہ گھر میں رہ کر گھر کو سُندر بنانا کس نے بتایا اُس کی سب تعریف کریں تارک الدنیا کہیں۔ میں تو یہ سب کچھ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں مجھے تو اپنے جیسی بیوی چاہیئے تھی۔ میں دیوی کو لے کر کیا کروں دیویں کے لئے دیوتا چاہئیں اور دیوتا میں نہیں ہوں؛

(شریمتی رام شری نہرو)

مہر محمد خاں شہاب

ہاشمی بُک ڈپو لاہور

مختصر فہرست

اقبال اور اس کا پیغام

ڈاکٹر تصدق حسین خالد ایم اے پی ایچ ڈی و میاں محمد رفیق خاور ایم اے

اقبال کی شاعری، اقبال کے پیغام، اقبال کی شخصیت پر بہترین تبصرہ۔ بہترین ادب نادر بہترین تنقید بہترین افکار کا نادر مجموعہ۔ آپ اس کتاب میں وہ وہ نکات پائینگے جو آپ کو اقبال کے متعلق کسی اور کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ مجلد -/8/-

عورت اور دیگر افسانے

رشید جہاں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

"مجھ کو احساس ہے مظلومیٔ نسواں کا مگر" اس "مگر" کا جواب عورت اور دیگر افسانوں میں ملاحظہ فرمائیں -/1

قلوپطرہ

سرزمین مصر کا زبردست تاریخی رومان قلوپطرہ وہ قاتل نازنین ہے جس نے ایک وقت سیزر جیسے فاتح اور انتنی جیسے مدبر کو اپنے حسن کے سنہری تاروں میں اسیر کر لیا تھا۔ اس کی داستان عشق میں کیا ہوگا؟ ناول میں ملاحظہ فرمائیں۔ ۴۴۰ صفحات مجلد -/8/2

آزادیٔ ہند

چوہدری افضل حق۔ ہندوستان کی آبادیاں دوزخ سے بدتر کیوں ہیں؟

ہندوستان کے باشندے مصیبت میں کیوں ہیں؟ ہندوستان کی عورتیں حسن سے خالی اور جوان صحت سے کیوں عاری ہیں؟ ہمارے گھر مسرتوں سے محروم اور بچے بھوک سے بیتاب کیوں ہیں؟ ان کا جواب "آزادیٔ ہند" میں پڑھیں ۲۴۰ صفحات بڑا سائز -/2

فاوسٹ

شاہد احمد دہلوی بی اے۔ نسل انسانی کے دشمن کی تحریص و ترغیب کی لرزہ خیز داستان۔ ایک بیباک نوجوان کس طرح شیطان کی طاغوتی جال میں گرفتار رہا؟ ایک دوشیزہ کس طرح راہ راست سے منحرف ہوئی؟ انسانی پیکر کے پردہ میں اہرمن و یزدان کی ازلی کشمکش -/4/1

ارمغانِ حجاز

علامہ سر محمد اقبال مرحوم کا غیر مطبوعہ فارسی اور اردو کلام بغیر جلد -/8/2 مجلد -/8/3

ریاضِ رضوان

ریاض خیرآبادی۔ ریاض کی شاعری یکسر رندانہ ہے اور اس مخصوص رنگ کیلئے جس قدر شوخی کی ضرورت ہے وہ اس میں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے" "زمانہ کانپور" ۵۰۰ صفحات بڑا سائز -/6

میخانہ الہام

شاد عظیم آبادی۔ ہندوستان کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی کا مکمل مجموعۂ کلام مجلد -/8/4

کمپنی کی حکومت

باری۔ آواز ہے بیکس انسانوں کی جنکا گلا ایسٹ انڈیا کمپنی دباتی رہی! پکار ہے مظلوموں کی جن پر ایسٹ انڈیا کمپنی مظالم توڑتی رہی! فریاد ہے معصوموں کی جن کے والدین کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے گولی کا نشانہ بنایا! مجلد -/8/1

تاریخ فلسفہ سیاست

محمد مجیب بی اے (آکسن)۔ یہ کتاب سیاسی نظریات کے نشو و نما کی تاریخ ہے۔ بڑا سائز ۵۰۰ صفحات -/4

ہندوستان کا نیا دستور حکومت

کشن پرشاد کول سنہ ۱۹۳۰ء سے ہندوستان میں جو نیا دستور حکومت قائم ہوا ہے اسکا خاکہ۔ -/1

داستان

مشہور فرانسیسی ادیب پی یَر لُوئی کی شہرۂ آفاق کتاب "آفرودائتی" کا ترجمہ۔ لوئی نے قدیم سکندریہ کی شہوانی و نفسانی زندگی کا ایسا بالکل اُتارا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں گویا خود ان واقعات میں شریک ہیں۔ مصنف نے زندگی کی مسرتوں سے دوچار کرنیکی مناسب کوشش کی ہے جس نے ایک نئی دنیا کی تخلیق کی ہے جس میں داخل ہو کر ہم کچھ عرصہ کیلئے اپنی بے کیف زندگی کی اکتا دینے والی ساعتوں کو بھول جاتے ہیں ہمیں فطرت نے انسان بنایا کہ فطرت اُسکے مناظر لطیف آہنگی دکھو دیتا ہے۔ -/2

انور

فیاض علی ایم اے۔ ایک انقلاب پیدا کرنے والا مصلح اخلاق، سبق آموز، عبرت خیز ناول جس میں جذبات فطرت کی عکاسی، معاشرت حاضرہ کی مصوری، نفسیات انسانی کی نقاشی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ۴۰۰ صفحات -/8/2 مجلد

آئی سی ایس

عباس علی حسینی ایم اے۔ چودہ انقلاب انگیز افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ مصنف نے دیہاتی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام واقعات اسکی آنکھوں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں -/8/1

انقلابِ روس

پنڈت کرشن پرشاد کول۔ انقلاب روس انتقام تھا ان لوگوں کے خون کا جنکے برہنہ جسموں پر کوڑے لگائے گئے جن کے ساتھ حیا سوز سلوک کیا گیا جنہیں آگ میں کودنے کا حکم دیا گیا جن کی گردنوں پر چاقو چلائے گئے جنہیں بازاروں میں کتوں کی طرح گھسیٹا گیا جن کی لڑکیوں کو جبری عشرت کدوں کی رونق بنایا گیا یہ کتاب اسی انقلاب کی داستان ہے -/8/2

دُنیائے تبسم

شوکت تھانوی۔ مصنف کا انداز رونے والوں کو ہنسانے والا اور گہری طبیعتوں میں زندہ دلی کی لہریں دوڑا دینے والا ہے۔ اس کی ظرافت میں ستھرائی ہے لطافت ہے یہ کتاب آپکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے -/4/1

صنوبر کے سائے

حجاب امتیاز علی۔ اردو کی بہترین رومان نویس کی بہترین تصنیف

ایک نکہت جو آپکے دل و دماغ پر رومان کی رعنائیاں مسلط کر دیگی۔ ایک نغمہ جو آپ کو آہوں کی سحر آلود سرزمین میں گم کر دے گا۔ ۲۰۰ صفحات مجلد -/1/1

ہاشمی بُک ڈپو۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور

ناول

کتاب	قیمت
شمیم - فیاض علی	4/
انور "	2/8/
شہدی - ایم اسلم	3/-
ناظمہ کی آپ بیتی	1/8/
طلسم سامری	1/6/-
برانے بنیتیں	1/8/-
شباب زنانہ	1/-
نجم السحر - عنایت اللہ دہلوی	2/8/
انیس	2/
سائبیو دو جلد	3/
میدان عمل - منشی پریم چند	2/8/
نازحسن دو جلد	2/12/
…ا	2/8/
…ن	2/8/
پردہ مجاز	2/4/
بوئے پریشان - جرجی زیدان	1/-
… - قاضی عبدالغفار	1/8
…وں کی ڈائری	1/4/-
…کی سرگذشت - نیاز فتحپوری	1/-
…کا چاند - عبدالمجید حیرت	2/8/
…ستان - پیری لوٹی	2/-
… - سلطے تصدق	2/8/-
…ہند - چوہدری افضل حق	2/-
دشت - شاہد احمد	1/4/-
…عیش - قاری سرفراز حسین	-/12/-
…عیش	-/10/-
…کی رانی - رسوا	1/4/-
…معاصرہ نامہ - امتیاز علی تاج	2/-
… - اکسیر یا الکوحل	2/8/-
… - تیرتھ رام فیروزپوری	2/-
سرگذشت اسیر - سعادت حسن منٹو	1/-
…زندگی - راشد الخیری	1/8/-
…زندگی " مکمل	2/-
…	1/-

افسانے

کتاب	قیمت
طلسمات - عابد علی	1/-
عورت - رشید جہاں	1/-
صنوبر کے سایہ - حجاب امتیاز علی	1/-
انی بی اہس - عباس علی حسینی	1/8/-
خاموشی - ٹیگور	1/4/-
آخری تحفہ - منشی پریم چند	1/4/-
فردوس خیال	1/-
جلوہ ایثار	1/12/-
الہامی افسانے - سیکش	1/-
مجنوں کے افسانے - مجنوں گورکھپوری	1/12/-
سات تارے - شاہد احمد	1/8/-
دنیا کی حور - کوثر چاندپوری	1/-
عورتوں کے افسانے	1/8/-
گناہ کی راتیں - ایم اسلم	1/-
شرگناہ	1/-
تفسیریات	2/8
کارزار حیات	2/8
طلسم حیات - ماہر القادری	2/-
روسی افسانے - سعادت حسن منٹو	1/-
سیاہ کار اور دیگر افسانے - نسیم رضوانی	1/-
چاند کا گناہ - راجہ مہدی علی خاں	2/-
طلسم خیال - کرشن چندر	1/8
صمدانی - دیوانہ حیدرآبادی	1/8/-
زادراہ - منشی پریم چند	1/-
واردات	1/-
سولہ سنگار - سدرشن	1/8
تین پیسے کی چھوکری - قاضی عبدالغفار	1/8
نگارستان - نیاز فتحپوری	2/-
لمعات رنگین - زبیدہ سلطانہ	2/-
چغتائی کے افسانے - عظیم بیگ چغتائی	1/8
اس نے کہا - قاضی عبدالغفار	1/4/-
بیوہ - پریم چند	1/-
بڑے آدمیوں کا عشق	-/12/-
سعی ناکام - ہمشیرہ اکرام	-/8/-
سراب مغرب - راشد الخیری	-/8/-
خانم - عظیم بیگ چغتائی	4/-
کمزوری	2/-
سرگروہ طلے	1/-
کولتار	2/-
چمکی	1/8
دیکھا بابانگا	1/-
خندہ طنکی ستم ظریفی	2/-
مرزا جنگی	-/6/-
شہزوری	-/8/-
روح ظرافت	1/8/-
روح لطافت	1/4/-
جواہرات - چوہدری افضل حق	1/8/-
نظر کے دھوکے - بدر شکیب	1/8/-
خانم جان - شوکت تھانوی	1/-
جھیلیں	1/-
سوتیا چاہ	1/-
بدقدرت - مضحک دہلوی	-/6/-
پیار چاند - ناصر فراق دہلوی	-/8/-
درس ادب - ظریف دہلوی	1/-
فرانسیسی افسانے	1/-
چینی افسانے	1/-
ہیبت ناک افسانے - امتیاز علی تاج	1/8/-
خودکشی کی انجمن - سالک	1/-
راجہ کا ہیرا	1/-
کونٹ الیاس کی موت - حجاب امتیاز علی	1/4
خلوت کی انجمن	1/-
میری ناتمام محبت	1/8/-
لاش	1/4/-
عمر عیار - حفیظ جالندھری	1/-
گل بکاولی - نہال چند	-/12/-
الحمرا کے افسانے - غلام عباس	2/-
قصر صحرا - عظیم بیگ	-/10/-
حکایات شرلک ہومز	2/-
فسانہ عجائب	2/-
ایورسٹ کی کہانی	1/-

مزاحیہ کتب

کتاب	قیمت
مزاحیہ - ایم اسلم - اول 2/4/ دوم	2/8/-
طنزیات - رشید احمد صدیقی	3/-
مضامین رشید	2/-
مضامین اسلم - ایم اسلم	1/8/-
دنیائے تبسم - شوکت تھانوی	1/4/-
سیلاب تبسم	2/-
موج تبسم	2/-
چچا چھکن - امتیاز علی تاج	1/4/-
مطائبات - چراغ حسن حسرت	1/-
ماہ پرویں - میر ولی اللہ	1/12/-
زندگی - ملا رموزی	2/-
کھرپا بہادر - عظیم بیگ چغتائی	1/-
غنچہ تبسم - تمکین کاظمی	2/-

ڈرامہ

کتاب	قیمت
شہنشاہ حبشہ - اختر اورینوی	-/5/-
ہیملٹ - عنایت اللہ	1/-
انارکلی - امتیاز علی تاج	1/12/-
دو ڈرامے - چیخوف	-/8/-
دی را - آسکر وائلڈ	-/9/-
روحانی شادی - پریم چند	-/5/-
پیا پاس - میٹرلنک	-/12/-
تاتن - ابسنگ	2/4/-
پیکار - گالزوردی	1/-
فریب عمل	2/-
ہوش کے ناخن	-/10/-
نئی روشنی	1/8/-
بیمار - سجاد ظہیر	-/4/-
روح سیاست - محمد عمر نورالہی	-/8/-
سلمیٰ - آسکر وائلڈ	-/8/-
حشرات الارض	1/8/-
ارنسٹ	1/-
اندرسبھا - امانت لکھنوی	-/8/-
ہمزاد - اشتیاق حسین	-/6/-
نیم شب	-/8/-

ہاشمی بک ڈپو - بیرون لوہاری دروازہ لاہور

تاریخ وسوانح عمری

میری جدوجہد ۔ ہٹلر 2/8/-
مصطفےٰ کمال ۔ کے۔ اے حمید 2/8/-
کمپنی کی حکومت ۔ باری 1/8/-
عربوں کا تمدن ۔ نذیر نیازی 2/-
انقلاب روس ۔ کشن پرشاد کول 2/8
ہندوستان میں نیابتی طرز حکومت ۔ " 1/-
محمد شاہ تغلق ۔ مہدی حسن 2/8
محبوب خدا ۔ چوہدری افضل حق 1/8
پیغمبر صحرا خالد لطیف گابا 2/-
سرور کائنات ۔ سر امیر علی مرحوم 1/4
زوال غازی ۔ عزیز ہندی 3/8
سلطان ابن سعود ۔ 2/-
تعمیر نو ۔ عبداللہ انور بیگ 1/4
تاریخ کانگریس پٹا بھائی سیتا رامیہ 2/8
انقلاب فرانس ۔ باری -/12/-
تاریخ مکہ معظمہ 1/-
تاریخ مدینہ منورہ 1/-
عرب وہند کے تعلقات سلیمان ندوی 4/-
ہندوستانی تمدن کی تاریخ عبداللہ یوسف علی 4/-
قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب 3/8
مہاراجہ رنجیت سنگھ ۔ سیتا رام کوہلی 3/8
صحابیات ۔ نیاز فتحپوری 2/8
تیمور ۔ عنایت اللہ 3/-
چنگیز خان ۔ " 2/12/-
مولدین ۔ خلیل الرحمن 2/8
فلسفہ تاریخ ۔ غلام محمد 1/8
عرب کا چاند ۔ پنڈت کرشن شرما 2/-
سیرت النبی شبلی نعمانی جلد اول 4/-
دوم 3/8 سوم 3/- چہارم 4/- ششم 4/4
الفاروق ۔ شبلی 1/8
سفرنامہ روم ۔ " 1/8
الغزالی ۔ " 1/-
المامون ۔ " 1/8
سیرت عمر بن عبدالعزیز ۔ عبدالسلام ندوی 1/8

انقلاب الامم ۔ عبدالسلام ندوی 1/4/-
تاریخ اخلاق یورپ ۔ اول 3/- دوم 2/8
ریاست ۔ افلاطون 4/8
تاریخ تمدن ۔ بکل 3/12/-
چند ہمعصر ۔ مولانا عبدالحق 1/-
تاریخ فلسفہ سیاسیات ۔ محمد مجیب 4/-
دنیا کی موجودہ کساد بازاری حبیب الرحمان -/8/-
حیات حافظ رحمت خان بیتا رام 3/-
سوویٹ روس ۔ جواہر لال 1/-
تمدن عتیق ۔ پروفیسر ابو ظفر 3/-
کارل مارکس ۔ چھبیل داس -/14/-
تاریخ حریت اسلام ۔ فوق 3/-
دولت عزنویہ 2/8/-
تاریخ ہند قدیم -/8/-
تاریخ الدولتین ۔ نیاز فتحپوری 1/8/-
مہابھارت 1/-
تاریخ اسلام ۔ شوق امرتسری 3/-
" " ۵ جلد 5/-
" ۔ غلام قادر فصیح ۵ جلد 6/-
" ۔ اکبر شاہ نجیب آبادی ۳ جلد 11/-
" ۔ خلیل الرحمن 2/3/-
تاریخ مغربی یورپ ۔ محمد یحییٰ تنہا 2/8/-
سلطان صلاح الدین ۔ 2/-
مسولینی ۔ احمد عباس -/6/-
انقلاب ۱۸۵۷ء کی داستان 1/-
دمشق ۔ 2/-
میری کہانی ۔ جواہر لال 4/-
صحیفہ چین ۔ اسعدی 1/8/-
معاہدہ عمرانی ۔ روسو 2/-
جاپان ۔ دیوان چمن لال 2/-
چینی مسلمان ۔ بدر الدین چینی 1/4
فاتح مصر ۔ امام الدین -/9/-
تاریخ یونان قدیم ۔ ہاشمی فریدآبادی 2/8/-
جمہوریت روس منظر علی اظہر 2/8/-
فتوحات اسلام ۔ گبن 1/4/-
میزنی ۔ لاجپت رائے -/10/-

کتب نظم

ارمغان حجاز ۔ سر محمد اقبال مجلد 3/8
بانگ درا ۔ " 3/8
بال جبریل ۔ " 3/-
ضرب کلیم ۔ " 2/-
پس چہ باید کرد ۔ " 1/12/-
میخانۂ الہام ۔ شاد عظیم آبادی 4/8/-
ریاض رضوان ۔ ریاض خیرآبادی 6/-
نغمہ روح ۔ اختر انصاری 1/-
حدیث ادب ۔ احسان بن دانش 1/4
دیوان حالی ۔ حالی -/12/-
جواہر کلیات نظیر ۔ نظیر اکبرآبادی 1/8/-
عالم خیال ۔ شوق قدوائی -/8/-
شاخ نبات ۔ طالب باغپتی 1/4/-
شعلۂ طور ۔ جگر مرادآبادی 2/8/-
شعلہ وشبنم ۔ جوش ملیح آبادی 3/-
جنون حکمت ۔ " 3/-
فکر ونشاط ۔ " 1/-
گلزار داغ ۔ داغ دہلوی 1/4/-
دیوان ذوق ۔ ذوق -/8/-
دیوان درد ۔ میر درد -/8/-
کلیات ظفر ظفر دہلوی 2/12/-
کلیات مومن ۔ مومن 1/4
کلیات آتش ۔ آتش 1/4
جنگنامہ اسلام ۔ منظور حسین 1/-
آہنگ رزم ۔ وقار انبالوی -/8/-
سرود زندگی ۔ اصغر گونڈوی 2/-
جام طہور ۔ اثر صہبائی 1/8
دیوان بیدار ۔ بیدار دہلوی 1/8
صبح وطن ۔ چکبست 2/-
کلیات اکبر اکبر الہ آبادی ۳ جلد 4/8
نغمہ فردوس ۔ ناظر 2/-
کلیات ولی ۔ ولی دکنی 5/-
کار امروز ۔ سیماب 3/-
ترجمہ رباعیات عمر خیام ۔ 1/4

قصائد عزیزیہ ۔ عزیز لکھنوی 3/8
مثنویات میر ۔ 2/-
مصحف بیدم ۔ بیدم وارثی 1/-
مرقع سخن ۔ انتخاب کلام شعرائے دکن ۲ جلد 10/-
مثنوی زہر عشق ۔ مجنوں گورکھپوری 1/8
نغمہ زار ۔ حفیظ جالندھری 1/4
سوز وساز ۔ " 2/-
شاہنامۂ اسلام ۔ " اول 3/- دوم 3/-
بہارستان ۔ ظفر علی 4/-
بادہ مشرق ۔ ساغر نظامی 5/-
باقیات فانی ۔ فانی بدایونی 1/8
دیوان غالب ۔ غالب مولی -/8/-
" " بڑھیا کاغذ سے چھپا ہوا 1/8
" " جرمنی چھپا ہوا 2/8
" " مرقع چغتائی مصور ایڈیشن 5/-
شرح دیوان غالب ۔ آسی 3/-
پیام روح ۔ حامد اللہ افسر 3/-
جذبات بسمل ۔ بسمل بالتصویر 4/6
یادگار نسیم ۔ مثنوی گلزار نسیم 2/-

لغت اردو

کریم اللغات -/9/-
لغات کشوری 3/-
سبادی اللغات 1/4
لغات فیروزی ۔ 3/-
فیروز اللغات ۔ ۲ جلد مکمل 8/-
جدید اللغات اردو 3/-
مفید اللغات 2/-
انگریزی اردو ڈکشنری رائل 2/8
" " " فیلنس 2/-
سٹینڈرڈ " " 17/-
جامع اللغات ۴ جلد 50/-
ہندی اردو ڈکشنری 7/8
فرہنگ اصطلاحات 3/12/-
قاموس الاغلاط 3/-
سعیدی ڈکشنری 4/-

ہاشمی بک ڈپو بیرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

ادب و تنقید

- مکاتیب غالب۔ ناظم علی عرشی 4/-
- فلسفہ عجم۔ سر محمد اقبال 2/8
- پیام اقبال۔ عبدالرحمن طارق 2/-
- مقالات یوم اقبال 3/-
- طنزیات۔ رشید احمد صدیقی 3/-
- اردو میں ڈرامہ نگاری۔ بادشاہ حسین 2/-
- تاریخ ادب اردو۔ سید اعجاز حسین 2/8
- ذکر غالب۔ مالک رام -/8/-
- اکبر الہ آبادی۔ طالب الہ آبادی 5/-
- دکن میں اردو 2/8
- ارباب نثر اردو 2/-
- غالب نامہ۔ محمد اکرام ایم اے 3/-
- اردو کے اسالیب بیان 1/4
- ابتدائی تعلیم کی رام کہانی 1/4
- سودا۔ شیخ چاند ایم اے 3/-
- اقبال اور اس کا پیغام۔ ڈاکٹر تصدق حسین 1/8
- حیات اقبال۔ چراغ حسن حسرت 1/8/-
- اردو شہ پارے۔ محی الدین قادری 6/12
- تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ 9/-
- تاریخ ادبیات ایران جلد اول 4/8
- 〃 دوم 4/8

صنعت و حرفت

- طبیب مرغی خانہ 1/12/-
- تجارتی مرغی خانہ 1/4
- طبیب مویشی 1/4
- پھلوں کی تحقیق 1/12
- رہنمائے تندرستی حیوانات -/12/-
- استاد روزگار 2/-

لڑکیوں کیلئے

- سگھڑ بیٹی 1/-
- آرسی -/12/-
- لڑکیوں کی انشا -/12/-
- چندن ہار 1/2/6
- شریف بیٹی -/6/-
- شریف بیوی -/5/-
- آداب ملاقات -/8/-
- بدمزاج دلہن -/3/6
- سچے موتی -/12/-

عورتوں کے لئے

- خانہ داری 1/8/-
- رفیق عروس -/12/-
- رسوم دہلی -/4/-
- صفیہ بیگم -/10/-
- در شہوار بیگم 2/-
- اختر النساء بیگم 1/8/-
- زہرہ بیگم 1/8/-
- جان بانو -/12/-
- شہیدی بیگم -/6/-
- سوکن کا جلاپا -/6/-
- آخری تحفہ 1/4/-
- باپ کا خط بیٹی کے نام 2/-
- سارہ کی کج روی -/3/-
- عصمتی کروشیا 1/8/-
- عصمتی کشیدہ 1/-
- موتیوں کا کام 2/-
- حاملہ 2/-
- زچہ 2/-
- زنانہ اردو خط و کتابت -/8/-
- دلہنوں کی کانفرنس 1/-
- مراۃ العروس -/12/-
- بنات النعش -/12/-
- توبۃ النصوح 1/-
- دکن کی پری -/6/-
- نعمت خانہ -/11/-

بچوں کیلئے

- رسیلی کہانیاں -/6/-
- نصیحت بھری کہانیاں -/8/-
- بچوں کی باتیں -/3/-
- نیک بچوں کی کہانیاں -/4/-
- مفید ایجادات کی کہانیاں -/12/-
- دیوزادوں کا ملک -/8/-
- ہونہار لڑکا -/5/-
- فردوس خیال 1/-
- بچوں کے کارنامے -/6/-
- مونگے کا جزیرہ -/12/-
- میرے وطن کی کہانی 1/8/-
- شہید یونان -/6/-
- رابنسن کروسو 1/2/-
- دلچسپ مندر -/4/-
- پیتل کا شہر -/5/-
- سرگذشت دہلی -/5/6
- بچوں کی الف لیلہ -/5/-
- آزاد کے کارنامے اول -/8/-
- 〃 دوم -/7/-
- زریں افسانے -/3/3
- سوداگر اور جن -/4/-
- صبر کا اجر -/4/-

دیہات سدھار

- زمیندار کو فائدہ پہنچانے والے کیڑے -/6/-
- زمیندار کو نقصان پہنچانے والے کیڑے -/4/-
- زمیندار اور جراثیم -/2/3
- زمیندار اور لکڑی -/3/9
- مویشیوں کی پرورش -/2/-
- زمین کی قسمیں -/3/-
- زمیندار اور گندم -/5/6
- زمیندار اور کپاس -/3/9
- زمیندار اور منڈیاں -/2/-

فلسفہ

- نفسیات فاسدہ۔ میکڈوگل -/8/-
- فلسفہ جمال۔ ریاض احسن 1/-
- فلسفہ برگسان 1/4
- نطشے -/12/-
- مقالہ روسو۔ عبدالحی -/6/-
- فلسفہ نفس 1/-
- مکالمات برکلے 1/-
- مبادی نفسیات 1/8/-
- کانٹ 1/4/-
- نفسیات خواب 1/-
- روح الاجتماع 1/8/-
- ابن رشد 3/-
- تاریخ فلسفہ اسلام 2/-

تعلیم

- اصول تعلیم۔ غلام السیدین 6/-

معاشیات

- مبادی معاشیات -/12/-
- معاشیات 1/-

متفرق

- شکار 10/-
- زمین کی دولت 5/-
- فلسفہ تعلیم اسلام 2/8/-
- بہار شباب 1/4/-
- سیر کشمیر 1/4/-
- عورت مرد کے تعلقات۔ مہاتما گاندھی 1/10/-
- معین الشعراء 5/-
- قادیانی مذہب۔ الیاس برنی 3/-
- کبیر صاحب۔ منوہر لال 2/-
- ترقی زراعت 4/-

التفاتِ حُسن

اے زہے کیفِ شرابِ التفات جھومتی ہے میرے دل کی کائنات

لے نہ ڈوبے آج طوفانِ کرم کائنات و ماورائے کائنات

اے سراپا نازشِ حُسن و جمال تجھ پہ قرباں عاشقی کی کائنات

تیرے ہنس پڑنے سے ہوتی ہے سحر تیرے چُھپ جانے سے ہو جاتی ہے رات

زمزمے تیرے تکلّم پر نثار ناز کرتی ہے ترے ہونٹوں پہ بات

دُور ہیں تیرے اثر سے مہر و ماہ وجد میں تیری نظر سے کائنات

چپکے چپکے یہ ترا مہر و کرم راز رہ سکتی نہیں لیکن یہ بات

خاکِ دل سے پھر اُٹھیں چنگاریاں پھر بھڑک اٹھی مری شمعِ حیات

اک سراپا ناز کو تھا ہم سے شوق کہہ سکیں گے کس سے دنیا میں یہ بات

پھر اُسی رسمِ ستم کو تازہ کر موت ہے تیری نگاہِ التفات

ہوشیار اے ساغرِ دیوانہ خُو

پھر ہوئی نذرِ جنوں تیری حیات

ساغر نظامی

انور کا انجام

گزشتہ جنگِ عظیم کے زمانے میں ترکی کی آزادی اور عظمت کا خواب دو ترکوں نے دیکھا تھا کمال اتاترک کے خواب کی تعبیر انقلاب ترکی کی کامیابی سے ہم آہنگ ہوئی۔ کمال اتاترک کا آغاز جیسا شاندار تھا۔ اس کا انجام اس سے کہیں زیادہ مکمل اور پُر وقار تھا۔ وہ جس مقصد کے لئے قید حیات میں آیا اسے پورا کرکے اس نے اس دنیا کی زندگی سے رہائی حاصل کی۔ وہ اپنے ملک و قوم کو نئی ڈگر پر چلا کر گیا۔ لیکن آزادی کے معراج کا خواب دیکھنے والا دوسرا انسان انور پاشا تھا۔ انور کا آغاز اتاترک سے بہت زیادہ بلند اور توقعات سے لبریز تھا لیکن اس کی زندگی کے خواب کی تعبیر بالکل مختلف ثابت ہوئی۔ کمال کی موت پر تمام دنیا میں اظہار تاسف کیا گیا لیکن انور کی موت بہت عرصہ تک ایک مشکوک اور پُر اسرار سا واقعہ بنی رہی۔ کچھ عرصہ ہوا۔ ایک جرمن سیاح نے بخارا اور اس کے نواحی علاقوں کی سیاحت کے بعد اپنا سفرنامہ شائع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انور کے انجام کے متعلق اسے جو کچھ معلوم ہوا اس نے درج کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

مشرقی بخارا میں اپنے بعد کے سفروں کے دوران میں۔ میں ان تمام جھوٹے افسانوں کے باوجود جو انور پاشا کی موت کے متعلق مشہور ہو رہے تھے صحیح حالات معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دہ نو میں جہاں انور پاشا سرخ فوجوں کے مقابلہ میں آخری مرتبہ نبرد آزما ہوا اور جہاں اسے قتل کیا گیا تھا۔ مجھے نہ صرف ان لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا جو اس کی موت کے عینی شاہد تھے بلکہ یہ حالات مجھے اس شخص کی زبانی معلوم ہوئے جس نے خود اپنے ہاتھوں سے انور کو قتل کیا تھا اور جو ان حالات کو فخریہ بیان کرتا تھا اور اپنے اس فعل کو حب الوطنی پر محمول کرتا تھا۔

۵ جولائی ۱۹۲۵ء کو دہ نو میں افسر چیکا آغا بے خوف سے میری ملاقات ہوئی۔ اس سے قبل وہ تاشقند جی۔ پی۔ یو کا ممبر تھا جسے پہلے چیکا کہتے تھے۔ دہ نو کے چائے خانے میں مجھے انور پاشا کی موت کے متعلق سچے حالات معلوم ہوئے۔ آغا بے خوف کو ان حالات کا سب سے زیادہ علم تھا کیونکہ وہی اس کا اصلی قاتل تھا۔

انور پاشا ۲ ستمبر ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک معمولی افسر تھا۔ چنانچہ انور کو بھی فوج میں ایک معمولی سے عہدے پر مامور کیا گیا۔ وہ نوجوان ترک پارٹی کا ایک جوشیلا ممبر تھا۔ اور اس لئے حکومتِ وقت کا دشمن۔

جب سالونیکا میں اس نے علم بغاوت بلند کیا تو اس کی عمر محض چھبیس سال کی تھی۔ اس کے بعد اس نے ٹریپولی کی جنگ میں دادِ شجاعت دے کر امتیازات حاصل کئے۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں وہ افواج ترکیہ کے جنرل اسٹاف میں آچکا تھا۔ اور جنگِ عظیم کے شروع میں جب کہ اس کی عمر صرف اکتیس سال کی تھی مختارِ کل وزیرِ حرب کے ممتاز عہدے پر مامور ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۸ء کے آخر میں اسے گرفتار کرکے معزول کر دیا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں وہ روس کی طرف بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کی غیر حاضری میں اس کے متعلق موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔

۱۰ فروری ۱۹۲۰ء کو لینن نے اسے شرفِ باریابی بخشا۔ اور اپنے نمائندے کی حیثیت سے اقوام مشرق کی کانگرس میں شرکت کے لئے باکو روانہ کیا۔ یہاں انور کا نہایت پُر جوش استقبال کیا گیا اور پانچ گھنٹے کی مسلسل تقریر کے بعد اس نے اپنے آپ کو سیر دریا سے لے کر گنگا تک تمام آزادی پسند مسلم فرقوں کا رہنما اور ہیرو پایا۔ انور باکو سے کراسنوو ڈوسک کے راستے ٹیجن کی طرف روانہ ہوا۔ اور کئی ہفتے کی معرکہ آرائیوں کے بعد روسیوں کے خلاف بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن انور جیسا اولوالعزم اور بلند پرواز شخص ان معمولی کامرانیوں سے مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر کچھ

اور ہی تھی۔ چنانچہ اس نے لینن کو اس بات کا قائل کر لیا کہ وسط ایشیا کی تمام قوموں کو متحد کر کے ان کی خانہ جنگیوں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ان کی مدد سے پہلے افغانستان کو زیر کیا جائے اور پھر ہندوستان پر حملہ کر دیا جائے اور برطانیہ کے خلاف بغاوت پیدا کر دی جائے۔

لیکن دونوں کی خواہشیں مختلف تھیں لینن کو متحدہ مشرقیوں کی بیداری میں انقلاب عالم کی تمہید نظر آ رہی تھی لیکن انور کے خواب اس سے بالکل مختلف تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ترکی سمیت تمام ممالک کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لے۔

باکو سے واپسی پر نکولیفسکی بلوشد کے مقام پر زار کے ایک پرجوش حامی نے انور پر حملہ کر کے اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ اور کچھ عرصہ کے لئے بے کار کر دیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں وہ ایک دفعہ پھر ہوشیار ہوا۔ اور بخارا کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ یہاں تک کہ عورتوں نے اس کی عزت افزائی کے طور پر اپنے نقاب پھاڑ ڈالے۔ اس وقت بخارا میں قبل اور مابعد جنگ عظیم کے بے شمار ترکی افسر موجود تھے جو انور کے شیدائی تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کی امداد سے یہاں قومی افواج کا ایک مرکز قائم کر دے اور بخارا کی عظمت وشان کو ایک دفعہ پھر بحال کر دے۔ انور کی یہ تجاویز اس کی ذہنی افتاد کا ناگزیر نتیجہ تھیں۔

اب واقعات حیرت انگیز سرعت کے ساتھ وجود پذیر ہونا شروع ہوئے۔ انور اور اس کے دوست اس بہانے سے کہ وہ سابق امیر کے قلعہ شیر آباد کی طرف شکار کے لئے جا رہے ہیں بخارا سے نکل گئے۔ اور چند روز کے بعد چھ ہزار جری سپاہیوں کے ہمراہ واپس لوٹ کر بخارا کا محاصرہ کر لیا اور سرخ افواج سے بھڑ گئے۔ طرفین کے پانچ پانچ ہزار سپاہی مارے گئے۔ انور نے قیوق مزار درہ انزے کا محلہ اور گرد ونواح کے دیہات جلا دئے۔ اس کے بعد وہ مشرقی بخارا کی دشوار گزار پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گیا۔

اسی دوران میں اس نے سابق امیر بخارا سے افغانستان میں کہلا بھیجا کہ وہ امیر کی افواج کے سپہ سالار کی حیثیت سے روسیوں کے ساتھ جنگ کرنے کو تیار ہے۔ یہ صرف ایک حکمت عملی تھی۔ انور کو معلوم تھا کہ امیر بخارا بھاگتے وقت کروڑوں پونڈ کے زر وجواہر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دوسرے وزراء کے پاس بھی جو اپنے خدم وحشم سمیت امیر کے ہمرکاب ہو لئے تھے امیر سے کچھ کم دولت نہیں ہے۔ انور کو جنگ کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور وہ اس روپے کو بخارا کے سابق حکمرانوں سے حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے ان سے بھی بنٹ لیگا

امیر نے انور کو اپنی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اسے سپاہ کی تعداد یا ان کے مرکز کے متعلق کوئی صحیح علم نہ تھا کیونکہ جنگ آزماؤں کے گروہ تمام ملک کے علاوہ ترکستان میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ آخر تمام ضروری امور کی تحقیق اور افواج کی تنظیم کا کام اپنے نئے جرنیل پر چھوڑ دیا۔

امیر کا پرانا عزیز جرنیل ابراہیم بیگ جو اپنی تین ہزار سپاہ کے ساتھ سمرقند اور قرشی کے درمیان "مصروف کار" تھا انور کے ماتحت کر دیا گیا انور کو اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ وہ صرف ان غیر منظم "ڈاکو" ٹولیوں کے ساتھ یا بخارا کے ان بچے کھچے سپاہیوں کے بل بوتے سرخ افواج پر فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے فوج جمع کرنے کے لئے تمام ملک کے طول وعرض میں قاصد روانہ کئے۔ یہاں تک کہ وہ خوقند، سمرقند، خیوہ اور تاشقند تک جا پہنچے۔ اس نے ترکستان میں نئے سرے سے خلافت کی بنیاد ڈال دی اور جرمن افواج کے نمونے پر اپنی افواج کو ترتیب دیا جس میں وہ خود کچھ عرصہ تک کام کر چکا تھا۔ اس کا نصب العین ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ اس لئے ترکستان کے تمام ملا اس کی امداد پر تیار ہو گئے۔ اس نے روسیوں کو اس شرط پر صلح کی دعوت دی کہ وہ اسے نئی سلطنت کا حاکم اعلیٰ تسلیم کریں اور اس کی امداد کریں۔ ترکستان کی سرخ فوج کے سپہ سالار سمرنوف نے ان شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ انور نے افغانستان میں سے پانچ سو جاں فروش بہادر بھرتی کئے اور ان سے اپنے لئے ایک ایسا جرار باڈی گارڈ مرتب کیا جو ہر وقت جان پر کھیلنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

اس کے قاصدوں نے خوب کام کیا اور جنگجو سپاہی ہزارہا کی تعداد میں آنے شروع ہو گئے۔ شروع میں اس نے سرخ فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں اور چند ہی دنوں میں تمام کا تمام مشرقی بخارا زرافشاں سے لے کر خلیف تک جو افغانستان کی سرحد پر واقع ہے اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ صرف پامیر کے دامن میں سرخ فوج کے چند چھوٹے چھوٹے دستے ابھی تک اڑے بیٹھے تھے اور اس کے عقب میں

تکلیف کا باعث بنے ہوئے تھے۔ آخر کار وہ بھی اس کے ساتھ مل گئے کامیابی کے اس نشے سے وہ کچھ ایسا مخمور ہو گیا کہ اس نے امیر بخارا کی خواہشات اور احکام کو پس پشت ڈال دیا۔ اس نے غیر مآل اندیشی سے کام لیتے ہوئے یک دست ابراہیم بیگ کو افواج کی کمان سے علیحدہ کر دیا اور اس طرح اس بوڑھے سپاہی کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اس نے اپنے لئے ایک مہر بنوائی جس پر "سپہ سالار افواج اسلامیہ و داماد خلیفہ" کے الفاظ کندہ تھے۔ ابراہیم بیگ نے اب شہری آبادی۔ امیر بخارا۔ اور فوج کو انور کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ عین اسی موقع پر روسی افواج کو کمک پہنچ گئی اور انھوں نے پیشقدمی شروع کر دی۔ انور نے امیر کو امداد کے لئے لکھا۔ چنانچہ اس نے متفرق اسلحہ۔ چند مشین گنیں۔ توپ خانہ۔ نقدی اور گولہ بارود بھیجا لیکن بسمک تغائی ظریف نے مخبری کر دی۔ اور یہ تمام سامان روسیوں نے راستے ہی میں ہتھیا لیا۔

پہاڑی سپاہی جو ابراہیم بیگ کے ماتحت تھے۔ انور سے علیحدہ ہو گئے۔ روسی فوج گذر کی طرف سے مسلسل بڑھی چلی آ رہی تھی۔ شمال کی طرف سے ابراہیم بیگ نے شرشان پر حملہ کر دیا۔ اور جنوب کی طرف سے تغائی ظریف نے شیر آباد سے ہلہ بول دیا۔ انور نے موضع کا فرنہاں میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ سرخ فوج کی دو رسالے کی رجمنٹوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ چنانچہ وہ یہاں سے جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا تقریباً سارے کا سارا سامان رسد اور گولہ بارود دشمنوں کے ہاتھ آیا۔ یرچی کی گھاٹیوں میں اس نے پھر اپنا ڈیرا جمایا۔ اور یہیں سے اپنے گرد و نواح کے علاقوں میں اپنی باقی ماندہ دو ہزار سپاہ کی خوراک کے لئے حملے کرنے لگا۔ وہ سرخ فوج کے قافلوں میں لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ اور ارد گرد کے تمام علاقوں کو اس نے نذر آتش کر دیا تھا۔ روسی حاکموں نے سمجھ لیا کہ جب تک انور زندہ اور آزاد ہے۔ امن قائم ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ جی۔ پی۔ یو کے نام انور کو قتل کرنے کے احکام صادر ہوئے . . . . . . اور قتل کا کام آغا بے خوف کے سپرد کیا گیا۔

اب آغا بے خوف کی کہانی اسی کی زبانی سنئے :-

"ہمیں انور کو گرفتار کرنے کا حکم ملا۔ یہ کچھ معمولی کام نہ تھا کیونکہ وہ ہر وقت اپنی جائے قیام بدلتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہمیں جاسوسی کا ایک وسیع جال پھیلانا پڑا۔ میں نے بساطی کا بہروپ بھر کر اس شہر کے غار میں خود داخل ہونے کا تہیہ کر لیا۔ تاشقند اور بخارا سے میں نے ایک گدھا اور کچھ چھوٹا موٹا سامان تجارت خرید لیا۔ ایک جعلی پروانہ راہداری بنوا کر میں قرشی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں جی۔ پی۔ یو کا ایک افسر میرا منتظر تھا۔ وہ سرخ فوج کی طرف سے میرا شریک کار تھا۔ مشرقی بخارا کے راستے میں میں نے پہلی مرتبہ جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھا۔ وہاں کا وہ حصہ جو کسی وقت لہلہاتا ہوا سبزہ زار تھا۔ اب ایک غیر آباد تختۂ ارض تھا جس میں کہیں کہیں آتش زدہ مکانات کے کھنڈر نظر آ رہے تھے۔ اس علاقے کے کچھ باشندے تو روسیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور کچھ افغانستان اور ترکستان کی طرف بھاگ گئے تھے۔

"ہم نے گذر ہی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور ایک چائے خانہ میں اپنا سامان کھول کر قصبے کے نیچے کچھے باشندوں سے لین دین شروع کر دیا۔ ہم نے گذر کے تاجروں سے یرچی اور دہ نو کے تاجروں کے نام تعارفی خطوط حاصل کر لئے۔ چنانچہ یہ خطوط ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ گذر کی سوویٹ حکومت کا ایک ازبک بطور راہبر کے ہمارے ساتھ ہو لیا۔ کیونکہ اس پر شک نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اس کی واقفیت بھی تمام علاقے میں تھی۔ دہ نو میں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ یہ جگہ قلعہ کی طرح محفوظ ہے۔ ابھی ابھی اس جگہ جنگ ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب ہم پہنچے تو توپوں اور مشین گنوں کے فائر ابھی ہو رہے تھے۔ ہمارے گذر والے ساتھی نے گرد و نواح کے دیہات میں گھوم پھر کر چند ہی دنوں میں انور کی جائے قیام کا پتہ لگا لیا۔ بسمک یا اس کی فوج نے ہم تاجروں کے کام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ چنانچہ ہم جلد ہی اس گاؤں میں پہنچ گئے جہاں انور کی موجودگی کا گمان تھا۔ ہم نہایت اطمینان کے ساتھ ایک چائے خانے میں مقیم ہو گئے۔ اپنا سامان تجارت کھولا۔ اور پھر بسمک سے راہ و رسم شروع کر دی۔ تیسرے روز ہمیں یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ انور ایک چھوٹے سے مکان میں جو آبادی سے کسی قدر الگ تھا اپنے باڈی گارڈوں کی مستقل حفاظت میں رہتا ہے۔

"اپنا بقیہ سامان لانے کے بہانے سے میں نے جی۔ پی۔ یو کے آدمی کو روسی افسروں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم نے انور کی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا ہے۔ ازبک اور میں گاؤں میں ٹھہرے رہے۔ پانچ دن کے بعد ہمارا قاصد یہ خبر لایا کہ رسالے کا ایک دستہ انور اور اس کی قیام گاہ کا محاصرہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا ہے۔

"انور کی قیام گاہ سے قریباً دو میل کے فاصلہ پر ہمیں یہ حملہ آور رسالہ مل گیا۔ ہم نے کمان دار کو گاؤں کا نقشہ اور انور کی قیام گاہ کا صحیح مقام اچھی طرح سمجھا دیا۔ اور جو کام ہم نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل انھیں سونپ کر ہم آگے روانہ ہوگئے۔ صبح کے سات بجے گاؤں کا محاصرہ کرنے کے بعد رسالے نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ بسمک نے اپنے سنتری اس ڈھب مقرر کیے تھے کہ ناگہانی حملے کی تجاویز پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ پہلے تو انور کے سپاہی جم کر لڑے لیکن ہماری مشین گنوں کی تاب نہ لاکر انھیں میدان چھوڑنا پڑا۔

"انور نے موقع فوراً بھانپ لیا اور اپنے سپاہیوں کو جم کر مقابلہ کرنے کی ہدایات دے کر خود اپنے سٹاف اور باڈی گارڈ کو ساتھ لے کر پہاڑیوں کی طرف نکل جانا چاہا۔ قریباً پچاس ہمراہیوں کے ساتھ اس نے گاؤں کے دوسری طرف گھوڑے سرپٹ دوڑا دئے۔ وہ گاؤں کی آخری جھونپڑیوں تک پہنچ چکا تھا کہ ہمارے چھپے دستے نے گولہ باری شروع کر دی جو پہلے سے اس جگہ متعین تھا۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا اور خود انور شیر کی طرح لڑا۔ یہاں تک کہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ روسیوں نے اپنی تلواریں نکال لیں اور بھاگنے والوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑائی میں صرف دو آدمی بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔

"روسیوں کی تمام فوج میں سوائے کمان دار کے کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ کس کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ فوج کے افسر ڈرونا ف نے مقتولین کی لاشوں میں سے انور کو پہچان کر لوگوں کو خبر سنائی کیونکہ وہ طیجن میں انور کے ماتحت کام کر چکا تھا۔ کسی کی تلوار نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔ بے سر لاش کے نزدیک ہی قرآن مجید کا ایک ننھا سا نسخہ پڑا تھا۔ لڑائی کے دوران میں قرآن کا یہ نسخہ غالباً انور کے ہاتھ میں تھا۔

"قرآن تاشقند کے جی۔ پی۔ یو کے پاس بھیج دیا گیا جہاں اسے انور پاشا کے نام سے فائیل کر دیا گیا۔"

یہ تھی آغا بے خوف کی کہانی۔

اس کے چند ہی ہفتے بعد مجھے بخارا میں ڈرونا ف سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انور پاشا کی موت کے متعلق آغا بے خوف کی کہانی محض جھوٹ ہے۔ اس نے کہا۔ کہ اس دردناک واقعہ کی حقیقت یوں ہے:۔

"جب ہم نے حملہ کیا تو دو آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان میں سے ایک انور پاشا اور دوسرا اس کا ایجوٹنٹ زکاس بے تھا وہ چشمہ اقسوتک پہنچ گئے۔ جو موضع ہارون دار کے قرب میں ہے۔ اس جگہ پہلے ہی سے تین دشمن موجود تھے۔ ان میں سے ایک آغا بے خوف اور دو اس کے ساتھی تھے۔ مفرورین کی ترکی وردی ان کی اصلیت کی غمازی کر رہی تھی۔ انور کنوئیں کے ڈول پر جھکا ہوا تھا کہ یکایک آغا بے خوف نے خنجر نکال کر ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اور ایک ہی لمحہ بعد اس کا ایجوٹنٹ بھی ایسے ہی ناگہانی حملہ کا شکار ہوا۔"

اور یوں ترکی کا یہ قومی ہیرو اپنے انجام کو پہنچا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے جذبۂ قومی سے متاثر ہو کر بارہا اپنی زندگی کو خطروں میں ڈالا۔ اور ہمیشہ جان ہتھیلی پر لئے پھرا۔ وہ اپنی امنگوں کو پورا کرنے میں عمر عزیز کے صرف چالیس سال صرف کر سکا۔ لیکن ان چند سالوں ہی میں وہ ترقی کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچا۔ اور اس نے زبردست ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔

انور کی موت کے ساتھ ہی وسط ایشیا میں قومی جذبات اور آرزوؤں کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بغیر یہ جہاد قومی جاری نہ رہ سکا۔ کچھ عرصے تک چند رہنما لڑتے رہے لیکن آخر انھیں پسپا ہونے سے پہلے ہی چین اور اس کے نواحی علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ — مظفر احمد

شاعر کی راتیں

جانِ بہار آئے نہ کل تم تمام رات — بحرِ سکوں تھا صرفِ تلاطم تمام رات
بیدار کچھ تمہارے لئے اک ہمیں نہ تھے — سوئے نہ انتظار میں انجم تمام رات

آنکھوں نے کی سرشکِ فشانی تمام رات — سونی رہیں فضائیں سہانی تمام رات
دنیائے یاس وغم بہت آباد تھی مگر — تنہا رہی ہماری جوانی تمام رات

ٹوٹا کئے فلک سے ستارے تمام رات — برسائے آسماں نے شرارے تمام رات
آئے نہ غم کدے میں مگر آپ کے قدم — سوتے رہے نصیب ہمارے تمام رات

ہوتا رہا جنوں کا تماشا تمام رات — جلتا رہا چراغِ تمنّا تمام رات
چھیڑا نہ تم نے آہ مری زیست کا رباب — سونی رہی شباب کی دنیا تمام رات

چلتی ہیں عطر بیز ہوائیں تمام رات — مستی میں جھومتی ہیں فضائیں تمام رات
ایسے میں کاش آپ بھی مینا بدست ہوں — بھر بھر کے جامِ عشق پلائیں تمام رات

علی احمد

2 POPULAR "FLEX" SHOES

IN NEW SHAPES AND FITTINGS.

یہ دو فلیکس کے شوز بالکل نئے (لاسٹ) فرموں پر بنائے جاتے ہیں۔ جبکہ ابھی حال ہی میں ایک یورپ کے بہت بڑے فرما بنانیوالوں سے منگوائے گئے ہیں۔ ان مختلف سائز کے فرموں پر بنے ہوئے شوز ہر ایک پیر میں بالکل فٹ ہوتے ہیں ہر ایک جگہ فلیکس ایجنٹ فلیکس کے ان نئے اپ ٹو ڈیٹ سٹائل بنے ہوئے شوز اپنے اسٹاک میں رکھتے ہیں۔ اور آپکے شہر کا ایجنٹ آپکو بخوشی آرام دہ وضعدار شوز دکھلانے میں فخر سمجھے گا +

Albert Slippers Black.

Black Oxford Shoes

Rs 4/15

لوکل فلیکس ایجنٹ

لاہور۔ دی سجلا شو کمپنی۔ انارکلی اینڈ دی مال ....
لائلپور منٹ :۔ امپیریل بوٹ ہاؤس ....
امرت سر :۔ سجلا بوٹ ہاؤس ....
امرت سر :۔ پرکاش بوٹ ہاؤس ....
امرت سر :۔ امین بوٹ شاپ ....
گوجرانوالہ :۔ انعام بوٹ ہاؤس ....
راولپنڈی :۔ کشمیر بوٹ ہاؤس ....
راولپنڈی :۔ پاپولر بوٹ ہاؤس ....
راولپنڈی :۔ عبدالرحمن عبدالرزاق ....
لدھیانہ :۔ کپور دی ہٹی ....
فیروزپور :۔ خواجہ بوٹ ہاؤس ....
فیروزپور چھاؤنی :۔ دہلی بوٹ ہاؤس ....
جالندھر :۔ وسند ھر بوٹ ہاؤس ....
ایبٹ آباد :۔ بخشی گیان چند اینڈ برادرز ....
کراچی :۔ احمد موسیٰ اینڈ برادرز ....
کراچی :۔ ملک شو کمپنی ....
سیالکوٹ :۔ پریم بوٹ ہاؤس ....
انبالہ شہر :۔ امپیریل بوٹ ہاؤس ....
انبالہ چھاؤنی :۔ ماڈرن ملٹری بوٹ ہاؤس ....
لائلپور :۔ بسنت شو کمپنی ....
ملتان شہر :۔ گورے دی ہٹی ....
ملتان شہر :۔ فضل بوٹ شاپ ....
ملتان شہر :۔ بمبئی بوٹ شاپ ....
ملتان چھاؤنی :۔ پنجاب بوٹ ہاؤس ....
جالندھر :۔ کیلاش بوٹ ہاؤس ....
انبالہ چھاؤنی :۔ ساہنی بوٹ ہاؤس ....

کوبرا واٹرمارک ہمارے جوتوں پر پڑی ہے۔ اور آٹھ سو سے زائد ایجنٹ مقررہ قیمت پر تمام ہندوستان میں فروخت کرتے ہیں

"FLEX" COBRA BRAND SHOES

Made only by. THE NORTH WEST TANNERY CO. CAWNPOR

بیمہ شدہ ہر آٹھ ادائیگیوں میں سے

ایک ادائیگی

بیمہ شدہ رقم سے دگنی کیگئی

نادرن انڈیا انشورنس کمپنی

لمیٹڈ لاہور

کا کارنامہ ہے

دوگنی ادائیگی کی صورت میں موت حادثہ سے ہوئی تھی

ایسی صورت میں

بیمہ شدہ رقم پر

۱۰۰ فیصدی

بونس دیا جائیگا

ایجنٹوں کی نہایت عمدہ شرائط پر ضرورت ہے

ایک حادثہ

کُونی موتھا، لیکن یہ غیر معمولی بات تھی۔ سینٹ میٹارڈ کے گرجا میں آج تک کوئی مردِ گناہوں سے تائب ہو کر کبھی نہ آیا تھا۔ . . . .
محراب سے لٹکی ہوئی قندیل کی سُرخ روشنی میں پادری نے مزدورانہ لباس ٹوٹے ہوئے جوتوں اور اُن کی گھِسی ہوئی ایڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے خیال کیا کہ کوئی دیہاتی ہے جس کا دل اس زمانے میں بھی مذہبی اعتقادات کی روشنی سے منور ہے۔

وہ نہایت متانت سے اقرارِ گناہ سننے کے لئے منبر کی طرف بڑھا پہلے تو ایک چٹکی نسوار کی لی پھر بے حسی سے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کو ہٹایا۔

نوارد نحیف آواز میں بڑبڑایا۔ "پادری صاحب! آپ کے ہاتھوں میں میری نجات ہے۔"

وہ ستون کی اوٹ میں تھا۔ اُس کے چہرے کو تاریکی نے چھپا رکھا تھا۔ وہ دعائیں مانگتا رہا اور دعاؤں کے دہرانے میں وہ رہ رہ کر رک جاتا تھا۔ اُس کی آواز سے ایک اُداسی ٹپکتی تھی۔

"پادری صاحب۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے پچیس سال میں ایک بار بھی "اعتراف" نہیں کیا مدت گذری جب میں نے گاؤں چھوڑا تھا۔ . . . . . آپ نہیں جانتے کہ پیرس میں رہنا کتنا دشوار ہے۔ . . . . میرا دل عام لوگوں سے کوئی زیادہ گناہ کی طرف مائل نہ تھا۔ میں دیہاتی تھا۔ بے وقوف اور انجان . . . . سوچتا تھا۔ خداوند کریم ہے۔ اُس کی شانِ کریمی سے مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔ . . . .
مگر آج میں محسوس کرتا ہوں کہ میری روح کسی بھاری شے کے نیچے پسی جا رہی ہے۔ جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے اعضاء جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔ میری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہونا چاہتی ہیں۔ کوئی اجنبی سی طاقت مجھے ملامت کر رہی ہے۔ بھیانک اور تاریک خیالات مجھے گھیرے رہتے ہیں . . . . میں خونی ہوں . . . . .
ایک قاتل۔ میں نے ایک آدمی کو جان سے مارا ہے . . . .
پادری یہ سُن کر تھرا گیا۔ اُس کی روح لرز کر رہ گئی . . . . خونی . . . . ایک قاتل . . . . . . یہ بات اُس کی بے پروائی اور بے خبری کو دور کرنے کے لئے کافی تھی۔ وہ عام طور پر گھریلو جھگڑوں اور عورتوں کی شرارتوں کو بے نیازی سے سننے کا عادی تھا۔ جنہیں سُن کر وہ نہایت اطمینان سے نجات کا یقین دلایا کرتا تھا۔ مگر ایک قاتل . . . . بنی نوع انسان کا بدترین دشمن . . . . وہ سہم گیا۔ دیہاتی کے سر کی طرف دیکھتا رہا جس میں گناہ کے خیالات پرورش پاتے رہے ہوں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید یہ ہاتھ جنہوں نے کٹہرے کو تھام رکھا ہے۔ ابھی تک [illegible] آلود ہیں وہ اپنے اضطراب کے باعث کچھ خوف زدہ سا تھا۔ اس وقت چند رسمی الفاظ ہی اُس کی زبان تک آسکے۔ "اعتراف کرو۔ میرے بچے . . . . خدا کی رحمتوں کی انتہا نہیں۔"
اُس شخص نے نہایت ہی اندوہ ناک آواز میں کہنا شروع کیا۔
"میں ایک معمار ہوں۔ آج سے پچیس سال قبل میں ایک دوست کے ہمراہ پیرس میں آیا تھا۔ وہ میرا بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم اکٹھے ہی چڑیوں کے گھونسلے اُجاڑنے اور مکتب میں تعلیم پانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ وہ ایک طرح میرا بھائی ہی تھا . اُس کا نام فلپ تھا . . . . اور میں . . . مجھے لوگ جیکب کہتے ہیں۔ وہ ایک خوش شکل اور سجیلا جوان تھا . . . . میں شروع ہی سے بے ڈول اور بھدا رہا ہوں۔ کوئی اچھا کاریگر بھی نہیں۔ یُونہی آوارہ مزاج ہوں . . . . البتہ آج تک ایسا موقع کبھی نہیں آیا کہ میں نے کسی کام کے کرنے میں بزدلی دکھائی ہو۔
"مجھے اُس کی دوستی پر فخر ہے۔ جب میں اُس کے ساتھ چلتا تو جی ہی جی میں اپنی خوش بختی پر ناز کیا کرتا تھا۔ جب وہ مجھے بھیّا کہہ کر میری پیٹھ ٹھونکتا تو میں مسرت سے بے تاب ہو جایا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ میں اُسے پیار کرتا تھا۔ میرے دل میں اُس کی بہت قدر تھی اُس کے لئے بڑی جگہ تھی۔ پیرس پہنچ کر ہم دونوں ایک ہی مالک کے ہاں نوکر ہو گئے۔ مگر شام

کو اکثر اوقات وہ مجھے اکیلا چھوڑ جایا کرتا تھا اور خود دوستوں کے ہمراہ جی بہلانے چلا جاتا تھا۔ یہ اُنہی دنوں کا ذکر ہے جبکہ وہ دوستوں کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ اُس عمر میں یہ تقاضائے فطرت تھا۔ وہ عیش و طرب کا دیوانہ تھا۔ وہ آزاد تھا اور اُس پر کوئی ذمہ داری بھی نہ تھی۔ لیکن میری حالت مختلف تھی میں ایسا کرنے سے معذور تھا۔ مجھے مجبوراً بوڑھی ماں کے لئے بچت کرنی پڑتی تھی۔ جو میں اُسے ہر ماہ بھیج دیا کرتا تھا۔ میں اُن دنوں اپنی مالکہ مکان ہی کے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا۔ وہ عموماً معماروں کا کھانا تیار کیا کرتی تھی۔ فلپ شام کا کھانا وہاں نہ کھاتا تھا۔ اُس نے کوئی اور انتظام کر رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کھانا بھی کوئی خاص کھانا نہ ہوتا تھا وہ عورت بیوہ تھی۔ مجھے اُس کی نوجوان لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن میں تین سال تک اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ اتنا بھی تو نہ کہہ سکا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں صرف ایک معمار ہوں۔ اور اس کام میں بھی کوئی خاص مہارت نہیں۔ یونہی سدھ بدھ سی ہے۔ ماں کو اخراجات بھیجنے کے بعد میری آمدنی خانہ داری کی کفیل نہ تھی۔

آخر کار میری اچھی اماں جنت کو سدھاریں۔ میری فکر بھی کچھ کم ہوئی . . میں نے کچھ جمع کر لیا اور جب محسوس کرنے لگا کہ ازدواجی زندگی کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ تو کیتھرائن پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا۔

پہلے تو اُس نے اقرار یا انکار کوئی جواب نہ دیا . . . یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ وہ فوراً میرے سر پر سوار ہونے والی نہیں۔ اور کچھ میں بھی دلپذیر واقع نہیں ہوا . . . خیر کیتھرائن نے اپنی ماں سے مشورہ کیا۔ ماں نے مجھے ایک باعزت مزدور جانتے ہوئے میرے حق میں رائے دی . . شادی کا فیصلہ ہو گیا۔

میری زندگی بھی چند ہفتوں تک گلپوش و شاداب رہی۔ وہ میری زندگی کے حسین ترین اور سنہری لمحات تھے۔ میں جانتا تھا کہ کیتھرائن نے مجھے اس لئے قبول نہیں کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ چونکہ وہ طبعاً نیک واقع ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے اُمید تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھ سے ضرور محبت کرنے لگے گی . . . . . قدرتی طور پر اس کا تذکرہ مجھے فلپ سے کرنا تھا کیونکہ ہم ہر روز دوکان پر اکٹھے ہوتے تھے۔ اور جب کیتھرائن سے میری منگنی ہوگئی تو میں نے مناسب جانا کہ فلپ کا تعارف کیتھرائن سے کرا دیا جائے۔ میں نے فلپ کو وہاں تک لے جانے کی خواہش خود ہی ظاہر کی۔

آپ نے انجام کو بھانپ لیا ہوگا . . . . پادری صاحب فلپ ایک حسین نوجوان تھا۔ بہت خوش طبع۔ نہایت دلپذیر یعنی وہ سب کچھ تھا جو کچھ کہ میں نہ تھا اور یونہی غیرارادی طور پر اُس نے کیتھرائن کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔

کیتھرائن بے انتہا شریف النفس اور نیک دل تھی . . . جب اُس کے دل میں فلپ کا خیال اچھی طرح جگہ پا چکا تو اُس نے مجھے آگاہ کر دیا۔

بہرحال میں اُس روح افزا ساعت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ کیتھرائن کی سالگرہ کے دن کی بات ہے۔ میں نے ایک طلائی زنجیر اُس کے گلے میں پہنانے کے لئے خرید کی تھی اور بہت احتیاط سے ایک خوبصورت ڈبے میں سنبھال کر رکھی تھی۔

ہم دونوں دکان کے عقب میں اکیلے ہی تھے میں نے ڈبہ نکالا اُسے کھولا اور زنجیر دکھائی۔ تب اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"جیکب مجھے معاف کر دو۔" اُس نے مجھ سے کہا "اور یہ زنجیر اُس کے لئے رہنے دو جس سے تم شادی کرو گے . . . . کیونکہ میں اب تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ مجھے کسی اور سے محبت ہے . . . میں فلپ کو چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے دل میں ایک اُلجھن سی پیدا ہوگئی۔ مگر یہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔ مجھے دونوں یکساں عزیز تھے۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ دونوں کی خوشی اسی میں ہے کہ ایک ہو جائیں۔ فلپ کو گھر کا سامان آرائش خریدنے کے لئے روپے دیئے . پھر دونوں کی شادی ہوگئی۔

آغاز تو بہت حوصلہ افزا تھا . . . . اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا دینی باپ میں بنا۔ اُس کا نام میں نے اپنی ماں کی یاد میں کیمیلی رکھا۔

اُس کی پیدائش کے تھوڑا ہی عرصہ بعد فلپ نے بداخلاقی کا اظہار کرنا شروع کیا۔ میں نے فریب کھایا تھا۔ وہ شادی کے بندھنوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ وہ عیش و طرب کا متوالا تھا . . . ہر روز نئی دنیا بسانا اس کا شیوہ تھا۔ آپ بھی پادری صاحب غریبوں کی بستی کے مکیں ہیں۔ ایسی حکایات سے خوب واقف ہیں جب کہ مزدور کی قوت

عمل اور عقل وہوش پر کاہلی۔ بیکاری اور بادہ نوشی چھا جاتی ہے۔ جو ایک دن کام کر کے تین دن چھٹی کرتا ہے۔ گھر میں کبھی پوری تنخواہ نہیں لاتا اور جو گھر میں محض فساد برپا کرنے یا بیوی کو پیٹنے کے لئے آتا ہے۔

کوئی دو سال کے عرصہ میں فلپ بھی ایک ایسا ہی ذلیل انسان بن چکا تھا۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن رائیگاں ثابت ہوئی اور کبھی احساس ندامت سے اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ طریقہ بھی کوئی زیادہ موثر ثابت نہ ہوا۔ پھر میری نصیحتیں اُس کے اشتعال کا باعث ہونے لگیں۔

ایک دفعہ جب اُس نے اپنے مکان کے بکھرے ہوئے سامان پر مجھے افسردہ نگاہیں ڈالتے ہوئے دیکھا تو اُسے طیش آگیا۔ اُدھر کباڑی کی دوکان پر پہنچے ہوئے سامان کے خیال اور کیتھرائن کی پامالی اور پژمردگی نے اُسے غضب ناک کر دیا۔ آخر اُس کے کمینہ پن کی انتہا نہ رہی۔ وہ مجھ سے حسد کرنے لگا۔ اپنی بیوی کے بارے میں میرے ساتھ آمادہ پیکار ہوا۔ مجھے یاد دلایا کہ مجھے کیتھرائن سے محبت تھی اور اب بھی ہے . . . وہ ذلیل بن چکا تھا۔

اُس دن ہم اُلجھتے اُلجھتے رہ گئے۔ میں نے کیتھرائن سے ملنا بند کر دیا اور کیملی سے لاڈ پیار کرنا بھی چھوڑ دیا۔ فلپ سے کبھی کبھار کسی کام کے موقعہ پر ملاقات ہو جاتی تھی۔

لیکن اب تک آپ جان چکے ہونگے کہ کیتھرائن کی میرے دل میں کتنی قدر و محبت تھی۔ کیملی سے بھی بہت اُلفت تھی۔ میں اُن کو دیکھنے کے لئے مجبور تھا۔ ہمیشہ کے لئے اُنہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ایک شب جبکہ فلپ کے دوستوں کے ہمراہ باہر جانے کا مجھے علم تھا۔ میں اُس کے گھر کے گرد و نواح میں گھومتا رہا۔ میں کیملی سے ملنے کا منتظر تھا۔ خیال تھا کہ اگر گھر میں بہت ہی خستہ حالی ہوئی تو اُسے خالی ہاتھ واپس نہ جانے دونگا۔ وہ تہی دست واپس نہ گیا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ کمینہ جانتا تھا کہ میں اُس کی بیوی کی مدد کر رہا ہوں . . . اپنی سہولت کے باعث وہ خاموش تھا۔

بات لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کہانی بہت ہی اندوہ افزا ہے . . . مختصر یہ کہ کئی سال گذر گئے۔ فلپ گناہ کی گہرائیوں میں ڈوبتا گیا مگر میں کیتھرائن کی امداد کرتا رہا تاکہ اُسے اپنے لڑکے کی پرورش اور تربیت میں آسانی ہو . . . اب وہ چشم بد دور بیس سال کا نوجوان ہے اور اپنی ماں کی طرح نیک اور باہمت ہے۔

وہ ایک مزدور نہیں۔ اُس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ اُس نے نقشہ نویسی سیکھی ہے۔ اب کافی کما لاتا ہے۔

گو گھر پر ابھی تک ایک شرابی کے وجود سے مایوسی چھائی ہوئی تھی تاہم حالات قدرے خوشگوار تھے۔ کیملی ماں کا بہت فرمانبردار تھا۔ کوئی سال بھر کی بات ہے میں کیتھرائن سے ملا تھا۔ تو وہ بیچاری بالکل بدل چکی تھی۔ اپنے لڑکے کے بازو کا سہارا لئے چلی جا رہی تھی۔ لڑکے کو معزز لباس میں دیکھ کر مجھے بہت تسکین ہوئی۔ مگر اگلی شب جب میں گھر سے نکلا تو کیملی مجھے راستہ میں مل پڑا۔ وہ مغرور نہیں اُسے میلے کچیلے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لینے سے عار نہیں۔ میں نے اُسے کچھ مغموم سا پایا۔ میرے پوچھنے پر وہ بولا۔

"کل ہمارے دفتر میں قرعہ اندازی ہوئی تھی۔ میرا نام اُن لوگوں میں نکلا جن کو جہاز رانوں کے ہمراہ جزائر میں بخار کا علاج کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ بہر صورت مجھے وہاں پانچ سال تک رہنا ہوگا اور یوں مجھے ماں کو دُنیا کے رحم پر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اُس غریب کا کوئی سہارا نہیں۔ اباجان کی شراب خوری۔ بے رحمی اور بد اخلاقی کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ ستم زدہ مر جائے گی . . . ہمیں نہ جانے کس کی بد دعا لگی ہے"

اگلی صبح شب بیداری سے میری ہمت پست تھی۔ میں معمر نظر آتا تھا۔ غریب خواہ کتنا ہی غمزدہ کیوں نہ ہو اُس کے لئے لازم ہے کہ وہ کام پر جائے اور روزی کمانے کے لئے خون پسینہ ایک کرے۔

میں بھی سیڑھی کو پکڑتا ہوا مچان تک جا پہنچا۔ یہ پانچویں منزل تھی۔ چار منزلیں ہم تعمیر کر چکے تھے۔ میں نے اپنے اوزار درست کرنے شروع کئے کہ یکایک کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ یہ فلپ تھا۔ وہ اب بھول کر ہی کام پر آیا کرتا تھا۔ آج آیا تھا کہ شراب پینے کے لئے کچھ کما سکے۔ میں نے مدت سے فلپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میں مشکل سے اُسے پہچان سکا۔ کثرت شراب نوشی سے مرجھایا اور جھلسا ہوا۔ اُس کی داڑھی تقریباً سپید اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔

"افسوس کہ لڑکے کے حصے میں سمندر پار جانے والا منحوس نمبر آیا" میں نے کہا۔

"مجھے اس سے کیا"

اُس نے نہایت ہی کرخت آواز میں کہا اور ایک قہر آلود نگاہ مجھ

پہ ڈالی۔ "کیا تم بھی کیتھرائن اور کیمپلی کی طرح مجھے یہی سنانی سنانے کے
لئے باقی ہو۔ بخدا میں جانتا ہوں کہ میری بیوی اور لڑکے کو کیا چیز ستا رہی ہے
وہ میری موت کے خواہاں ہیں۔ مگر میں اُن کو ستانے کے لئے اُن کو
تڑپانے کے لئے زندہ رہونگا۔ اگر آج میرا وجود نہ ہوتا تو اُسے جنازے تک جانے
کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی۔ یہی ہے اُن کے دل کی بات۔ مگر یہ اُن کی
بدقسمتی کا ثبوت ہے کہ میں ابھی جی رہا ہوں اور مضبوط ہوں۔ کیمپلی ایک
بیوہ کا لڑکا کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اُن کی خواہش کبھی پوری نہ
ہوگی۔"

ایک بیوہ کا لڑکا ـــــ آہ! اُس بدقسمت نے یہ الفاظ
کیوں مُنہ سے نکالے۔ ایک مکروہ خیال نے میرے دماغ کے سکون کو
برہم کر دیا۔ ۔ ۔ اور تمام دن میں اُسی ایک خیال میں ڈوبا رہا۔

مجھے کیتھرائن کی بدبختی کا احساس تھا اور اُس پہ نازل ہونے
والے تمام مصائب میرے سامنے تھے۔ اُس کا ایسے ذلیل شرابی کے
ہمراہ اکیلا رہنا کتنا روح فرسا تھا۔

گیارہ بجے ہمارے تمام ساتھی ناشتہ کے لئے نیچے اُتر گئے۔
ہم سب سے پیچھے تھے۔ میں اور فلپ۔ اپنی باری پر سیڑھی کی طرف
بڑھتے ہوئے اُس نے حقارت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ایک
شرابی کی ڈگمگاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھتے ہو میرے قدم کس قدر پختہ ہیں۔ کیمپلی کو ایک بیوہ کا لڑکا
کہلانے کا خیال بھی نہ ہونا چاہیئے۔ ۔ ۔ میں زندہ ہوں۔ اُسے
ضرور جانا ہوگا یہی میں چاہتا ہوں۔"

طیش سے میرا خون کھولنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے
میں نے سیڑھی کے کونوں کو پکڑا۔ وہ نیچے اُتر رہا تھا ۔ ۔ ۔ میں نے
مدد کے لئے پکارتے ہوئے سیڑھی کو ہوا میں دھکیل دیا۔ ۔ ۔ فلپ منہ
کے بل گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ اور سب نے یہ جانا کہ ایک حادثہ ہو گیا ہے
۔ ۔ ۔ مگر کیمپلی اب ایک بیوہ کا لڑکا ہے۔ اُسے اب جنازہ کو جانے کی
ضرورت نہیں۔

یہ ہے میرا کارنامہ۔ میں آپ کو اور خدا کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں
اپنے کئے پر پشیمان ہُوں۔ میں معافی چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ یہ تو ظاہر
ہے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ میں کیتھرائن کو ماتمی لباس پہنے کیمپلی کے
ہمراہ دیکھوں۔ مجھ سے یہ دیکھا نہ جائے گا۔ میں کہیں چلا جاؤں گا۔
جہاں تک کفارہ کا تعلق ہے۔ یہ لو وہ طلائی زنجیر جسے کیتھرائن نے
پہننے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے فلپ سے محبت ہے۔
میں نے اسے سنبھال رکھا تھا۔ کیونکہ اس سے چند یادیں وابستہ ہیں
اسے آپ لے لیجئے اور بیچ کر غریبوں کو بانٹ دیجئے۔"

جیکب کو نجات حاصل ہوئی یا نہیں ہوئی۔ خدا ہی بہتر جانتا
ہے۔ مگر بوڑھے پادری نے طلائی زنجیر فروخت نہیں کی۔ وہ آج تک
حضرت مریم کے مجسمے کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں پادری اُس بدنصیب
کی نجات کے لئے دست دعا بلند کیا کرتا تھا۔

فرانسکوپے

مجید لشاری

جوانی

رباعی

رُوداد ستم ہائے جوانی مت پوچھ
اے دوست فریبِ زندگانی مت پوچھ
اسرارِ شبستانِ محبت تائب
غمازِ شباب کی زبانی مت پوچھ

جوانی نازشِ تخلیق ہے شہ کارِ فطرت ہے
جوانی حسنِ امکاں ہے وقارِ آدمیت ہے
جوانی بربطِ ناہید کے نغموں کی شیرینی
جوانی ایک حشرِ کیف اک طوفانِ رنگینی
جوانی بے نیازی، بے خودی، تمکین، رعنائی
جوانی مستی و شوق و غرور و ناز و زیبائی
جوانی آپ اپنا سوز و ساز و درد و مشتاقی
جوانی اپنی بزمِ آرزو کی خود نگر ساقی
جوانی دیدۂ نرگس جوانی گردنِ مینا
جوانی کا گُل رخسار رنگِ شعلۂ سینا
جوانی کے لبِ خاموش کا اعجاز کیا کہنا
جوانی ہے سراپا لعبتِ طناز کیا کہنا
جوانی ایک انگڑائی کا نشہ ہوشیاروں کو
جوانی کی بہاریں لُوٹ لیتی ہیں بہاروں کو
جوانی شاعرِ خوش فکر کی تازہ نوائی میں
جوانی واعظانِ مے کدہ کی پارسائی میں
جوانی برق، باراں میں، جوانی آگ، پانی میں
جوانی ابر کی مستی میں، صرصر کی روانی میں
جوانی شوق بن کر چشمِ انجم میں مچلتی ہے
جوانی حسنِ مہر و ماہ میں پہلو بدلتی ہے
جوانی چاندنی راتوں میں راوی کے کنارے پر
جوانی سبز کشتی چاند کی کرنوں کے دھارے پر
جوانی شعر و موسیقی، خموشی میں تکلم میں
جوانی مہوشوں کی بے نیازی کے تبسم میں

جوانی محفلِ فطرت کی ہر تزئین نازش میں
جوانی شامِ رنگیں میں، جوانی صبحِ تابش میں

جوانی کوہ کی سنگین و محکم سرفرازی میں
جوانی بحر کی امواجِ سرکش کی درازی میں

جوانی عقل سے عاری، جوانی دل سے بیگانہ
جوانی کی ہر اک وحشی نظیرِ محشر کا افسانہ

جوانی ضبط ہو کر سیپ کی آنکھوں میں ڈھلتی ہے
جوانی جوش بن کر کوہ سے آتش اُگلتی ہے

جوانی کی عزیمت لڑ چکی ہے ہفتخوانوں سے
جوانی کا جنوں جنگ آزما ہے آسمانوں سے

جوانی ڈھونڈتی ہے موت کی لبریزِ خوں راہیں
جوانی دیکھتی ہے زندگی کی تیرہ گوں راہیں؟

جوانی کی محبت داغِ قلبِ ماہِ تاباں میں
جوانی کرمکِ شب تاب کے سوزِ پریشاں میں

جوانی پتھروں کے دل میں کرتی ہے شرر پیدا
جوانی پر نہیں ہوتا کسی شے کا اثر پیدا

جوانی کے ستم کو جورِ چرخِ پیر کہتے ہیں
جوانی ہی کو ہم ایام کی شمشیر کہتے ہیں

جوانی کیوں کسی کے لطف سے آباد ہے یا رب
جوانی ہائے کتنی خانماں برباد ہے یا رب

جوانی بیدِ مجنوں سے لپٹ کر خون روتی ہے
جوانی عاشقوں کے خون کے داغوں کو دھوتی ہے

جوانی دامنِ عشق و ہوس کی بادہ آگینی
جوانی گلستانِ حُسن کے ایامِ گل چینی

جوانی چشمِ حیراں بر سرِ بازارِ رسوائی
جوانی طفلِ ناداں بر سرِ بازارِ رسوائی

جوانی حسن کی معصومیوں سے پیار کرتی ہے
جوانی شرم کی دیوانگی سے عار کرتی ہے

نہ بھول اس پر یہ اندھی کافرہ ہے سخت دیوانی
کبھی اُٹھتی ہوئی آندھی کبھی چڑھتا ہُوا پانی

یہ تیری خاکِ رنگیں آسمانی ہو نہیں سکتی
یہ بزمِ اتفاقی جاودانی ہو نہیں سکتی۔

(ملک) مراتب علی خاں تائب

تورُودَت

ہندوستان کی اوّل انگریزی شاعرہ جس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی

ایک اکیس سالہ لڑکی اور بین الاقوامی شہرت! کیسی بے جوڑ سی بات ہے۔ شاید ہی کسی ملک میں اس کی نظیر مل سکے۔ کم ازکم انیسویں صدی کے ہندوستان میں تو اس کا امکان نظر نہیں آتا۔ قدیم ہندوستان کی عورتوں کی بیدار مغزی اور ان کے علاوہ عدیم المثال کارنامے جو انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں انجام دئے۔ اس "ترقی یافتہ" دور میں ایک بھولی بسری بات ہو کر رہ گئے ہیں۔ کہنے کو بیسویں صدی کو صنف نازک کی بیداری کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو بیداری کچھ اور چیز ہے۔ قومی خصوصیات اور ملکی روایات کو خیر باد کہہ کر ایک خطرناک راستہ اختیار کرنا جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں، کسی معنی میں بیداری نہیں ہے۔ لیکن ——— خیر، اس وقت یہ موضوع زیر بحث نہیں ہے۔ اس وقت ہم اُس انگریزی شاعرہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان کی خاکِ پاک سے اُٹھی جس نے اکیس سال کی مختصر زندگی میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی، اور اپنی یادگار کے طور پر نظم و نثر کا ایک دلآویز ذخیرہ چھوڑ گئی ہے اس نامور خاتون کا نام **تورودت** تھا۔

تورو تین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ وہ ۱۸۵۶ء میں یعنی غدر سے ایک سال قبل، ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاریک دورِ حکومت میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے والد، گووِند چندر دت ایک بنگالی مسیحی تھے۔ ان کا لڑکا جس کا گھریلو نام ابجی تھا، زمانۂ نوعمری میں داغِ مفارقت دے گیا۔ تو ان کی تمام تر توجہ دونوں بیٹیوں پر مرکوز ہو گئی۔ انہوں نے دونوں کو بہتر سے بہتر تعلیم دلانے کا ارادہ کیا اور اسی غرض سے ۱۸۶۹ء میں وہ یورپ تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ فرانس میں قیام کیا، بعد ازاں انگلستان چلے گئے۔ ۱۸۷۳ء تک انگلستان میں مقیم رہے۔ فرانس کے مختصر قیام نے تورو کے دل و دماغ پر خاص اثر کیا۔ چنانچہ کلکتہ آ جانے کے بعد بھی اُس نے فرانسیسی زبان کا مطالعہ جاری رکھا۔ ساتھ ساتھ سنسکرت زبان بھی سیکھنا شروع کی، اور بڑی توجہ و یکسوئی سے اپنے لٹریری کام میں مصروف ہو گئی۔ تورو کی بڑی بہن کا نام آرو تھا۔ اُس نے مصوری میں مہارت پیدا کی تھی۔ دونوں بہنوں کی بڑی خواہش تھی کہ ایک ایسا ناول شائع کیا جائے جس کو تورو تصنیف کرے، اور آرو مصوّر بنائے۔ لیکن افسوس، یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۷۴ء میں آرو بعارضہ دق دنیا سے سدھار گئی۔

بہن کی دائمی مفارقت سے تورو کا دل بیٹھ گیا۔ غم سے نڈھال ہو گئی اُس کے غم و اندوہ کا اندازہ اُن اشعار سے ہو سکتا ہے جو اُس نے آرو کی وفات پر کہے تھے:۔

ہمارا خیال تھا کہ جیسے اپریل کی گدگدانے والی شعاعیں
گلاب کی خوش رنگ پنکھڑیوں کو کھلا دیتی ہیں،
مسرت کے چند مہینوں یا دنوں کے بعد
ہماری محبت کے پھول بھی مہک اٹھیں گے۔
مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا،
وہ چپ چاپ سو گئی۔
وہ ایک آسمانی مخلوق تھی، اور بہت زیادہ محبوب تھی
زمین پر اس کو کیسے چھوڑ دیا جاتا،
مقامِ انجم و خورشید و مہ تھا بس مقام اُس کا، زمیں کے واسطے کب تھا جمالِ لالہ فام اُس کا

آرو اگرچہ شاعرہ کی حیثیت سے مشہور نہ تھی لیکن کبھی کبھی شعر کہتی تھی۔ مثلاً اس نے ایک سانیٹ لکھا تھا جس نے اس کے نام کو بھی کافی شہرت دے دی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

بہشت دروازے اب تک بند ہیں،
گو شفق میں روشنی جھلک رہی ہے۔
ان کی تازہ اور آزاد ہوائیں چل رہی ہیں
دوست ـــــ جس نے گلاب کو بھی پیدا کر دیا، کیا تجھ کو اب تک پیدا
نہیں کرسکتی؟
محبت، روشنی، اور نغمہ ـــــ ان کو تیرا انتظار ہے،
لال لال روشنی اوپر آسمان میں،
نغمہ توسے کی زمزمہ آرائیوں میں، اور
سچی محبت میرے دل میں سب۔
الگ رہ کر ہم اپنی فطرت کے منشا کو پورا نہ کرسکیں گے،
اپنی تقدیر کو جھٹلا دینے کی کوشش کرنے سے کیا فائدہ؟
کیا میری محبت تیرے اور صرف تیرے لئے نہیں ہے؟
کیا تیرا حسن اسی لئے نہیں کہ میری آنکھیں اس کے نظارہ سے
لطف اندوز ہوں؟
میری سن، اب اور سونا ٹھیک نہیں،
دیکھ، میں تیرے انتظار میں آنسو بہا رہی ہوں،
آہ! تو کہاں ہے؟

تورو دت کا اول مجموعۂ کلام ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا، جس کو انگلستان کے مقابلے میں فرانس میں زیادہ شہرت ہوئی۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ اس نے اس مجموعہ کا نام "مزرعۂ فرانس کی خوشہ چینی" رکھا تھا۔ یہ مجموعہ تورو کی ابتدائی نظموں پر مشتمل تھا۔ مشہور تنقید نگار، اڈمنڈ گاس نے اس پر تنقید کرتے وقت لکھا تھا۔

"یہ مجموعہ آمد و آورد کا عجیب و غریب مرکب ہے۔ کہیں تو کلام میں خوب روانی اور بے ساختگی ہے اور کہیں نادانی اور ناتجربہ کاری نے ٹھوکریں کھلائی ہیں، کہیں نظم مرجانہ سے مرصع ہے تو کہیں سرے سے وزن ہی نظرانداز ہے۔۔۔"

اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد تورو کی صحت جواب دے گئی۔ اس کے والد نے مشورہ دیا کہ دماغی محنت زیادہ نہ کرے۔ سنسکرت کی تحصیل کو بھی کچھ دنوں ملتوی کر دینے کی صلاح دی۔ لیکن ہر قسم کی احتیاط کے باوجود اس کی صحت روز بروز ابتر ہوتی گئی اور بالآخر ۱۸۷۷ء میں اس کی غمناک زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اگلے سال یعنی ۱۸۷۹ء میں ہمارے ملک کی ممتاز خاتون اور انگریزی زبان کی دوسری شاعرہ مسز سروجنی نیڈو پیدا ہوئی۔

تورو کے جذبات و احساسات کا صحیح اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو اس نے وقتاً فوقتاً ایک فرانسیسی خاتون کو لکھے ہیں۔ اس خاتون کا نام مس کلیرس بیڈر تھا۔ دونوں ایک دوسری سے ناواقف اور ناآشنا تھیں۔ لیکن خط و کتابت کے ذریعہ سے دونوں میں نہایت استوار رشتۂ محبت قائم ہوگیا۔ مسٹر ہیری ہرداس نے "لائف اینڈ لیٹرز آف تورو دت" کے نام سے اس کے خطوط شائع کئے ہیں۔ اسی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ تورو نے مس بیڈر کی ایک فرنچ کتاب دیکھی تھی جس کا نام تھا "قدیم ہندوستان کی عورتیں"۔ تورو کو یہ کتاب بہت پسند آئی۔ اس نے اس کو ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ترجمہ کرنے کے لئے مصنفہ کی اجازت ضروری تھی۔ تورو نے ایک خط مس بیڈر کے نام لکھا۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

تورو کی وفات کے بعد مس بیڈر نے لکھا تھا:۔

"تورو کو میں نے کبھی نہیں دیکھا، لیکن مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ اس کے خطوط کی بے تکلفی، نازک خیالی، دلآویز تلطف، اور سادگی نے اس کو بالکل میرے قریب کر دیا تھا۔ میں دور دراز سمندر کے پار رہتی ہوں۔ اپنی عمر کے بائیسویں برس میں تھی کہ قدیم ہندوستان کی عورتوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، اور اب ان کی ایک جانشین نے مجھے اپنی طرف مائل کیا۔ ناممکن تھا کہ میں ان دل سوز جذبات سے متاثر نہ ہوتی"

تورو نے اپنے کمرے کی آرائش میں انگریزی اور ہندوستانی دونوں مذاق ملحوظ رکھے تھے۔ ایک خط میں اس نے اپنی گھریلو زندگی کا خاکہ کھینچا تھا چنانچہ لکھتی ہے:۔

"ہم لوگ بہت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں صبح کے ساڑھے چار بجے اٹھتی ہوں سب سے پہلے دو پیالے کوکو تیار کرتی ہوں، ایک اپنے لئے اور ایک والد صاحب کے لئے۔ بعد ازاں اپنے کمرے میں جا کر کپڑے پہنتی ہوں میرے باہر آتے آتے والد اور والدہ بھی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ میں اپنے مکان کی چھت پر چلی جاتی ہوں

صبح کے وقت چھت پر ہوا بہت خوشگوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد
بلیوں کو مچھلی کے کباب کا ناشتہ کراتی ہوں۔ اس کے بعد سب
مل کر ناشتہ کرتے ہیں اور ناشتہ سے فارغ ہو کر صبح کی عبادت
ان کاموں سے فارغ ہو کر والدہ تو گھر گرہستی کے کاموں میں لگ جاتی ہیں
اور میں بالعموم کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی ہوں یا پندرہ بیس منٹ
تک بلیوں کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ والد اپنے پڑھنے لکھنے میں مصروف
ہو جاتے ہیں یا "انڈین ڈیلی نیوز" کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بارہ بجے ہم لوگ
کھانا کھاتے ہیں، اور اس کے بعد تین بجے تک لکھتے پڑھتے ہیں۔ تین
بجے میں ایک آدھ شریفہ یا سنترہ کھاتی ہوں۔ پانچ بجے کپڑے پہن کر
باہر جاتے ہیں۔ میں بالعموم گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا خوری کو تنہا
جاتی ہوں، اور والد اور والدہ چچا جان کے باغیچہ کی سیر کرتے ہیں۔ شام
کا کھانا سات بجے کھاتے ہیں اور ساڑھے آٹھ بجے ایک ایک پیالہ
چائے پیتے ہیں، اور دس بجے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔ مجھے ہر
شخص بہن تورو کہہ کر مخاطب کرتا ہے . . ."

ہم نے بتایا ہے کہ تورو دت کی صحت ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ ایک
خط میں وہ لکھتی ہے۔

میں غیر معمولی کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ موسم گرما کا اثر
ہو۔ کرسی پر بیٹھنے کے مقابلے میں مجھے صوفے پر زیادہ آرام ملتا ہے۔
مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنا پریشان کیا۔ سچ مچ مجھے اتنا
کچھ نہ لکھنا چاہیئے تھا۔ میں ہنوز بستر علالت پر ہوں۔ بخار اور
کمزوری دونوں بدستور جاری ہیں۔ کبھی کبھی میں بے حد تکان،
بے دلی اور تنہائی محسوس کرتی ہوں"۔

تورو کے انتقال سے اُس کے بوڑھے والدین کا کیا حال ہوا ہوگا،
اس کے والد کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تورو بہت پیاری بچی تھی اور ہماری آخری بچی تھی۔ ہمارے تینوں بچے
بڑے ہونہار تھے، اور تینوں اپنے عنفوانِ شباب میں ہم سے چھین
لئے گئے۔ میں اور میری بیوی بڑھاپے کے دنوں میں ایک بہت
بڑے اور سنسان گھر میں اکیلے رہ گئے۔ یہی وہ گھر تھا جس میں کسی
وقت تینوں بچے چہکتے رہتے تھے . ."

تورو دت کی سب سے اچھی کتاب "قدیم ہندوستان کے نغمے"
ہے۔ جس میں اُس نے ہندوستان کی قدیم کہانیوں کو نظم کا جامہ پہنایا ہے
مثلاً ساوتری، دھرو وغیرہ۔ اِن موضوعات کو اُس نے بڑے پیارے اور
مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ پڑھ کر بے اختیار اس جواں عمر شاعرہ کے
خداداد کمال کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایک تو ان موضوعات کو قدامت اور
عقیدت نے پہلے ہی دلکش بنا رکھا ہے، اُس پر تورو دت کے حسنِ بیان
اور تشبیہات کی ندرت و لطافت نے اور جادو پھونک دیا ہے۔ مثلاً
ملاحظہ فرمائیے ساوتری کا کیسا دلکش خاکہ کھینچا ہے۔

وہ اُس کنول کی طرح تر و تازہ ہے، جس کے حُسن کو
جون کی تپش کے بعد ہلکی ہلکی پھوار نے نکھار دیا ہے،
جس کی کھلی ہوئی پنکھڑیوں کو چاند بوسہ دیتا ہے۔
اس میں دلکشی کی خاص بات کیا تھی؟
کیا صاف و شفاف سیاہ آنکھیں، یا بھونرے کے ایسے کالے کالے بال؛
صراحی دار گردن، یا گول گول گداز باہیں؟
نہیں نہیں، یہ معمولی چیزیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں؛
اس میں یہ تخصیص تھی کہ اس کے چہرے پر
پاکیزگی اور بچوں کی ایسی معصومیت برستی تھی؛
کوئی شخص جس کا دل ناپاکی اور کمینہ پن کا مسکن ہے،
اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس نظم کے آخری ٹکڑے کو اردو نظم میں ادا کرنے کی کوشش
کی گئی ہے ؎

وہ اس دنیا میں بھی اک عالم بالا کی ہستی تھی — کہ اُس کے چہرۂ معصوم پر طفلی برستی تھی
نظر کی تاب کیا، دشوار تھا احساس نظارہ!

اس مجموعہ کی تمام نظموں میں پختگی کلام کی جھلک نمایاں ہے۔

تورو دت کی نظموں کا ایک اور مجموعہ "متفرق نظمیں" کے نام سے شائع
ہوا ہے۔ زبان و محاورات کی غلطیاں اس میں شاذ ہیں۔ تورو کے والد اس
کے بہترین دوست تھے۔ جیسا اُن چند الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو
اُن کے بارے میں کسی وقت اس نے تحریر کئے تھے۔

". . . الفاظ بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جبکہ ہر خیال جو ہمارے
دل میں اُٹھتا ہے۔ ایک دوسرے پر ظاہر و آشکار رہے۔ اور ہمارے
قلب کی حرکت موسیقیت کو قائم و برقرار رکھتی ہے . . ."

تورو کی شاعری اس کے ایک خاص اور مخصوص فلسفہ کی حامل ہے اس نے انسان کی وہ بے ہودہ خواہش دیکھی تھی جو اسے کامل مسرت کے حصول کیلئے ہوتی ہے اس کا "فلسفہ حیات" ملاحظہ فرمائیے۔

میں جانتی ہوں کہ اس سریع الزوال دنیا میں مغالطے سی مغالطے

۔۔۔ حقیقت بالکل نہیں!

میں جانتی ہوں کہ اس کی کائنتیں کہر کے بادل میں جو کچھ دیر تک

پھیلا کر دفعتہ پھٹ جاتے ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ ایک ایسی دنیا میں

اپنی مراد کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

نہ اپنی زندگی کو اطمینان و مسرت سے گزار سکتا ہے!

ہمیں بھی سونے کی طرح آگ میں سے ضرور گزرنا پڑے گا!

اگر تورو کی زندگی وفا کرتی تو کچھ شک نہیں کہ اس کا شمار ملک کی ممتاز ہستیوں میں ہوتا۔ اس کے اول مجموعہ نظم پر سٹر ایڈمنڈ گوس نے سخت اعتراضات کئے تھے۔ لیکن "قدیم ہندوستان کے نغمے" کے مقدمہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اگر تورودت زندہ رہتی تو وہ مشہور و مقبول یورپین مصنفین میں سب سے کم نہ ہوتی۔ افسوس ہے کہ اس کو جو شہرت حاصل ہوئی وفات کے بعد حاصل ہوئی۔۔۔"

تورودت کی کئی نظموں کا اردو ترجمہ نظر سے گزرا ہے۔ منجملہ ان کے ایک نظم "انڈیا ز چلڈرن" ہے جس کا کامیاب ترجمہ جناب عبدالمجید خاں صاحب سالک نے دس بارہ برس قبل "فرزندان ہند" کے عنوان سے کیا تھا۔ سالک صاحب نے تورودت کے خیالات و جذبات کو اس عمدگی سے اردو نظم میں سمویا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

کیا شفق کے ہلکے ہلکے رنگ دیتے ہیں بہار
جب گلابی بادلوں میں ڈوبتا ہے آفتاب
صبح کی شبنم سے دھل کر خوشنما لگتا ہے گل
رکھتے ہیں توسِ قزح کے رنگ کیسی آب و تاب

سایہ ہے برگِ خزاں دیدہ یہ کیسا خوشگوار
کتنی ہے خاموش حسینوں کی جوانی دلفریب

کشتِ پختہ کا سنہری رنگ فردوسِ نظر
سبز شاخوں پہ ثمر ہیں ارغوانی دلفریب

لیکن اک شے ہے شفق کی دلفریبی بھی ہے ماند جس سے
اور خجل ہے صبح کی پہلی شعاع نور بیز
ہند کے بچوں کی آنکھوں میں محبت کا وہ نور
جس سے امید و تخیل کی جھلک ہے جلوہ ریز

وہ چمک جو ان عمیق آنکھوں میں آتی ہے نظر
ہے کمال شوق و رازِ آرزو کی داستاں
ایک طاقت ہے جو میری روح کو کرتی ہے جذب
اک کرن ہے جس کا منبع ہے دیارِ لامکاں

میں نے دیکھا ہے ہر اک کے چہرۂ پاکیزہ کو
شوکتِ الہام جن کے خال و خط سے ہے عیاں
نوجوانانِ وطن اسلاف کی ہیں یادگار
قوم کی عظمت کا ہے احساس ہر دل میں نہاں

زندہ ہے اب تک وہ حیرت خیز پیغام عمل
دیوتاؤں سے جو پاتے تھے خردمندانِ ہند
تھی وطن کی شان جس سے بام رفعت کے اوج پر
اس کو پھر دہرا رہے ہیں آج فرزندانِ ہند

یہ زمانِ حال ہو جائے گا ماضی ایک دن
اک عظیم الشان مستقبل ہے پیشِ روبرو
طفل ناداں کو چڑھے گا جب جوانی کا نشہ
اور جوانی ہوگی سرمستِ شرابِ آرزو

پھر دو برسوں کی تمنائیں بھی ہونگی کامیاب
کر سکی مردہ نہ جن کو گردشِ دورِ زماں
رشک شانِ دوش ہوگی شوکتِ فردائے قوم
جاگ اٹھے گی عظمتِ دیرینۂ ہندوستان

. . . .

تورودت کی مختصر زندگی مسرت کی زندگی تھی۔ دکھ درد میں بھی وہ ہمیشہ شاد و بشاش رہتی تھی۔ شاعرہ کی حیثیت سے اس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ مادرِ ہند کی ایک نامور بیٹی تھی، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ ہندوستان کی پہلی شاعرہ تھی جس نے ایک غیر ملک کی زبان میں اپنے خیالات و جذبات کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا، اور انگلستان کے بہترین شعرا کی صف میں جگہ پائی۔ آہ! وہ ایک پھول کی طرح کھلی اور مرجھا گئی۔ لیکن ہمیشہ قائم رہنے والی خوشبو اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ اس کی ایک نظم کا بند کس عمدگی سے اسی پر چسپاں ہوتا ہے:۔

ایک دن گلاب بھی مرجھا جائے گا، اور سرفرازی کا ہرا بھرا تاج بھی:

زمین کی تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں:

پھر میں کیوں جان کھپاؤں! کیا میں بچ رہوں گی؟

پیارے لال شاکر میرٹھی،

توہمات

خواب ہے؟ خواب ہی سہی، لیکن
جاگنا ہے بہت گراں مجھ کو،
دن وُہ اچھے، جو بھول میں گزریں
زندگی ہو فریبِ جاں مجھ کو
اور حقیقت کی کیا خبر ہو کہ ہے
دردِ سر ظاہر و نہاں مجھ کو
اس جنوں میں بھی ہے خبر اتنی
اس فسوں پہ بھی ہے گماں مجھ کو
تیری الفت کی آگ دے دے کر
زندگی نے کیا جواں مجھ کو
میں اور اُلجھا کروں توہم میں
اتنی فرصت بھلا کہاں مجھ کو
بس یہی شرحِ زندگانی ہے
میں ہوں اور میری نوجوانی ہے

[illegible]

غزل

مرے پہلو میں وہ حُورِ جناں ہے
زمیں میری ہے میرا آسماں ہے
وہ ہے آرامِ دل، تسکینِ جاں ہے
جہاں وہ ہے وہی میرا جہاں ہے
جسے غیروں سے سُن کر رو رہا ہوں
وہ میرے دردِ دل کی داستاں ہے
مری رگ رگ ہے بے تابی کا مرکز
"خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے"
لگی ہے آگ سی کون و مکاں میں
کوئی دل سوختہ گرمِ فغاں ہے
حبابِ مضطرب رومیں بھنور کی
سراسر زندگی کی داستاں ہے
کھلونا ہوں اجل کا اور دل میں
تمنائے حیاتِ جاوداں ہے
یہ میری نغمہ پردازی چمن میں
نوائے بلبلِ بے آشیاں ہے
ہوسناکوں کو کیا معلوم شاہد
کہ حُسن و عشق کی دنیا کہاں ہے

مسعود شاہد

چلی گئیں

آئیں جمالِ ناز دکھایا چلی گئیں — بگڑا ہوا نصیب بنایا چلی گئیں

تھیں کاغذی لبوں پہ حسیں مسکراہٹیں — رنگین بجلیوں کو گرایا چلی گئیں

میں اور قربِ حُسن مجھے تھا گمانِ خواب — آنکھوں کو میری ہاتھ لگایا چلی گئیں

نکھرے ہوئے شباب پہ رقصاں لطافتیں — رنگِ بہارِ زینت جمایا چلی گئیں

منظور تھی اگرچہ عیادت مری اُنہیں — خونِ دلِ مریض بہایا چلی گئیں

لائی تھیں اپنے ساتھ دوائے سکوں مگر — بے تابیوں کا حشر اُٹھایا چلی گئیں

اُٹھیں تو دل کے تار لرزنے لگے تمام — سازِ وداعِ ضبط سنایا چلی گئیں

جاتے ہوئے نگاہ ملائی جُھکی ہوئی — مجبوریوں کو اپنی جتایا چلی گئیں

خاموشیوں سے جب دمِ رخصت بنی نہ بات — آنچل کو انگلیوں میں پھرایا چلی گئیں

اظہارِ عرضِ شوق کی دنیا پلٹ گئی
جونہی نظرؔ کو ہوش سا آیا چلی گئیں

قیوّم نظرؔ

ENTRANCE FEE. FOUR SQUARES, Re. 1; EIGHT SQUARES, Rs. 2 & SO ON

YOU MAY USE THE COUPON BELOW. SOLUTION OF THIS PUZZLE WILL BE PUBLISHED IN "THE ORIENT ILLUSTRATED WEEKLY," dated Jan 1, '39. Fill in the Puzzle in ink and your name and address in block CAPITALS. Cut out the coupon, place it with a P. O. value Re. 1, in an envelope and post to

"ORIENT CROSSWORD" NO. 36, "THE ORIENT ILLUSTRATED WEEKLY,"

93 A, Dhurrumtola Street, CALCUTTA,

so as to reach the Orient Illustrated Weekly offices not later than Thursday, December 22nd. Competitors in places 48 hours or more distant by Mail from Calcutta must post their entries so as to reach these offices by last post Saturday, Dec. 24th. For extra Entry Coupons, full particulars, and Rules see Orient dated Dec. 4, 11 and 18. Competitors using Coupon below are bound by these. Plain paper entries will be disqualified. The minimum number of squares that can be entered in this contest is FOUR for Re. 1. List of Winners in the "Orient" dated Jan 15th, '39. Not more than 4 squares are allowed for use from this Advt.

OVER RS. 1,05,500 WON TO-DATE BY CLEVER SOLVERS OF "ORIENT CROSSWORDS"

CLUES ACROSS:—1 A man cannot concentrate on his work so well with this on his mind 4 Considerate people usually give a " " a fair chance to reform 6 Every hospital maintained by public charity is expected to have one 8 We are apt to feel sorry if this doesn't work out the way we expect 10 Measured 13 First half of WORK 15 Some people often find it difficult to break this 18 The highest conception of anything 20 A beverage made from an infusion of malt by fermentation 22 How young you look generally depends on how you this 23 You may experience much difficulty in your efforts to win this 25 Took food 29 Mixed SOB 32 Jumbled spelling of MAP 33 Brought to an end 34 These play a none too conspicuous a part in human affairs 35 One who foresees events

CLUES DOWN:—2 Experienced hikers usually like to steer clear from this 3 Some men can hardly be expected to work without this 4 Captain of large sea going vessel has to be rather careful of this 5 Afresh 7 Your body will probably be kept warm by a good one 9 Only a strong man can be expected to take this 11 This has a demoralising effect on very many people 12 We are compelled to act when we are in one 14 The rendering of this is not appreciated by most people 15 Some men carry these well on their shoulders 16 Fellow 17 Hydraulic engineers are usually well acquainted with this 19 To chew and swallow 21 This sometimes provides a veritable feast to the eyes 24 When corn is referred to some people usually think of these 25 Man's strength is often shown in his 26 Male children 27 Is often seen behind bars 28 Growing children often have a great liking for it 30 Hums as it goes to work 31 A poem written to be set to music

CUT ALONG THESE THICK LINES.

"ORIENT CROSSWORD" No. 36—CLOSING THURSDAY, DEC. 22
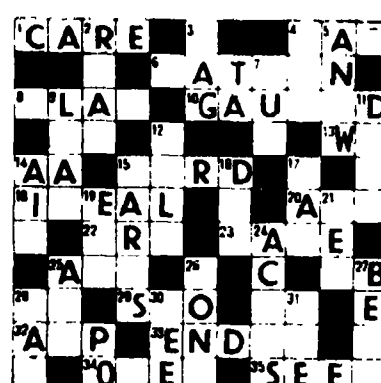
In entering this Competition I agree to abide by the rules and conditions in "Orient Illustrated Weekly" as final in all matters and I enclose
P.O M.O. Value Re. ....
No. ....

ENTRY FEE for 4 squares Re. 1

NAME ....
....
ADDRESS ....
....
....

ARMS, AMMUNITION FISHING
AND
SHOOTING REQUISITES

AT COMPETITIVE RATES!

Our Fully illustrated Arms & Ammunition Guide which Contains Some Interesting NOTES ON SHOOTING.

Sent Free on Application.
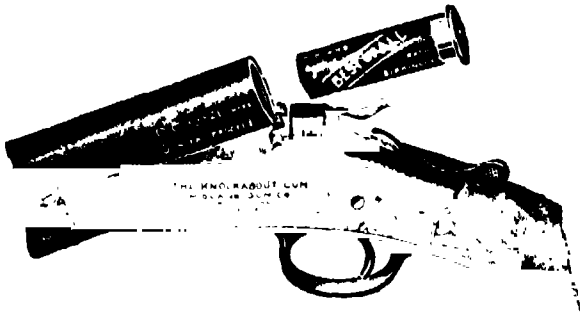
We stock **Arms** such as those by Purdy Holland and Holland, Rigby, Greener, Grand Prix, Webley, Tolley, Jeffery, B.S.A. etc.

We stock **Ammunition** such as Western Super X Long Range, Eley's Super royal, etc.

We stock **Fishing Tackle** such as those by Hardy Bros., Horrocks, etc.

We stock **Shooting Requisties** such as Brilliant Searchlight Lamps, Zeiss Binoculars, Webley's Air Pistols, Zeppelin Air Guns, etc.

Goolamhusain Allibhoy & Sons, Ltd.,

BOMBAY 3.

Telephone : No. 20118.
Telegrams : **"BANDUKWALA."**

کُنال

(ریڈیو ڈرامہ)

[نقارے۔ قرنا۔ سنکھ اور کھڑتال کی مدھم آوازیں جو آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی ہیں ——— اور اس تمام سین کے دوران میں کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو جاتی ہیں۔ لیکن دُور ہی رہتی ہیں۔ بازار میں چلتے پھرتے آدمیوں کی آوازیں۔ کبھی کبھی ان آوازوں پر مجمع کا شور غالب آجاتا ہے۔]

لڑکا - چاچا۔ مہاراج کیا اِدھر سے گزریں گے؟

باپ - ہاں بیٹا۔

لڑکا - اور مہاراج کے ساتھ کون ہوگا چاچا؟

باپ - ہماری نئی مہارانی بیٹا۔

پہلا آدمی۔ لڑکے کو گود میں اُٹھا لیجئے۔ مہاراج کا رتھ آنے کو ہے۔

باپ - آپ کیا اُدھر ہی سے آرہے ہیں؟

پہلا آدمی۔ جی ہاں، وہاں تو اتنی بھیڑ ہے، اتنی بھیڑ ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔

لڑکا - کیا بات ہے چاچا؟

باپ - جلد جلد چلو!

لڑکا - جلد کیوں چلیں چاچا؟

باپ - ایسی دھکا پیل ہوگی کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ملیگی۔ بیچ ہی میں پس کر رہ جائیں گے۔

. . . .

تیسرا - رتھ اِدھر سے ہی تو گزرے گا۔ آخر مہارانی ہی کو دیکھنا ہے نہ؟

چوتھا۔ مہارانی؟ ——— مہارانی کیسی؟ ——— چمار کی بیٹی . . . .

دوسرا۔ ہش! ——— (گھوڑے کی ٹاپ)

دوکاندار۔ اجی جناب! اے جناب! سنتے نہیں کیا؟

چوتھا۔ کیوں چلّا رہے ہو اتنا؟

دوکاندار۔ ابھی گھوڑے سوار کو بُلا کر جیل بھجوا دُوں گا۔

چوتھا - آخر ہوا کیا؟

دوکاندار۔ ہوا کیا؟ میری دوکان سے ذرا پرے ہٹ کر کھڑے ہو جئے!

چوتھا۔ دوکان کا مالک ہے کہ تھانیدار؟ سڑک بھی تیرے باپ کی ہو گئی۔

دوکاندار۔ ارے بلانا اُس سوار کو ——— دیکھتا کیا ہے؛ آواز دے —— چلا گیا؟ ——— جانے دے۔

گاہک - کیا ہوا جی؟ ——— آدھ پاؤ تیل دینا۔

دوکاندار۔ دوکان کا کرایہ نہیں دیتے ہیں کیا؛ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ کیا جلوس ہم نہ دیکھیں؟

گاہک - ضرور۔ ضرور۔ آج اس شادی کی خوشی میں دیپ مالا ہوگی! (ہنستا ہے) میں نے کہا چلو۔ نئی مہارانی بھی دیکھ لیں گے، اور ——— تیل بھی لیتے آئیں گے۔

(دوکاندار ہنستا ہے)

پانچواں۔ اچھا، تو چمار کی بیٹی ہے!

چھٹا - مگر بڑی سُندر ہے۔

پانچواں۔ بڈھے مہاراج اشوک کو یہ سُوجھی کیا؟

چھٹا - اتنے سال شادی نہ کی اب جب کُوچ کا وقت آن پہنچا تو گھر دلہن بیاہ لائے۔

[دور سے "ہٹو ہٹو" "راستہ صاف کر دو" کی آوازیں آتی ہیں۔ نقاروں اور طوطی کی آوازیں ذرا اونچی ہو جاتی ہیں۔]

پانچواں۔ (آہستہ) مہاراج کمار کُنال اور کنور رانی . . .

چھٹا - (آہستہ) پھر سوتیلی ماں اور وہ بھی چمار کی . . . . .

[آواز مدھم ہو جاتی ہے۔ پھر "ہٹو ہٹو" کی آوازیں شروع ہو جاتی ہیں جو آہستہ آہستہ غائب ہوتی جاتی ہیں]

(خاموشی کا وقفہ)

کنال ۔ کنورانی صاحبہ (ہنستا ہے) رُوٹھ گئیں کیا ؛ مہاراج اشوک کے
بیٹے کی بیوی ۔ ہندوستان کی آئندہ مہارانی اور یوں مُنہ بسورے
غمگین بیٹھی ہو ؛

کنورانی ۔ (طنزاً ہنستی ہے) ہندوستان کی آئندہ مہارانی ! مہارانی ! کاش !
یہ ہو سکتا ۔ کاش ! میرا خواب پورا ہو سکتا ۔

کنال ۔ اب بھی ایسا ہی ہوگا ۔ چنتا کس بات کی ؟

کنورانی ۔ میں پاگل نہیں ہوں سوامی پاگل نہیں ۔ سمجھتی ہوں سب
دیکھ رہی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے ۔ اور کیا ہونے والا ہے ۔

کنال ۔ تم نے تو ناحق جی کا روگ مول لے لیا ۔

کنورانی ۔ (بہانہ مانو تو کہوں) کونسا دل ہے جو اس آنے والی مصیبت کو دیکھ
کر ڈر نہ جائے ۔

کنال ۔ مصیبت ! (زور سے ہنستا ہے)

کنورانی ۔ ہنسئے مہاراج ؛ خوب ہنسئے ۔ میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو چکی
ہے ۔ میری اُمیدوں کا دیا بجھ چکا ہے ۔

کنال ۔ (کمرے میں ادھر اُدھر چکر لگانے کی آواز) اوہ آخر میں تمہاری اداسی
۔ ۔ ۔ تمہارے خوف کو کیسے مٹاؤں ؟

کنورانی ۔ ایک ساس اور وہ بھی چمار کی بیٹی ۔

کنال ۔ ہمیں اس سے کیا غرض ۔ وہ ہندوستان کی مہارانی اور ہماری
ماں ہوگی ۔

کنورانی ۔ ماں ! ایک چمار کی بیٹی ہماری ماں ۔ مہاراج کی سمجھ پر ۔ ۔

کنال ۔ (زور سے) خاموش ۔ میرے باپ کے خلاف شکایت اور میرے
سامنے ؛ آج تک کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوئی ۔ کیا تم نہیں جانتیں
کہ جس سر میں مہاراج کی بُرائی سمائی وہ کندھوں پر نہیں رہا ۔

کنورانی ۔ یہ سر یہ زبان اور جان بھی حاضر ہیں مہاراج (سسکیاں)

کنال ۔ اوہ ۔ تم تو پھر بچہ بن بیٹھیں ۔ اُٹھو ہمیں جلوس کے سواگت کے لئے
تیار رہنا چاہیئے ۔ مہاراج کی آنکھیں مجھے جلوس میں ڈھونڈ رہی
ہوں گی ۔

کنورانی ۔ مہاراج کی آنکھیں اب کسی اور کے لئے ہیں !

کنال ۔ تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو کنورانی ۔ میں باپ کے خلاف
ایک لفظ بھی سننے کا روادار نہیں ۔

کنورانی ۔ میرے بس کی بات نہیں مہاراج ! میں گنہ گار ہوں ۔

کنال ۔ تو تمہارے گناہ کی سزا یہی ہے کہ تم اُٹھ کر کھڑی ہو جاؤ ۔ اور میں
تمہیں جی بھر کر دیکھ سکوں ! (ہنستا ہے)

کنورانی ۔ مگر ان دو آنکھوں کی تاب کون لا سکے گا ، مہاراج ؛

کنال ۔ میری مندالیکا ۔ ہندوستان کی آئندہ مہارانی ۔ ایں ۔ یہ سننا ذرا
مہاراج کا رتھ آ رہا ہے ۔ (دور سے ہلکی ہلکی نقاروں وغیرہ کی آوازیں)
کھڑکی کھول دوں تو آواز شاید زیادہ سنائی دے ۔

(نقاروں کی آواز ذرا اونچی ہو جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے
کہ کھڑکی کھول دی گئی ہے)

کنورانی ۔ اُونہہ ۔ نئی مہارانی آ رہی ہے ۔

کنال ۔ چلو ۔ جلدی کرو

(ان کے چلنے کی آواز جو نقاروں کی اونچی آواز میں غائب ہو جاتی
ہے ۔ نقاروں کی آواز اور اونچی ہو جاتی ہے ۔ چند لمحے یہی حال
رہتا ہے ۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آواز کم اور دور ہوتی جاتی ہے اب
بالکل غائب !)

(خاموشی کا وقفہ)

اشوک ۔ مہارانی ! میرا بیٹا کنال ۔ میرے بڑھاپے کا سہارا اور ہندوستان
کا ولیعہد ۔ آپ کا سیوک اور بیٹا مہارانی !

مہارانی تر کشیانا ۔ مہاراج آپ کتنے خوش قسمت ہیں ۔

(اشوک ہنستا ہے)

اشوک ۔ وفادار بیٹا اور کتنی اچھی مہارانی ! اپنی قسمت پر جتنا ناز کروں
کم ہے ۔

مہارانی ۔ آپ کی داسی مہاراج ۔ ۔ ۔ آپ نے بیٹا کیا راج محل میں چاند
چھپا رکھا ہے ۔

(زور سے ہنستی ہے ۔ اشوک بھی اس ہنسی میں شامل ہو جاتا ہے)

اشوک ۔ دیکھا کنال ۔ تمہاری کتنی تعریف ہو رہی ہے ؟

کنال ۔ میں اس قابل نہیں مہاراج !

مہارانی ۔ کنال کی آنکھیں مہاراج

کنال ۔ مہارانی جی !

اشوک ۔ ماں اور بیٹے میں اتنی جلدی پریم بڑھتا دیکھ کر مجھے تو کنال پر
رشک آنے لگا (زور سے ہنستا ہے)

مہارانی۔ ہاں مہاراج۔ جیسے ہم مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔
جیسے ہمیں ایک دن ضرور ملنا تھا۔
کُنال۔ جی ــــ میں آپ کا بیٹا ہوں اور آپ میری ماں ہیں۔
اشوک۔ کُنال!
مہارانی۔ مجھے اس رشتہ کو بار بار یاد دلانے کا مطلب!
کُنال۔ تاکہ آپ کو مجھے بیٹا سمجھنے کی عادت ہو جائے۔
مہارانی۔ تم بڑی بے تُکی باتیں کرتے ہو۔
اشوک۔ اوہ ماں اور بیٹے میں لڑائی بھی شروع ہو گئی ــــ ہاں کُنال
کنورانی مندا لیکا کو کہاں چھوڑ آئے؟
کُنال۔ چند دنوں سے مندا لیکا کچھ بے چین سی رہتی ہے؟
اشوک۔ سبب؟
کُنال شاید ــــ [کھانستا ہے] میرے خیال میں تبدیل آب وہوا سے
کچھ افاقہ ہو سکے۔
اشوک۔ ہوں ــــ تو یوں کہو باہر جانا چاہتے ہو
کُنال۔ مہاراج میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔
مہارانی۔ مہاراج کیا مندا لیکا بھی کُنال ہی کی طرح خوبصورت ہے۔
اشوک۔ اس کا جواب [ہنس کر] بُرا نہ ماننا مہارانی مگر اس کا جواب تمہاری
آنکھیں ہی دے سکیں گی۔
کُنال۔ مجھے اب اجازت دیجئے مہاراج!
مہارانی۔ ہاں۔ کنورانی جی بے چین ہو رہی ہونگی ــــ کیوں کُنال؟
اشوک۔ دیکھو کُنال۔ منتری جی ابھی تک نہیں آئے دیپ مالا کا بھی انہوں
نے کچھ خیال کیا یا نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم ذرا جا کر
مہارانی۔ سیوک جو موجود ہیں مہاراج! کُنال کو یہیں رہنے دیجئے [آواز دیتی
ہے] ارکشیانا! ارکشیانا! ــــ
کُنال۔ آپ کی داسی آرام کر رہی ہوگی مہارانی جی! مجھے اجازت دیجئے
میں منتری جی کا پتہ لاتا ہوں۔
مہارانی۔ نہیں نہیں کُنال تم میرے پاس بیٹھو۔ مہاراج! سیوک کب کام
آئیں گے۔
اشوک۔ مہارانی اپنے بیٹے کی عادتیں ابھی سے خراب کرنے لگیں [زور
سے ہنستا ہے] میں خود جاتا ہوں۔
کُنال۔ مہاراج!

اشوک۔ ایک ہی بات ہے کُنال [جانے کی آواز]
کُنال۔ مگر ــــ
مہارانی۔ کُنال!
کُنال۔ ارشاد!
مہارانی۔ تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں کُنال [کسی کے آنے کی آواز]
مہاراج کیا واپس آ گئے؟
کُنال۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔
اشوک۔ [دُور سے] لو مہارانی میں واپس بھی آ گیا۔ [قدموں کی قریب آتی ہوئی
چاپ]
مہارانی۔ کُنال تم کہاں جا رہے ہو؟ کُنال!
اشوک۔ [اب کمرے میں گویا داخل ہو گیا ہے] ہاں اگر کنورانی بیمار ہے۔ تو
جاؤ کُنال۔

[جانے کی آواز]

مہارانی۔ مگر مہاراج اتنی بے ادبی کہ میرے سوال کا جواب بھی نہ دے۔
اشوک۔ ممکن ہے سنا نہ ہو۔
مہارانی۔ ہاں شاید ایسا ہی ہو۔ بڑا نیک لڑکا ہے کُنال۔ مگر کنورانی
کی بیماری مجھے محض بہانہ معلوم ہوتی ہے۔
اشوک۔ ہو سکتا ہے۔ میں خود دریافت کروں گا۔
مہارانی۔ آخر اس عمر میں آپ لڑکے کو اپنی نظروں سے دُور کیوں کر بھیج
سکتے ہیں؟
اشوک۔ ٹھیک کہتی ہو مہارانی۔ آؤ ذرا باغ کی ہی سیر کر لیں۔
مہارانی۔ جو اچھیا مہاراج کی!
اشوک۔ [چلتے چلتے] مہارانی تم کتنی اچھی ہو!
مہارانی۔ میرا سوبھاگیہ مہاراج!

[توقف کے بعد]

[بازار میں لوگوں کی مختلف قسم کی آوازیں]

گاہک۔ ارے بھئی تیل دینا۔
دوکاندار۔ تیل مہاراج؟
گاہک۔ ہاں۔ تیل۔ دیپ مالا جو ہو گی آج
دوکاندار۔ مہاراج سننے میں آیا ہے کہ دیپ مالا ایک ہفتہ تک رہیگی۔
گاہک۔ ارے بھئی مجھے مہاراج کہہ کر کیوں پکارتا ہے؟

دوکاندار۔ ارے مہاراج! [ہنسنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہی ہی ہی] دیکھئے نہ مہاراج!

گاہک۔ پھر مہاراج؟

دوکاندار۔ اوہ، مہاراج! [لمبا سانس لیتا ہے]

گاہک۔ اچھا تو دیپ مالا ایک ہفتہ تک رہے گی؟

دوکاندار۔ جی۔ اور مہارانی کا نیا فرمان بھی سُن لیا ہوگا؟

گاہک۔ نہیں تو ـــ وہ کیا؟

دوکاندار۔ کہ ہر صبح مہارانی کے درشن کے لئے محل کے سامنے باغ میں جانا ہوگا۔

گاہک۔ عجیب فرمان ہے۔ اور یہ کب تک؟

دوکاندار۔ جب تک دیپ مالا رہیگی۔

گاہک۔ اور مہاراج خود اس فرمان پہ خاموش ہیں؟

دوکاندار۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

گاہک۔ توبہ توبہ۔ نیچ ذات کی جوان عورت . . . .

دوکاندار۔ ارے مہاراج یہ کیا کہہ دیا۔ اس آدمی نے سن لیا ہوگا۔ یہ رہا تیل آپ کا۔ جائیے راستہ لیجئے اپنا، وہ دیکھئے وہ آدمی گھوڑے سوار کی طرف جا رہا ہے۔ میری دوکان کے آگے نہ ٹھہرئیے اب۔ جائیے جائیے یہاں سے۔

گاہک۔ [چلتے چلتے] دیکھیں مہاراج کمار کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے

دوکاندار۔ ارے! جائیے بھی! [جانے کی آواز۔ جو آہستہ آہستہ بازار کی دوسری آوازوں میں غائب ہو جاتی ہے اور دور ہوتی جاتی ہے۔ اب بالکل غائب]

[خاموشی کا وقفہ]

کنورانی۔ ہوں۔ تو نئی مہارانی سے ملاقات ہوگئی مہاراج کمار؟

کُنال۔ ہوگئی۔

کنورانی۔ ہمیں تو کچھ نہ بتایا آپ نے؟

کُنال۔ کوئی تماشہ تھوڑے ہی تھا جو قصہ سناتا!

کنورانی۔ پھر بھی؟

کُنال۔ آخر کچھ پتہ بھی تو لگے تم پوچھنا کیا چاہتی ہو؟

کنورانی۔ کیا کیا باتیں ہوئیں؟

کُنال۔ یہی کہ کنورانی کی زبان بہت لمبی ہے اسے کٹوا دیا جائے۔ کُنال کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ ان پہ پٹی باندھ دی جائے اور ـــــ اور کچھ اور بھی سنوگی؟

کنورانی۔ خیر یہ تو ہوئیں۔ پہلے دن کی باتیں۔ اتنی بار جو مہارانی سے مل چکے۔ آخر کیوں؟ ہاں ایک بات اور . . . . . .

کُنال۔ سُن رہا ہوں۔

کنورانی۔ آپ اتنے چُپ اور اُداس کیوں رہتے ہیں؟

کُنال۔ اِس لئے کہ کنورانی کے کان میری آواز کو سن نہیں سکتے اور کنورانی کی آنکھیں . . . .

کنورانی۔ بس بہت ہو چکی۔ آپ کو بتانا ہوگا اور سچ سچ بتانا ہوگا۔

کُنال۔ بتا تو رہا ہوں۔

کنورانی۔ اور پھر مجھے اتنے دن مہارانی سے کیوں نہ ملنے دیا؟ ـــ چُپ کیوں ہو گئے! اب تو بتانا ہی ہوگا۔

کُنال۔ [بناوٹی لہجے میں] اس لئے کہ میری ننھی سی جان کنورانی مندالیکا بے چین جو رہتی ہے۔

کنورانی۔ اور یہ بہانہ بازی کیوں تھی؟

کُنال۔ وقت نہیں اور مجھے مہارانی سے ملنا ہے۔

کنورانی۔ آپ کو مہارانی سے ملنا ہے۔ اسی لئے جب میں اس کمرے میں آئی تو میں کہوں نہ جانے یہ آج اتنا بن سنور کیوں رہے ہیں ـ چُپ چاپ کسی گہری سوچ میں پڑے ہیں۔

کُنال۔ یہی سوچ رہا تھا کہ تم بہت ہٹیلی ہوتی جا رہی ہو۔

کنورانی۔ نہیں، مہاراج۔ یہ سوچ رہے تھے کہ مہارانی سے کن محبت بھرے لفظوں میں باتیں کریں گے۔

کُنال۔ [ذرا سختی سے] مندالیکا!

کنورانی۔ مہاراج۔

کُنال۔ [زور سے ہنستا ہے] رو پڑی نہ! میں جانتا تھا رو دو گی [پھر ہنستا ہے۔ ہنسی رفتہ رفتہ مدھم ہو جاتی ہے]

[خاموشی کا وقفہ]

[کمرے میں اِدھر اُدھر پھرنے کی چاپ۔ پھر ٹھہرکر]

مہارانی۔ آج اُس سے کہہ دونگی۔ سچ سچ بتا دونگی۔ آہ۔ اس کی آنکھیں ـــ اس کی آنکھیں ـــ رکشیانا! رکشیانا! ـــ مرگئی وہیں پر؟ ـــ رکشیانا! ـــ

رکشیانا۔ [دور سے آواز] آئی مہارانی جی!

مہارانی۔ کاش! وہ مان لے —— کاش! —— مگر ایک طرف بوڑھے
مہاراج اور دوسری طرف کنورانی۔ رُکاوٹ بھی ایک نہیں دو!
رکشیانا۔ مہارانی جی!
مہارانی۔ او —— تم ہو رکشیانا؟
رکشیانا۔ مہارانی جی!
مہارانی۔ کُنال ابھی تک نہیں آیا رکشیانا؟
رکشیانا۔ دو بار ہو آئی مہارانی جی!
مہارانی۔ رکشیانا! مہارانی صرف مہاراج کے سامنے۔ کُنال کے سامنے اور
جب ہمیں دونوں ہوں —— اکیلی —— اُس وقت ہم پھر ساتھ کی
کھیلی ہوئی سہیلیاں —— تمہاری وہی تشیاری۔ اسی لئے تو تمہیں
ساتھ لائی تھی۔ کہ تم میری بھیدی بنو گی —— کہو رکشیانا کیا
کنورانی مجھ سے خوبصورت ہے؟
رکشیانا۔ تمہارے تو پاسنگ بھی نہیں تشیاری!
مہارانی۔ سچ کہتی ہو؟
رکشیانا۔ اے لو! مجھے کیا پڑی ہے کہ میں جھوٹ بولوں؟
مہارانی۔ تو پھر کُنال پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ اُس کی طرف سے اب تک اتنی
بے رُخی کیوں؟
رکشیانا۔ حُسن کا رعب!
مہارانی۔ اتنا رعب۔ اتنا غرور۔ گرا سکتی ہوں رکشیانا۔ اس کا غرور چکنا چور
کر سکتی ہوں۔
رکشیانا۔ مگر جو بھی کرنا ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔
مہارانی۔ تم بڑی بھولی ہو رکشیانا۔ محبت میں سوچ سمجھ کا کیا کام؟ ——
یہ دیکھنا کوئی آ تو نہیں رہا؟
رکشیانا۔ نہیں۔ میرے کان اسی طرف ہیں!
مہارانی۔ میں منت کرونگی۔ بھیک مانگوں گی۔ پاؤں پکڑوں گی۔
رکشیانا۔ اور اگر —— وہ نہ مانا؟
مہارانی۔ اس کے بعد کیا ہوگا رکشیانا؟ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ بس اتنا جانتی
ہوں کہ میرے سپنوں کی پھلواری میں کوئی شوبھا نہ رہیگی [ذرا زور سے]
لیکن نہیں اس کے بعد تمہاری مددگار ہوگی۔ اس کے بعد ایک
نیا کھیل شروع ہوگا۔
رکشیانا۔ اور اگر مہاراج تک یہ خبر پہنچ گئی تو؟

مہارانی۔ مہاراج! اگر چاہوں تو سارے ہندوستان سے اپنے پاؤں کے
تلوے چٹا سکتی ہوں۔ ڈرہے تو سندلیکا کا۔ اُس چڑیل کا۔
رکشیانا۔ وہ ننھی سی جان تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟
مہارانی۔ ٹھیک کہتی ہو رکشیانا —— سُن! [سیڑھیوں پر کسی کے آنے کی
آواز] بھاگ نکل —— دروازے کے باہر مہاراج کا خیال رکھ ——
ہاں سُن —— [ذرا آہستہ] میں کیسی لگ رہی ہوں۔
رکشیانا۔ [جاتے ہوئے] بس یوں کہ دیکھوں تو دیکھتی ہی رہوں۔ پیار کروں
تو پیار ہی کرتی جاؤں۔ [ہنستی ہوئی جاتی ہے مہارانی ذرا کھانستی ہے]
کُنال۔ [اندر آتے ہوئے] مہارانی جی!
مہارانی۔ اوہ! تم نے تو ڈرا ہی دیا۔
کُنال۔ معاف کیجئے مہارانی جی۔ مجھے نہ پتہ تھا کہ میں بھیانک بھی ہوں۔
مہارانی۔ [ہنسنے کی کوشش] کُنال! بڑی راہ دکھاتے ہو۔ راہ دیکھتے دیکھتے
آنکھیں تھک جاتی ہیں۔
کُنال۔ اب تو حاضر ہو گیا مہارانی جی! —— ارشاد!
مہارانی۔ آؤ۔ میرے پاس آ بیٹھو۔ تمہیں جب دیکھتی ہوں تو مجھے بچپن کا
ایک سپنا یاد آجاتا ہے۔ ایک ایسا سپنا جسے برسوں تک میں
بھول نہ سکی۔
کُنال۔ مہارانی جی!
مہارانی۔ کُنال!
کُنال۔ مجھ سے کیا کام تھا؟
مہارانی۔ کیا میرا اتنا حق بھی نہیں کہ جب میں گھنٹوں میں تمہیں کسی وقت بُلا
بھیجوں۔ تمہیں دیکھ سکوں۔ اپنے کلیجے کو ٹھنڈا کر سکوں۔
کُنال۔ مہارانی جی یہ باتیں آپ کو زیبا نہیں۔ دنیا میں اور بھی باتیں ہیں۔
جو ماں اور بیٹے میں ہو سکتی ہیں۔
مہارانی۔ ماں؟ کُنال۔ کس کی ماں۔ ہائے۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ تم بچے نہیں
جو سمجھاؤں . . . تم . . .
کُنال۔ مہارانی جی مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھے جانے دیجئے۔ آپ مہاراج اشوک
کی بیوی ہیں۔ ہندوستان کی مہارانی۔ مجھے جانے دیجئے۔
مہارانی۔ کیسے جانے دوں کُنال؟ جو رگ رگ میں سما گیا ہو اُسے کیسے جانے دوں؟
کُنال۔ بس اور ایک لفظ بھی نہیں۔ اب میری نظروں میں آپ کا رُتبہ محض
ایک مہارانی کا رہ گیا ہے۔ ماں کے اس مقدس لفظ سے آپ کو

یاد کرنا بھی میرے نئے گناہ سے کم نہ ہوگا۔

مہارانی۔ اتنا غرور، اتنی گھمنڈ؟ کیا نہیں جانتے کہ تمہیں اپنے الفاظ کی سزا بھگتنا ہوگی۔

کنال۔ میں پاپ کی خاطر قربانی کے لئے تیار رہوں گا۔ مہارانی!

مہارانی۔ کنال مجھے معلوم ہے تم مذاق کر رہے ہو۔ میری ہنسی اڑا رہے ہو۔ چلو اب ہنسی ہو چکی۔

کنال۔ بس ایک قدم بھی آگے نہیں۔ وہ کتنی بدبخت گھڑی تھی جب ہندوستان نے تجھے اپنی مہارانی بنایا۔

[کسی کے جلد جلد اندر آنے کی آواز]

رکشیانا۔ مہارانی جی!

مہارانی۔ کیا ہے رکشیا؟

رکشیانا۔ مہاراج آ رہے ہیں۔

مہارانی۔ کنال۔ کنال ـــــ ٹھہرو ـــ کنال [لمبا سانس]

چلا گیا۔ کٹھور! پتھر!

رکشیانا۔ کیا ہوا؟

مہارانی۔ جو ہونا تھا جو کہتی تھی۔

رکشیانا۔ اور اب؟

مہارانی۔ اور اب . . .

مہاراج۔ [باہر سے آواز] مہارانی!

مہارانی۔ چل بھاگ رکشیانا۔ بڈھا آ گیا۔

مہاراج [اندر آ کر] اوہ ـــ اکیلی ـــ بالکل اکیلی مہارانی؟

مہارانی۔ ہم نہیں بولتے آپ سے!

مہاراج۔ اس خفگی کا باعث؟

مہارانی۔ ہم تو آپ کی راہ تکتے رہتے ہیں اور آپ نہ معلوم کہاں رہتے ہیں؟

مہاراج۔ اوہ میری ننھی سی رانی! بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں؟

مہارانی۔ اور نہیں تو!

مہاراج۔ مگر ابھی ابھی ادھر سے گزرا کون؟

مہارانی۔ کنال تھا۔

مہاراج۔ کنال؟ وہ کیوں آیا؟

مہارانی۔ سفارش لے کر۔

مہاراج۔ کیسی سفارش؟

مہارانی۔ باہر جانا چاہتا ہے۔

مہاراج۔ [قہقہہ] اب سمجھا میں۔ بڑا چالاک ہے۔ جانتا تھا کہ میں تو اجازت دوں گا نہیں۔ پھر کیا سوچا تم نے؟

مہارانی۔ میں تو کہتی ہوں جانے دیجئے۔ ٹکشلا بھیج دیجئے۔ وہاں کی حالت بھی کچھ ابتر ہے۔ کنال کے جانے سے رعایا بھی خوش ہوگی اور منتری بھی ٹھیک کام کریں گے۔

مہاراج۔ مہارانی تم بڑی دُور اندیش ہو۔

مہارانی۔ [تالی بجاتی ہے] رکشیانا!

رکشیانا۔ [آنے کی چاپ] مہارانی جی!

مہارانی۔ کنال کو مہاراج یاد کرتے ہیں۔ [جانے کی آواز]

مہاراج۔ مہارانی سچ جانو مجھے ہرگز یقین نہ تھا کہ ماں ایک سوتیلے بیٹے سے اتنا نیک سلوک کر سکتی ہے۔

مہارانی۔ ایک بات پوچھوں مہاراج؟

مہاراج۔ ضرور ضرور!

مہارانی۔ آپ کو مجھ سے پیار بھی ہے۔

مہاراج۔ پیار؟ ـــ مہارانی! تم نہ ہوتیں تو میں زندہ کس طرح رہ سکتا؟

مہارانی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں مہاراج!

مہاراج۔ تم بہت چنچل ہو!

مہارانی۔ مہاراج! ـــ لیجئے کنال تو شاید آ بھی گیا۔

مہاراج۔ تو ٹکشلا ہی بھیجنا چاہتی ہو اُسے مہارانی!

مہارانی۔ آپ کی اِچھیا سے مہاراج!

مہاراج۔ نہیں نہیں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن . . . ذرا دُور تھا۔

مہارانی۔ اتنا دُور بھی . . .

کنال۔ [اندر آ کر] مہاراج!

مہاراج۔ کنال کل تمہیں ٹکشلا جانا ہوگا اور رعایا کو بتانا ہوگا کہ تم اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہو۔ رعایا کی خوشی اور ان کا غم تمہاری خوشی اور تمہارا غم ہوگا۔

کنال۔ ایسا ہی ہوگا مہاراج!

مہاراج۔ ہاں۔ ایک بات تو بھول ہی چلا تھا۔ میرے ہر خط اور ہر فرمان کی مُہر پر میرے دانتوں کے نشان ہوں گے اور جس پر نہ ہوں

وہ جعلی ہوگا۔

کُنال۔ سمجھ گیا مہاراج!

مہاراج۔ تتھاستو کمار!

کُنال۔ مہاراج کشما کیجئے۔ منتری جی باریابی کے لئے منتظر ہیں۔

مہاراج۔ ابھی تو آیا تھا وہاں سے —— مہارانی! ——

مہارانی۔ پھر چل دیئے مہاراج؛

مہاراج۔ ابھی آیا مہارانی! —— چلو کُنال! [دو آدمیوں کے قدموں کی چاپ]

تشیلا۔ یہ کیا کیا؛ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا مار لیا! بھیجا بھی تو اتنی دُور!

مہارانی۔ تُو نہیں سمجھی۔ چل باغ میں چل۔ تجھے بتاؤں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ جن آنکھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں اُنہیں کہیں کا نہ رکھوں گی۔ [دو عورتوں کے قدموں کی ہلکی ہلکی جاتی ہوئی چاپ]

[خاموشی کا وقفہ]

منتری۔ . . . دوستو۔ مہاراج کمار کی آمد پر لوگوں نے جس خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اُس کی خبر مہاراج کمار تک پہنچا دی گئی تھی جب سے تکشلا کی حکومت کی باگ ڈور مہاراج کمار نے سنبھالی۔ تکشلا کی خوشحالی میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ آج اس منتری سبھا کو اس لئے بلایا گیا ہے کہ آپ کے سامنے مہاراج کمار کا ایک نیا فرمان پیش ہوگا۔ مہاراج کمار کی خواہش ہے کہ آپ میں سے ہر ایک . . .

ایک رُکن۔ منتری جی!

[سرگوشیاں]

دوسرا رُکن۔ منتری جی کو یوں نہ ٹوکنا چاہیئے۔

تیسرا۔ اس طرح ٹوکنے سے تقریر کی روانی جاتی رہتی ہے۔

پہلا۔ سن لیا سُن لیا۔

منتری۔ خاموش۔ دوستو خاموش۔ معلوم ہوتا ہے۔ مہاراج کمار کی پہلی تقریر کا اثر جاتا رہا۔ یاد نہیں؛ مہاراج کمار نے کہا تھا۔ وقت کی قدر کرنا ہر ایک کا فرض ہے۔

پہلا۔ منتری جی . . . میں

تیسرا۔ کیا خاموش نہیں رہ سکتے؛

دوسرا۔ سُنا نہیں منتری جی کیا کہہ رہے ہیں؛

منتری۔ بولنے دو بولنے دو!

پہلا۔ منتری جی اور دوستو۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ حکومت کے سب کام مہاراج کمار نے خود سنبھال لئے۔ ان کی صحت ۔ ۔ آپ نہیں جانتے ان کی صحت پر اس کا کتنا اثر پڑے گا۔

[سب مل کر کہتے ہیں۔ ہاں۔ ہاں]

مختلف آوازیں۔ [کوئی دھیمی کوئی نسبتاً اونچی، کوئی گہری کوئی قریب سے] ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے . . . بالکل ٹھیک ہے۔ اثر پڑے گا . . . صحت خراب ہو جائے گی . . . بڑا اچھا خیال ہے۔

منتری۔ خاموش۔ خاموش [خاموشی] دوستو ایسی فضا میں کسی بھی کارروائی کا عمل میں لانا نہایت مشکل ہے۔ جن دوستوں نے مہاراج کمار کی صحت کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے اور اس سبھا کی توجہ اس طرف دلائی وہ میرے اور اس سبھا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان کے خیالات مہاراج کمار تک پہنچا دیئے جائینگے۔

پہلا۔ منتری جی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کن کے خیالات! سبھا کا ان خیالات سے کیا تعلق۔ مہاراج کمار کو اس شخص کا نام بھی تو معلوم ہونا چاہیئے۔ میں نے پہلے پہل آپ کی توجہ اس طرف دلائی۔

آوازیں۔ پاگل ہے پاگل۔ عقل ماری گئی . . . .

منتری۔ [اُونچی آواز میں] خاموش۔ اگر یونہی شور ہوتا رہا تو مجھے اس سبھا کی کارروائی کو ختم کرنا پڑے گا۔

ایک آواز۔ منتری جی مہاراج کمار کا نیا فرمان . . . .

منتری۔ ہاں فرمان یہ ہے کہ پرجا میں سے ہر کوئی جسے اس سبھا کے کام سے اختلاف ہو وہ سیدھا مہاراج کمار سے جا کر مل سکتا ہے۔

ایک آواز۔ کیا؛

دوسری آواز۔ عجیب فرمان ہے!

تیسری آواز۔ تو پھر ہماری ہستی کیا رہی؛ ہماری قدر کون کرے گا۔

چوتھی آواز۔ ہم موم کی ناک نہیں بننا چاہتے!

آوازیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم مٹی کے پُتلے نہیں —— منتری جی! —— یہ فرمان . . . یہ فرمان [شور بڑھتا جاتا ہے۔ اس شور میں منتری کی آواز سنائی دیتی ہے]

منتری۔ سبھا ملتوی کی جاتی ہے!

آوازیں۔ [پھر شور] ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔

منتری۔ [شور میں] اس صورت میں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔

[شور کی آواز کم ہوتی جاتی ہے اور پھر خاموشی]

[خاموشی کا وقفہ]

کنال ۔ چوٹ تو نہیں آئی منداکیا؟ [ہنستا]

کنورانی۔ آپ کی بلا سے۔ مر بھی جاؤں تو کون پرواہ کرے گا۔

کنال ۔ سارا تکشلا میرے گیت گا رہا ہے اور ایک تم ہو کہ ہمیشہ روٹھی
رہتی ہو۔

کنورانی۔ جی مہاراج کمار صاحب۔ آئینہ میں شکل بھی دیکھی۔ ہڈیاں
نکل آئیں ہڈیاں۔ جن لوگوں کے لئے رات دن ایک کر دیا ہو۔
اگر وہ تعریف نہ کریں تو ان سے اور زیادہ ناشکر گزار کون ہوگا؟

کنال ۔ کنورانی جی!

کنورانی۔ کنورانی جائے بھاڑ میں۔ جب مہاراج کے پاس تھے تو مہارانی
نہ چھوڑتی تھی اور جو یہاں پہنچے تو روگ نہیں دم لینے دیتے۔

کنال ۔ [قہقہہ] مہارانی کی بھی ایک ہی کہی!

کنورانی۔ اچھے بھلے بیٹھے بٹھائے یہ روگ مول لے لیا۔ بھیا بھی تو کہاں!
تکشلا!

کنال ۔ میں تو خود آیا تھا یہاں!

کنورانی۔ اور وہ کیوں؟

کنال ۔ تم بے چین جو رہتی تھیں۔

کنورانی۔ ہوں!

کنال ۔ ہائیں۔ ہائیں۔ ارے یہ کیا۔ ارے یہ گدگدی کیوں کرتی ہو۔

کنورانی۔ بڑے چلبلے ہو۔ ہاتھ لگا نا گدگدی ہوگیا۔

کنال ۔ میں چھیڑوں گا تو پھر کہو گی کہ کلائی کو تو دیکھو!

کنورانی۔ آج کتنا اچھا دن ہے کہ آپ ہنس رہے ہیں۔ کتنی مدت کے
بعد وہ پہلی سی مسکراہٹ۔ پہلی سی ہنسی۔ نہ معلوم کیا بیٹھے بیٹھے
سوچا کرتے ہیں آپ۔ اور تکشلا آنے سے ایک دن پہلے آپ
کی مہارانی سے آخری ملاقات۔ توبہ۔ وہ دن میں کبھی نہ بھولوں گی
رنگ اُڑا ہوا۔ آنکھیں لال۔ مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

کنال ۔ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔

کنورانی۔ اور جو یہ بھی بتاؤں کہ آپ آدھی رات تک روتے رہے تھے؟

کنال ۔ کیا مطلب؟

کنورانی۔ مطلب یہ کہ میں جاگ رہی تھی۔ سنا آپ نے!

کنال ۔ بالکل غلط۔ ممکن ہے میرا ہنسنا بھی تمہیں رونا ہی معلوم ہوا ہو۔

کنورانی۔ خوب تو گویا آپ نیند میں ہنسا بھی کرتے ہیں۔

کنال ۔ شاید تمہیں خواب میں روتا دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی ہو۔

کنورانی۔ خیر یہ تو اچھا ہے کہ آپ کی بھولنے کی عادت فنا بڑھتی جا رہی ہے۔
اس سے نہ تو صحت بگڑتی ہے اور نہ بات بدلنے کی ضرورت پڑتی
ہے ——— آنکھیں کیوں بند کر لیں۔

کنال ۔ تمہیں دیکھنے کے لئے۔

کنورانی۔ اور جو میں ان کو چوم لوں۔ کہیں نظر نہ ہو جائے ——— آپ کتنا
اچھا گایا کرتے تھے۔

کنال ۔ ایک بات پوچھوں۔

کنورانی۔ پہلے یہ بتائیے کہ کسی اور نے بھی ان آنکھوں کی تعریف کی؟

کنال ۔ واہ! بیسیوں نے!

کنورانی۔ پھر؟

کنال ۔ سب کچھ بتا دیا تو جل ہی جاؤ گی!

کنورانی۔ اونہہ! بڑی آنکھوں والے آئے!

کنال ۔ [قہقہہ] دیکھا؟ [ہنستا جاتا ہے]

(خاموشی کا وقفہ)

مہارانی۔ [آہستہ سے] نہیں رکشیانا ایسا ہی ہوگا۔ جب ناگن پر پاؤں رکھ
دیا جائے تو اُسے پلٹ کر کاٹنے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہیں
آتا۔

رکشیانا۔ لیکن تشیاری! جو چیز تمہیں سب سے اچھی لگتی ہے اُسی
کو تم مٹانے پر تُلی ہوئی ہو۔

مہارانی۔ کیوں نہ مٹاؤں؟ کیوں نہ مٹاؤں؟ رکشیانا! ان ہی آنکھوں
نے تو میری راتوں کی نیند حرام کر دی۔ میری آشاؤں کو ملیامیٹ
کر دیا۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی مجھے مُردوں سے بدتر بنا دیا۔ اب
تُو ہی بتا کہ اپنا کلیجہ کس طرح ٹھنڈا کروں؟

رکشیانا۔ اور بھی تو طریقے ہیں۔

مہارانی۔ میں بھی تو سُنوں؟

رکشیانا۔ مُرت!

مہارانی۔ نہیں میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے اتنی جلدی بھول جائے۔ رکشیانا!

مرزتب علی خاں تاب

مہ محمد خاں شہاب

روشن دین تنویر

ایم بقایا

مظفر احمد

ر انصاری
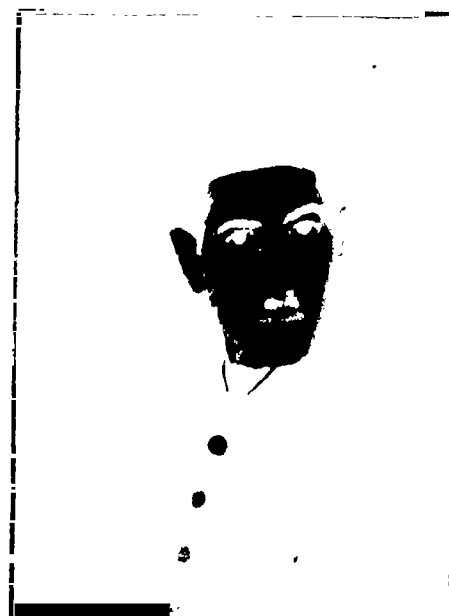
شہنشاہ حسین رضوی

یہ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح میں کروٹیں لے لے کر راتیں گزاروں گی وہ بیابانوں اور جنگلوں میں دربدر ٹھوکریں کھائے گا۔ بستیوں میں بھیک مانگتا پھرے گا۔ میں ہندوستان کے ہونے والے راجہ کو بھکاری دیکھنا چاہتی ہوں ——— آنکھوں سے محتاج!

رکشیانا۔ اپنے فیصلے کو پھر سوچ لیجئے ——— رات جا رہی ہے۔

مہارانی۔ سوچ چکی۔ ایک ہی بار سوچ چکی۔

رکشیانا۔ یہ تو سوچو کہ اُس کے بڈھے باپ پر کیا گزرے گی؟

مہارانی۔ جانتی ہوں!

رکشیانا۔ اُس کی بیوی کا کیا حال ہوگا۔

مہارانی۔ وہ بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر بازاروں میں بھیک مانگے گی۔

رکشیانا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ظلم ہے۔

مہارانی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اپنے بھی پرایوں کے دردی ہو سکتے ہیں۔

رکشیانا۔ میں تو تمہیں آزما رہی تھی۔ بولو اب کیا کرنا چاہتی ہو؟

مہارانی۔ فرمان لکھا جا چکا ہے۔ مہاراج کے جعلی دستخط ہو چکے ہیں۔ مہر لگ چکی ہے۔

رکشیانا۔ میرا بھائی گھوڑا لے کر تیار ہوگا۔

مہارانی۔ ابھی ایک کام باقی ہے۔

رکشیانا۔ وہ کیا؟

مہارانی۔ مُہر پہ مہاراج کے دانتوں کے نشان۔

رکشیانا۔ یہ کس طرح لو گی۔

مہارانی۔ چل میرے ساتھ۔ آہستہ آہستہ۔ بڈھا گہری نیند سو رہا ہے۔

[قدموں کی جاتی ہوئی چاپ]

[خاموشی کا وقفہ]

[ایک ہلکی سی چیخ کی آواز سُنائی دیتی ہے]

کنورانی۔ [چلاتے ہوئے] مہاراج کمار۔ مہاراج کمار۔ سوامی۔ دوڑو۔ وہ بھاگ گئے۔ پکڑو۔ [بھاگتے ہوئے اندر آنے کی آواز]

کُنال۔ کیا ہوا ——— مندالیکا ——— ڈر گئیں؟

کنورانی۔ [سسکیاں] آپ کی آنکھیں!

کُنال۔ میری آنکھوں کو کیا ہوا مندالیکا ——— تم بالکل ٹھنڈی ہو رہی ہو؟

کنورانی۔ میں نے دیکھا ایک آدمی نے آپ کو پکڑ لیا اور . . . .

کُنال۔ مجھ کو پکڑ لیا!

کنورانی۔ ہاں اور پھر آپ کی آنکھیں . . . مہاراج کُمار!

کُنال۔ کچھ نہیں تھا یہ ——— تم سو رہی تھیں۔ سپنا دیکھ رہی تھیں۔ پگلی! سُپنا!

کنورانی۔ سُپنا تھا مہاراج؟

کُنال۔ ہاں۔ اُٹھو۔ آؤ۔ میری ننھی سی جان ڈر جاتی ہے۔ تمہیں اکیلا نہ سونا چاہیئے۔ [جاتی ہوئی چاپ]

[خاموشی کا وقفہ]

[خراٹے لینے کی آواز جو اس سین کے دوران میں پشت سے نہیں رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے کی آواز۔ گویا دو آدمیوں کے سانس باتیں کر رہے ہوں]

رکشیانا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھی کہ تو دانتوں کے نشان کس طرح لے گی۔

مہارانی۔ دیکھ بڈھا منہ کھولے خراٹے لے رہا ہے ——— کیا اب بھی نشان لینے مشکل ہوں گے۔

رکشیانا۔ نہیں تو ——— اب سمجھی!

مہارانی۔ ادھر لا لفافہ ——— دیکھ بڈھا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کی آنکھیں کس طرح لے گا۔

رکشیانا۔ کتنی گہری نیند سو رہا ہے!

مہارانی۔ دُنیا کی فکروں سے تھکا ہوا دماغ یونہی مدہوش سویا کرتا ہے اب مجھے اپنا کام کرنے دے [کسی کے آہستہ آہستہ چلنے کی چاپ۔ ایک لمحے کے بعد پھر وہی آواز]

مہارانی۔ یہ لے رکشیانا۔ اپنے بھائی کو دے اور سمجھا دے کہ رات رات بھر گھوڑا سرپٹ دوڑائے۔ تکشلا پہنچ کر منتری کو یہ لفافہ دیدے سُن رہی ہے نہ؟

رکشیانا۔ مہارانی!

مہارانی۔ پھر مہارانی ——— تُو کانپ رہی ہے رکشیانا۔ پگلی جلدی کر اس وقت ایک ایک پل لاکھ کا ہے۔ چل میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔

[آہستہ آہستہ جانے کی چاپ۔ خراٹوں کی آواز بھی آ رہی ہے جو ایک لمحے کے بعد ایک تیز گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ آواز چند لمحے یوں ہی رہتی ہے اور دُور ہوتی جاتی ہے حتّٰے کہ بالکل غائب]

[خاموشی کا وقفہ]

[بہت سی آوازیں اُٹھیں]

منتری۔ خاموش۔ خاموش میں کہتا ہُوں خاموش ہو جائیے۔ [خاموشی]
ایک رُکن۔ اس کا فیصلہ مہاراج کمار کے سامنے ہی ہوگا۔
دُوسرا۔ مہاراج کمار کب آئیں گے؟
منتری۔ آتے ہی ہونگے۔ چند دوستوں کی حرکات نہایت افسوس ناک ہیں
مہاراج اشوک کے نقشِ قدم پر چلتے ہُوئے مہاراج کمار نے یہ
سبھا اس لئے بنائی کہ آپ ان کے خیالات لوگوں تک پہنچائیں۔
ان کے ساتھ حکومت کی کارروائیوں میں حصہ لیں۔ مگر ہر فرمان کی
مذمت مہاراج کمار کی مذمت ہے نہیں بلکہ پریہ درشی مہاراج اشوک
کی۔
چند آوازیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ منتری جی ٹھیک فرماتے ہیں۔
منتری۔ آپ شاید بھُولے بیٹھے ہیں کہ مہاراج کمار کا ایک اشارہ آپ کو
چار دیواری کے اندر بند کروا سکتا ہے۔
ایک آواز۔ اب کارروائی شروع ہونی چاہیئے۔
دوسرا۔ منتری جی وہ پہلا فرمان کدھر ہے؟
تیسرا۔ ارے کونسا فرمان۔ کوئی نام بھی ہے کہ نہیں۔
چند آوازیں۔ یہ کون آرہا ہے۔ —— لیجئے منتری جی ایک اور فرمان!
منتری۔ کہاں سے آیا؟
نووارد۔ مہاراج اشوک کے پاس سے۔

[سرگوشیاں]

آوازیں۔ [حیرت سے] مہاراج اشوک کا فرمان؟

[لفافہ کھولنے کی آواز]

آوازیں۔ کیا ہے منتری جی! .... یہ کیا ہُوا۔ منتری جی کہ کچھ ہوگیا۔ منتری
جی! منتری جی! —— ہمیں بھی تو بتایئے —— کوئی نئی آفت؟
ایک آواز۔ شاید کسی کے خون کا حکم۔
دُوسرا۔ شاید یہ سبھا توڑنا چاہتے ہیں۔
منتری۔ [آہستہ] دوستو [خاموشی] مَیں ایک نہایت دردناک خبر سنانا
چاہتا ہُوں۔
آوازیں۔ دردناک؟
منتری۔ مہاراج اشوک کا حکم ہے کہ آج . . . .

آوازیں۔ منتری جی ہمت کیجئے۔
ایک۔ آنسو نکل آئے۔
منتری۔ [بھرائی ہوئی آواز] . . . . کہ آج مہاراج کمار کی آنکھیں نکلوا کر
اُنہیں مع کنورانی کے تکشلا سے باہر کر دیا جائے۔ آہ!
آوازیں۔ ظلم ہوگیا۔ ہم لُٹ گئے۔ منتری جی یہ نہیں ہوسکتا . . . . منتری
جی . . . منتری . . . [شور بڑھتا جاتا ہے "ظلم" "یہ نہیں
ہوسکتا" وغیرہ وغیرہ]

[خاموشی کا وقفہ]

[اب یہ ظاہر ہونا چاہیئے کہ یہ خبر آگ کی طرح شہر کی گلیوں میں پھیل رہی
ہے۔ اس کا تاثر یوں پیدا کیا جائے کہ ایک ہی وقت میں بہت سے
آدمی باتیں کر رہے ہوں —— پس منظر میں نہایت بے چینی کا
اظہار کرنے والی سرگوشیاں ہو رہی ہوں۔ اس سین میں ایک
تیزی ہو لیکن رفتار کی باقاعدگی کا خیال رکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ
کبھی ہلکے اور کبھی اونچے سُروں میں ساز بج رہے ہوں۔ سازوں
کی موسیقی سے سُننے والوں کے دلوں میں ایک سنسنی پیدا کرنے
کا کام لیا جائے]

ایک آدمی۔ تم نے بھی کچھ سُنا؟
دوسرا۔ ہاں۔ مہاراج کمار کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔
تیسرا۔ کیوں بھئی کیا یہ سچ ہے؟
چوتھا۔ یہ سب لوگ کدھر جا رہے ہیں؟
تیسرا۔ سنتے ہیں مہاراج کمار کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔
چوتھا۔ کیا؟
تیسرا۔ آنکھیں؟ —— مہاراج کمار کی؟
چوتھا۔ کدھر جا رہے ہو؟
پانچواں۔ روکو مت۔ جانے دو۔ مہاراج کمار آرہے ہیں۔
چوتھا۔ مہاراج اشوک نے آنکھیں نکلوا دیں۔
پانچواں۔ اب مہاراج کمار بھیک مانگ رہے . . . .

[قینچی چلانے کی آواز]

آواز۔ تم نے تو سب بال اُڑا دیئے۔
حجام۔ نہیں مہاراج۔ کبھی ایسا بھی ہُوا۔
آواز۔ سوچ کیا رہے ہو؟

حجام ۔ سُنا آپ نے بھی ؟

آواز ۔ کیا ؟

حجام ۔ مہاراج اشوک نے مہاراج کمار کی آنکھیں نکلوا دیں !

آواز ۔ سچ ؟

[نقارہ اور شہنائی بجنے کی آواز]

ایک آدمی ۔ [گویا کہیں سے آیا ہے] یہ کیا ہو رہا ہے ؟ سارا تکشلا ماتم کر رہا ہے اور تم خوشیاں منا رہے ہو ؟

آوازیں ۔ کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے ؟

آدمی ۔ آنکھیں نکلوا دی گئیں ۔

آوازیں ۔ آنکھیں ؟ کس کی ؟

آدمی ۔ مہاراج کمار کی ——— مہاراج اشوک نے آنکھیں نکلوا دیں ۔

آوازیں ۔ ہیں !

آدمی ۔ اب مہاراج کمار سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہیں ۔

آوازیں ۔ کہاں ہیں وہ ؟

آدمی ۔ آ رہے ہیں ادھر ۔ مہاراج اشوک کے پاس جائینگے ۔

آوازیں ۔ پیدل ! ——— چلو ——— چلو !!

[تیز تیز چلنے کی آواز ۔ " چلو ۔ چلو " کی آواز کے ساتھ ہی دور سے ہلکی ہلکی گانے کی آواز آتی ہے ۔ آواز واضح ہوتی جاتی ہے ۔ اب گیت کی آواز صاف آ رہی ہے ——— پس منظر میں سرگوشیاں]

یہ بھو بھول بھلیاں بھاری
سُکھ کے دن بھائی اُڑ ین !
جیسے بادر بار بہیں !
اُڑت آکاش بچاری
یہ بھو بھول . .

کنال ۔ تھک گئیں مندالیکا ؟

مندالیکا ۔ نہیں سوامی ——— بہت اچھا گاتے ہیں آپ !

کنال ۔ کہاں تک پہنچے ؟

مندالیکا ۔ بڑی دُور نکل آئے ۔

آوازیں ۔ [دور سے] ہائے چلتے چلتے کیا حال ہو گیا ۔

ایک آواز ۔ ہائے بیوی کے سوا کوئی اپنا نہ رہا ۔

مندالیکا ۔ سنا سوامی ؟

کنال ۔ ہاں ——— [گاتا ہے]

موہ مایا میں دُنیا اندھی
جھوٹے سنگی ساتھ سمبندھی
جھوٹی ممتا ساری
یہ بھو بھول بھلیاں بھاری

آوازیں ۔ اس جوانی میں یہ حال . . . . حکومت کرتا کرتا بھکاری ہو گیا ——— چلو ۔ چلو بھائی ——— راستہ چھوڑ دو ——— راستہ

[گانے کی آواز دور ہوتی جاتی ہے]

سُکھ سمپت سرتا کے کنارے
ہم بھی کبھی تھے موج میں پیارے
جوبن چڑھی خماری
یہ بھو بھول . . [آواز غائب]

[خاموشی کا وقفہ]

مہاراج اشوک ۔ مہارانی !

مہارانی ۔ مہاراج !

اشوک ۔ میں فیصلہ کر چکا ۔

مہارانی ۔ کیا فیصلہ مہاراج ؟ یہ گھبراہٹ کیوں ؟

اشوک ۔ مجھے تکشلا جانا ہوگا ۔ آج ہی ۔

مہارانی ۔ کنال کے پاس

اشوک ۔ ہاں ۔ بے وفا کہیں کا ۔ اتنی مدت میں ایک خط بھی نہ لکھا ۔ باپ کا دل پتھر کا دل نہیں ہوتا ۔

مہارانی ۔ مہاراج اس عمر میں تکشلا جانا آپ کے لئے ٹھیک نہیں ۔ کتنا کٹھن راستہ ہے ۔

اشوک ۔ ہونے دو ۔

مہارانی ۔ آپ نہ جا سکیں گے ۔

اشوک ۔ اس کی یاد مجھے لے جائیگی ——— ٹھہرنا مہارانی [اس وقت دور سے ہلکی ہلکی گانے کی آواز]

موہ مایا میں دُنیا اندھی
جھوٹے سنگی ساتھ سمبندھی
جھوٹی ممتا ساری

اشوک ۔ یہ کون گا رہا ہے ؟

مہارانی۔ کوئی بھکاری ہوگا۔

اشوک۔ محل کے نیچے ——— مگر یہ لوگوں کی آواز کیسی ؟

مہارانی۔ مہاراج چھوڑیئے بھی ——— کوئی ہوگا۔

اشوک۔ اس کی آواز کنال کی آواز سے بہت ملتی جلتی ہے

مہارانی (قہقہہ) مہاراج آپ اس بے چینی اور گھبراہٹ میں اپنے بیٹے کی آواز بھی بھول گئے !

اشوک۔ ٹھہرو مہارانی ——— کھڑکی کھولو !

مہارانی۔ مہاراج۔ ادھر آیئے۔ سُنئے تو۔

[کھڑکی کھولنے کی آواز ——— اب گانے کی آواز اونچی ہو جاتی ہے]

سنگھ میت ترنا کے کنارے
ہم بھی کبھی تھے موج میں پیارے
جوبن چڑھی نماری

آج وُہی بھوکا کنگال !
نیناں ہیں دُکھی بیحال
پھرت کُنال بھکاری
یہ بھو بھول بھلیاں بھاری

مہاراج۔ (چلا کر) ہائے۔ مہارانی۔ میرا کُنال اندھا۔ ہائے میرا کُنال چھوڑ دے۔ مجھے جانے دے۔ (جلد جلد جانے کی چاپ)

مہارانی۔ رکشیانا۔ رکشیانا۔ ہائے اب کیا ہوگا ؟

رکشیانا۔ کیا ہوا تشیاری ؟

مہارانی۔ رکشیانا راز کھل گیا۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ جلدی کر۔

رکشیانا۔ آخر ہوا کیا ؟

مہارانی۔ سنتی نہیں کیا ؟ کُنال محل کے نیچے کھڑا گا رہا ہے۔

[ہلکی ہلکی آواز آرہی ہے]

نیناں ہیں دُکھی بے حال
پھرت کُنال بھکاری

بند کر دے۔ اس کھڑکی کو بند کر دے (بند کرنے کی آواز)

رکشیانا۔ اب کیا ہوگا ؟

مہارانی۔ بھاگنے کا سامان کر۔

رکشیانا۔ کہاں جائیں گے ؟

مہارانی۔ یہ بعد میں سوچا جائے گا۔ پہلے یہاں سے تو نکلنے دو۔

رکشیانا۔ کپڑے لے لوں ؟

مہارانی۔ نہیں !

رکشیانا۔ زیور ؟

مہارانی۔ بھاگنے کی کوشش بے فائدہ ہے۔ چل نیچے چل تشیاری۔

رکشیانا۔ کیا ؟

[خاموشی کا وقفہ]

[گانے کی آواز آرہی ہے]

یہ بھو بھول بھلیاں بھاری

اشوک۔ (دور سے) کُنال۔ کُنال۔ کُنال۔ ٹھہرو کُنال

کُنال۔ یہ کون بُلا رہا ہے مندالیکا۔

مندالیکا۔ آپ کے پتا مہاراج۔ پریہ درشی۔ آپ کی آنکھیں نکلوانے کا حکم دینے والے آپ کے پتا۔

اشوک (نزدیک آکر) کُنال۔ میرے بیٹے۔ کُنال۔ تیری آنکھیں یہ کیا ہوا !

کُنال۔ مہاراج !

اشوک۔ بول کُنال۔ میری آنکھوں کے نور۔ یہ بھیس ؟ یہ حال ؟

کُنال۔ آپ کا حکم ہی ایسا تھا مہاراج !

اشوک۔ میرا حکم ! کُنال کیا کہہ رہے ہو ؟

مندالیکا۔ مہاراج آپ کے فرمان کے مطابق آپ کے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ فرمان پر آپ کی مُہر۔ اُس پہ آپ کے دانتوں کے نشان۔ اب آپ شاید اس لئے خفا ہو رہے ہیں کہ ابھی تک جان کیوں باقی ہے ؟

اشوک۔ (چلا کر) مندالیکا۔ میری بیٹی۔ یہ غلط ہے۔ کونسا فرمان کس کی مُہر یہ جھوٹ ہے۔ یہ دھوکا ہے۔ مہارانی آگئی۔ دیکھ ۔ ۔ ۔ ۔

رکشیانا۔ (چلا کر فرش پر گرنے کی آواز) مہاراج۔ مہاراج۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ انصاف کی نگاہ سے دیکھئے گا۔ یہ فرمان مہارانی نے بھیجا۔ دوش مہارانی کا ہے۔ میں بے قصور ہوں مہاراج۔

اشوک۔ کیا ! مہارانی ؟ میں کیا سُن رہا ہوں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس

چڑیل نے اس ڈائن نے . . . . زندہ جلوا دوں گا۔ آج ہی . . . . ابھی

کُنال۔ مہاراج! —— مہاراج! کیا ہے مہاراج؟

اشوک۔ چلو کُنال! چلو مندا لیکا!

کُنال۔ مہاراج میں نہ جاؤں گا۔

اشوک۔ کیوں بیٹا؟

کُنال۔ تن کی آنکھیں بند ہونے سے من کی آنکھیں کھُل گئیں مہاراج۔ میں اب من کی دُنیا میں رہوں گا۔

اشوک۔ بیٹا راجاؤں کی آنکھیں پرجا کے لئے ہوتی ہیں۔

کُنال۔ مہاراج۔ اب کون راجا اور کس کی پرجا؟

اشوک۔ بیٹا اب میرے جانے کی گھڑیاں ہیں۔ اس راج پاٹ کو تمہیں سنبھالو گے۔

کُنال۔ جو سب بندھنوں کو توڑ چکا پھر اسے کیوں قید خانے میں ڈالتے ہیں مہاراج؟ چل مندا لیکا چلیں۔ میرا ہاتھ پکڑ۔

اشوک۔ بُڈھے باپ پر دیا کر دیا۔ اشوک نے دیا کی بھیک کبھی نہیں مانگی۔ مگر آج . . . .

کُنال۔ مہاراج اس اندھے بھکاری کی ایک آخری حسرت ہے۔ پوری ہو جائے گی مہاراج؟

اشوک۔ بیٹا تیرے لئے اشوک سب کچھ کر سکتا ہے۔

کُنال۔ مہاراج مہارانی کا قصور معاف کر دیجئے۔

اشوک۔ اس چڑیل کو معاف کر دوں؟ اس ڈائن کو چھوڑ دوں؟

کُنال۔ بس مہاراج یہی کہنا تھا۔

اشوک۔ کُنال! ٹھہرو، کدھر جا رہا ہے۔ تیرے لئے سب کچھ کر دُونگا۔

[زمین پر گرنے کی آواز]

کُنال۔ [گاتا ہے]

جگ کو ان مسافر خانہ
جو آیا سو ہے پر جانا
کون کُنال بھکاری

[یہ آواز دور ہوتی جاتی ہے۔ سسکیوں کی آواز آ رہی ہے]

اندر لال داس قمر

باغِ نسیم

(سری نگر کشمیر کی بہشت خاموش)

لموں فروز نظاروں کی محفلِ خاموش،
م فریب بہاروں کی محفلِ خاموش،
سبز پوش چناروں کی محفلِ خاموش،
بہشت میں بھی یہ رعنائیاں نہیں ہوں گی
اگر ہوئیں تو یہ تنہائیاں نہیں ہوں گی

ہے برگ برگ میں صدہا نزاکتوں کا ہجوم
ہر شجر میں ہزاروں لطافتوں کا ہجوم
رم قدم پہ ہے رُو پوش نکہتوں کا ہجوم
نہ خلد سے نہ ریاضِ جناں سے آئی ہے
تری فضا میں یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے

ارِ عالمِ روحانیاں ہے شام تری
زیزِ خاطرِ روشن دلاں ہے شام تری
سرورِ جان و فروغِ جہاں ہے شام تری
نگاہ نے یہ عجب خوابِ دل نشیں دیکھا
شفق کو خیمہ زنِ دامنِ زمیں دیکھا

ہوا میں رنگِ مئے آتشیں یہاں دیکھا
فضا کو آہ! بہت ہی حسیں یہاں دیکھا
غرورِ خلد کو عزلت گزیں یہاں دیکھا
یہیں رہا ہے مسلسل قیام حوروں کا
ہنوز عطرفشاں ہے خرام حوروں کا

فلک سے زہرہ جبینوں کے کارواں آئے
حریمِ حسن دلآرا کے رازداں آئے
دلوں میں لے کے ترا شوقِ بیکراں آئے
اٹھا سکا نہ کوئی گوشۂ نقاب ترا
نظارہ سوز رہا عالمِ حجاب ترا

فروغِ ماہ کو تجھ پر نثار بھی دیکھا!
بہار میں تجھے جانِ بہار بھی دیکھا!
کبھی کبھی تجھے بے اختیار بھی دیکھا!
مگر نہ حسرتِ دیدار نے سکوں پایا
کہ ہر نظر میں ترے حسن کو فزوں پایا

وہ تیری بزمِ حجابات، آہ کیا کہئے،
خموشیوں کے پیامات، آہ کیا کہئے،
وہ اشتیاقِ حکایات، آہ کیا کہئے،
اگرچہ تذکرۂ عشق لب پہ لا نہ سکا
میں تجھ سے رازِ محبت مگر چھپا نہ سکا

روش صدیقی

حسیّات

ظلم پیہم سے مدعا کیا ہے
میرے دل میں ترے سوا کیا ہے

لطفِ بیدادِ ناروا کیا ہے
مصرفِ جانِ بے وفا کیا ہے

قیدِ ہستی کا کچھ سبب نہ کھلا
مجھ گنہگار کی خطا کیا ہے

جب کہ تو خود ہے قادرِ مطلق
میری ہستی سے مدعا کیا ہے

یہ فضائے بسیط کیسی ہے
ماہ و پرویں ہیں کیا سُہا کیا ہے

یہ سکوتِ شب اور یہ تارے
یہ سحر گاہِ خوش نما کیا ہے

یہ گل و لالہ یہ ہوائے چمن
یہ تمنائے جاں ربا کیا ہے

لطفِ نظارہ جب میسر ہے
یہ غمِ صبر آزما کیا ہے

زندگی جب کہ جاودانی ہے
موت کیا چیز ہے فنا کیا ہے

کب سے ہوں مائل غزل خوانی
کون سمجھے کہ مدعا کیا ہے

اُن کی باتیں سُنی نہ تھیں جب تک
کس کو معلوم تھا خدا کیا ہے

تم سے ناکامیوں کی داد ملے
اور عاشق کا مدعا کیا ہے

ہم نہ واعظ کو آج تک سمجھے
راہزن ہے کہ رہنما، کیا ہے

بات کیا بے خودی میں کہہ بیٹھے
شہر میں ذکر جابجا کیا ہے

خلوتِ دل دکھا نظیرؔ انہیں
چاہِ کنعاں ہے کیا حرا کیا ہے

اصغر حسین خاں نظیرؔ

فرشتہ

کبھی کبھی ساشکا زندگی کے چکر سے بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے ہر روز صبح سویرے برف ایسے ٹھنڈے پانی سے منہ نہ دھونا پڑے۔ سکول جا کر جھڑکیاں نہ سہنی پڑیں۔ اور ماں کے حکم سے گھٹنوں دوزانو ہو کر تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے۔ لیکن ابھی اُس کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی اور وہ اُن طریقوں سے ناواقف تھا جن کی بدولت لوگ زندگی کے چکر سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ بدستور سکول جاتا رہا اور شام کو دوزانو بیٹھتا رہا۔ اُس کا خیال تھا کہ زندگی کبھی ختم نہ ہو گی۔

ایک سال اور گزر گیا مگر وہ سکول جاتا رہا۔ ساشکا ایک بیباک اور خود سر لڑکا تھا اور یہ تکلیفیں صبر و شکر سے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے زندگی سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اُس نے اپنے ہم سبقوں کو پیٹا۔ اُستادوں کی بے عزتی کی۔ کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ اور اپنی ماں سے کئی باتوں کے متعلق جھوٹ بولا۔ صرف اپنے باپ سے وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا تھا۔ جب وہ ایک لڑائی میں کسی سے پٹا۔ تو اُس نے بغیر آنسو بہائے اس قدر زور زور سے چلانا شروع کر دیا کہ لوگوں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ جب وہ جی بھر کر چلا چکا۔ تو یکایک خاموش ہو گیا اور زبان باہر نکال کر اپنی کاپی میں ایک تصویر بنانے لگا۔ جس میں وہ اپنے اُستاد کی طرف دیکھ کر چلا رہا تھا اور استاد کانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ اُس کی ساری کاپی اسی قسم کی تصویروں سے بھری پڑی تھی۔ لیکن اس میں ایک موٹی عورت کی کئی تصویریں تھیں جو ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے ایک بہت ہی پتلے دُبلے پتلے لڑکے کو پیٹ رہی تھی ان تصویروں کے نیچے لکھا تھا "معافی مانگ بدمعاش" پھر جواب تھا "ہرگز نہیں، مجھے مار ڈالو لیکن میں معافی نہیں مانگوں گا۔"

کرسمس سے پہلے ساشکا کو سکول سے نکال دیا گیا۔ اور جب اُس کی ماں نے اُسے مارا تو ساشکا نے اُس کی اُنگلی چبا ڈالی۔ اب ساشکا آزاد ہو گیا۔ اور اُس نے صبح سویرے منہ دھونا چھوڑ دیا۔ وہ سارا سارا دن دوسرے لڑکوں سے کھیلتا اور لڑتا جھگڑتا رہتا۔ سوائے بھوک کے وہ کسی چیز سے نہ ڈرتا تھا۔ اُس کی ماں نے اُسے کھانا دینا بند کر دیا تھا۔ لیکن اُس کا باپ اُس کے لئے روٹی وغیرہ چھپا رکھتا تھا۔ ساشکا نے نتیجہ نکالا کہ ان حالات میں زندگی گذارنا کچھ خاص مشکل کام نہیں ہے۔

کرسمس سے پہلے جمعہ کے دن ساشکا دیر تک لڑکوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ رات ہو گئی اور ایک گہری دُھند چھا گئی۔ جب وہ گھر پہنچا تو اُس کی ماں نے اُسے مارنے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر پوچھا: "تم اتنی دیر کہاں رہے"

وہ اپنی آستینیں چڑھانے لگی۔ اُس کے موٹے موٹے سفید بازو نظر آنے لگے۔ اور چپٹے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ساشکا نے نفرت سے ناک بھوں چڑھائی اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا جب وہ ماں کے پاس سے ہو کر گذرا تو اُسے شراب کی سخت بدبو آئی۔

دوسرے کمرے میں اُس کا باپ بیٹھا ہوا۔ مشکل سے سانس لے رہا تھا اُسے سردی لگ رہی تھی اور وہ اس وقت لحاف اوڑھے سکڑا ہوا اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "ساشکا صوفیہ کے خاندان والوں نے تمہیں کرسمس منانے کے لئے اپنے ہاں مدعو کیا ہے۔ ابھی ابھی ایک نوکر پیغام لے کر آیا تھا۔"

ساشکا نے حیرت سے پوچھا: "مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں ہاں تمہیں۔ گو تمہاری ماں نے تمہیں بتایا نہیں لیکن اُس نے تمہارے کپڑے تیار کر رکھے ہیں۔"

ساشکا بہت حیران ہوا۔ صوفیہ کے خاندان والوں نے جن کی وساطت سے وہ سکول میں داخل ہوا تھا۔ اُس کے سکول سے نکلنے کے بعد سے اُس کا اپنے ہاں آنا جانا بند کر دیا تھا وہ کہنے لگا۔ "لیکن میں تو اُن کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر ناراض ہوں گے۔ اور مجھے بُرا لڑکا کہیں گے۔"

اُس کا باپ خاموش بیٹھا کانپ رہا تھا۔ دوسرے کمرے سے ایک مدہم سی روشنی اُس کی آنکھوں اور پیشانی پر پڑ رہی تھی۔ ایک زمانہ

تھا کہ وہ ہر وقت شراب پی کر مست رہتا تھا۔ اور اُس کی بیوی اُس سے خوف
کھاتی اور نفرت کرتی تھی۔ لیکن جب اُس کے پھیپھڑوں سے خون آنے
لگا۔ اور اُس نے شراب نوشی ترک کر دی تو اُس کی بیوی شراب پینے لگی
اور اپنے خاوند سے اُن تمام تکالیف کا بدلہ لینے لگی جو اُسے اُس کے
ہاتھوں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ وہ جب کبھی پیتا تو ایسے الفاظ استعمال کرتا
جو وہ بیچاری بالکل نہ سمجھ سکتی۔ وہ گھر میں لمبے لمبے بالوں والی بیسوائیں لے
آتا اور داد عیش دیتا۔ لیکن اُس کی بیوی نے ایسا نہ کیا۔ وہ جوں جوں شراب
پیتی زیادہ اچھی بنتی جاتی۔ وہ جو جی میں آتا کہتی۔ عورتوں اور مردوں کو گھر
پر مدعو کرتی اور اُن کے ساتھ مل کر خوب ناچتی گاتی۔ اس عرصہ میں اُس کا
خاوند ساتھ والے کمرے میں لیٹا اُن کی زندگی کی تباہ حالی اور بے انصافی
کے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ اُس کی بیوی سے جو کوئی ملتا وہ یہی
کہتی کہ اُس کا خاوند اور بیٹا دونوں اُس کے بدترین دشمن ہیں۔

وہ ساشکا سے کہنے لگی: "اور میں کہہ رہی ہوں کہ تمہیں وہاں جانا
ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی مٹھی بند کر کے میز پر مارنے لگی۔ جس پر
رکھے ہوئے شیشے کے گلاس جھن جھن بجنے لگے۔

ساشکا نے سرد مہری سے جواب دیا: "اور میں کہتا ہوں کہ میں
ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

اُس نے منہ بنایا۔ اور دانت دکھائے۔ سکول میں اس عادت
کی وجہ سے اُس کا نام بھیڑیئے کا بچہ پڑ گیا تھا۔ اس کی ماں چلائی۔
"میں تمہیں ماروں گی۔ ایسا ماروں گی کہ یاد ہی کرو گے۔"

"اچھا، مار کے دیکھ لو۔"

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک ایسے بیٹے کو مارنا ناممکن ہے
جو اُنگلی چبا ڈالتا ہے۔ اور اگر وہ کان پکڑ کر اُسے گھر سے نکال دے
تو وہ وہاں نہیں جائے گا۔ بلکہ ساری رات آوارہ گردی کرتا رہے گا۔
اور سردی سے ٹھٹھر جائے گا۔ اس لئے اُس نے یہی بہتر جانا کہ اُس
کے باپ سے کہے۔ اُس کے باپ نے پوچھا "ساشکا تمہیں کیا ہو
گیا ہے۔ تمہیں ضرور جانا چاہیئے۔ شائد اس طرح تم پھر سکول میں لے
لئے جاؤ۔ وہ لوگ بہت نیک دل ہیں۔"

ساشکا ہنسنے لگا۔ عرصہ ہوا جب کہ وہ پیدا ابھی نہ ہوا تھا۔ اُس کا
باپ صوفیہ کا اتالیق تھا اور اُسی زمانے سے وہ اُنہیں دنیا کے نیک دل
لوگ سمجھتا تھا۔ اُن دنوں وہ ایک دفتر میں ملازم تھا اور ابھی اُسے شراب
کی لت نہ پڑی تھی۔ جب اُس کی شادی ہوگئی تو اُس نے کام کاج
چھوڑ دیا۔ اور شراب نوشی شروع کر دی۔ ایک مرتبہ مدہوشی کی حالت
میں گرفتار بھی ہو گیا۔ وہ لوگ روپیہ پیسہ سے اُس کی مدد کرتے رہے
اور اُس کی بیوی گو اُن سے نفرت کرتی تھی جیسا کہ وہ کتابوں اور ہر اُس
چیز سے نفرت کرتی تھی جس کا تعلق اُس کے خاوند کی گزشتہ زندگی
سے تھا۔ لیکن اس دوستی کو غنیمت جانتی تھی۔ ساشکا کے باپ نے
کہا: "شاید تم وہاں سے میرے لئے کچھ لا سکو۔"

ساشکا اپنے باپ کا مطلب سمجھ گیا۔ اور اس کمزوری کے لئے
اُس کی طرف حقارت سے دیکھنے لگا۔ گو وہ چاہتا تھا کہ اپنے بیمار
باپ کے لئے وہاں سے ضرور کچھ لائے جس نے مدت سے عمدہ تمباکو
نہ پیا تھا۔ اُس نے آہستگی سے کہا: "اچھا میں جاؤں گا۔ میرے کپڑے
تیار کر دو۔"

(۲)

ابھی بچوں کو اُس کمرے میں جانے کی اجازت نہ ملی تھی جس
میں کرسمس کا درخت رکھا تھا۔ وہ باہر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے
تھے۔ ساشکا اُن کی باتیں سنتا رہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ
کے اُن ٹکڑوں سے کھیلتا رہا جو اُس نے وہاں سے اُٹھا کر جیب
میں ڈال لئے تھے۔ صوفیہ کے خاندان کا سب سے ننھا بچہ کولیا اُس
کے قریب آیا اور اپنے مُنہ میں اُنگلی ڈال کر تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ چھ
مہینے ہوئے کولیا نے اپنے والدین کے متواتر سمجھانے پر منہ میں اُنگلی
ڈالنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا کرنے سے وہ باز نہ
رہ سکتا تھا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ جو اُس کے کندھوں پر پڑتے
تھے۔ اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اور حقیقت میں یہ اُس قسم کا بچہ تھا جسے
تنگ کرنا ساشکا کا محبوب مشغلہ تھا۔

کولیا نے پوچھا: "کیا تم خراب لڑکے ہو۔ میری انّا کہتی ہے کہ
تم بہت خراب ہو۔ میں بڑا اچھا لڑکا ہوں۔"

ساشکا نے اُس کی مخملیں برجس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا: "ہاں
ہاں تم بڑے نیک لڑکے ہو۔"

کوّیا نے اُسے ایک بندوق دے کر جس کی نال میں ایک کارک لگا تھا
پوچھا: "یہ بندوق تمہیں پسند ہے؟"
ساشکا نے وہ لے لی اور کوّیا کی ناک کا نشانہ باندھ کر گھوڑا
دبا دیا۔ کارک اُس کی ناک پر لگا اور پھر آگے سے لٹکنے لگا۔ کوّیا کی نیلی
آنکھیں کھُل گئیں اور اُن میں آنسو بھر آئے اور وہ بولا ۔ "بدمعاش"
اتنے میں کمرے میں ایک نوجوان اور خوبصورت عورت داخل
ہوئی۔ اس کا نام صوفیہ تھا اور یہ عزیزان کی بہن تھی۔ ساشکا کا باپ کبھی
اس کا اتالیق تھا۔ اُس نے اپنے ساتھ والے مرد سے کہا۔ "یہ ہے
وہ لڑکا، کہو ساشکا تمہارا کیا حال ہے۔ تمہیں بدتمیزی چھوڑ دینی چاہئیے"
لیکن ساشکا نے اُن دونوں میں سے کسی کو سلام تک نہ کیا۔ صوفیہ
کو گمان تک نہ تھا۔ کہ ساشکا سب کچھ جانتا ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور جانتی
تھی کہ کبھی اُس کے باپ کو اُس سے از حد محبت تھی۔ اور اُس نے ایک
اور سے شادی کر لی تھی۔ اور گو ساشکا کے باپ نے اپنی محبوبہ سے پہلے
شادی کر لی تھی۔ لیکن ساشکا کے خیال میں اس عورت نے اُس کے
باپ سے بیوفائی کی تھی۔ صوفیہ کہنے لگی۔ "بُری تربیت! کیا تم اِسے پھر
سکول میں داخل نہیں کرا سکتے پلاٹن! میرے خاوند کا خیال ہے کہ اس کے
لئے یہ بہتر ہے کہ اِسے کسی صنعتی سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ کیا تمہیں
صنعتی سکول پسند ہے ساشکا!"
ساشکا نے کہا۔ "نہیں"
اُس مرد نے پوچھا۔ "کیا تم کسان بننا پسند کرو گے؟"
"نہیں"
"تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"
ساشکا کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ وہ مرد اس
عجیب و غریب لڑکے کو دیکھ کر بڑا پریشان ہوا۔ اور اُس نے اُس کی
طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ ساشکا نے زبان نکال کر پھر اتنی جلدی مُنہ
میں ڈال لی۔ کہ صوفیہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ لیکن وہ اُدھیڑ عمر کا آدمی سخت
برافروختہ ہو گیا۔ ساشکا نے کہا۔ "میں صنعتی سکول میں داخل ہونا چاہتا ہوں"
صوفیہ اُس کے اس ارادہ سے بہت خوش ہوئی۔ اور ایک آہ
بھر کر سوچنے لگی کہ محبت کی یاد بھی دلوں پر کیا اثر چھوڑ جاتی ہے۔
اُس مرد نے ساشکا سے آنکھیں نہ ملاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت کم
چھٹیاں ملیں گی۔ ہم تمہارے لئے جو کچھ بھی کر سکیں گے کریں گے۔"

بچے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور درخت کے انتظار میں بےصبری
سے شور مچا رہے تھے۔ ساشکا کی بندوق والی شرارت سے دوسرے
لڑکوں کی رگ بھی پھڑک اُٹھی۔ اور اُنہوں نے اُس کی پیروی شروع کر دی
اور کئی لڑکوں کی ناکیں سُرخ کر دیں۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں اور تالیاں بجانے
لگیں۔ یکایک دروازہ کھُلا اور کسی نے کہا۔ "بچو اب تم اندر جا سکتے
ہو۔ لیکن آرام سے جانا۔"
بچے بڑے اشتیاق سے روشن کمرے میں جانے لگے اور اُس
درخت کے قریب پہنچے۔ جس میں کئی شمعیں روشن تھیں۔ چند منٹوں
تک وہ خاموش رہے پھر یکایک بولنے لگے۔ ایک لڑکی اپنی مسرت
کے جوش کو نہ دبا سکی اور ناچنے لگی۔ ایک اور لڑکی نے بھی ایسا ہی کیا
ساشکا خاموش تھا۔ اُس کا شریر دماغ چاہتا تھا کہ وہ کوئی شرارت کرے۔
وہ درخت کی شمعوں سے جو روشنی نکل رہی تھی اُس سے مسحور ہو رہا تھا
اُس کے لئے یہ عجیب چیز تھی اور اُسے اس سے نفرت سی تھی۔ جس طرح
اُسے اچھے کپڑوں والے بچوں سے نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس درخت
کو اُن کے سروں پر گرا دے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی آہنی ہاتھ
اُس کے دل کو پکڑ رہا ہے اور اُس کے دل کا آخری قطرہ نچوڑ لینا چاہتا ہے
وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور بے خبری میں اپنی جیب میں ڈالے
ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو توڑنے لگا۔ اور خیال کرنے لگا کہ اُس
کے بھی ماں باپ ہیں۔ گھر ہے پھر اُس نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا میں
اُس کا کوئی نہیں۔ یکایک اُسے اپنے قلمتراش کا خیال آیا۔ جس سے
اُسے بہت ہی لگاؤ تھا۔ کل وہ اُسے پھینک دے گا اور پھر اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔
لیکن یکایک ساشکا کی آنکھیں حیرت سے چمک اُٹھیں۔ درخت
کا وہ حصہ جو اُس کی طرف تھا۔ ذرا کم روشن تھا۔ اُس نے اس میں
ایک عجیب چیز دیکھی۔ جس کے بغیر اُسے دنیا کی ہر چیز بے معنی دکھائی
دینے لگی۔ یہ ایک موم کا بنا ہوا فرشتہ تھا۔ جو تاریک شاخوں میں
بے پروائی سے لٹکا ہوا تھا۔ اور ہوا میں جھُول رہا تھا۔ اُس کے
چمکیلے پر روشنی میں چمکتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے
اور اُڑ رہا ہے۔ اُس کی نازک نازک اُنگلیوں والے گلابی ہاتھ اُس
کے سر سے بلند تھے۔ اور اُس کے بالوں کی رنگت کوّیا کے بالوں کی سی
تھی لیکن اس میں کوئی ایسی بات تھی جو کوّیا میں نہ تھی۔ فرشتے کا چہرہ نہ تو مسرت
سے منور تھا۔ اور نہ غم سے پژمردہ اس میں ایک ایسی بات تھی جس کی تعریف کے لئے الفاظ

نہیں مل سکتے تھے۔ ساشکا کو معلوم نہ تھا کہ کونسی پوشیدہ طاقت اُسے فرشتہ کی طرف کھینچ رہی ہے لیکن اُسے ایسا معلوم ہوُا کہ وہ مدت سے اُسے جانتا ہے۔ اور اُسے چاہتا ہے۔ اپنے قلتراش، اپنے باپ اور دنیا کی ہر شے سے زیادہ چاہتا ہے۔ غیر ارادی طور پر ساشکا نے دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ کر کہا "پیارے ——— پیارے فرشتے!"

جتنے غور سے ساشکا فرشتہ کی طرف دیکھتا اتنا ہی فرشتہ اُسے پیارا معلوم ہوتا۔ وہ اُس کے گردو پیش کی ہر چیز سے مختلف تھا دوسرے کھلونے اس بات پر مسرور معلوم ہوتے تھے کہ وہ زیادہ روشن حصوں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا فرشتہ روشنی میں آنے سے گھبراتا ہے اور اسی لئے اُس نے اپنے آپ کو ایک تاریک کونے میں چھُپا رکھا تھا۔ تاکہ اُسے کوئی بھی نہ دیکھ سکے۔ اُس کے نازک پر دل کو چھُونا ایک ظلم ہوگا ساشکا نے پھر آہستہ سے کہا "میرے پیارے پیارے فرشتے!"

ساشکا فرشتے سے خوف زدہ ہوگیا اور بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ وہ فرشتہ کی طرف بالکل نہ دیکھتا تھا۔ تاکہ دوسرے لڑکوں کی توجہ اُدھر نہ ہو جائے۔ لیکن وہ اُس کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اُڑ نہیں گیا۔ میزبانہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ بچوں نے اُسے گھیر لیا۔ وہ لڑکی جو ناچ رہی تھی اُس کے ہاتھ سے چمٹ گئی۔ ساشکا بھی اُس کے قریب گیا اور اپنے خیال میں بڑے اخلاق سے کہنے لگا۔ "چچی! چچی!"

اُس نے بالکل نہ سُنا۔ اُس نے بے صبری سے اُس کا لباس کھینچا۔ وہ حیرت سے بولی۔ "کیا بات ہے؟ تم میرے کپڑے کیوں کھینچ رہے ہو؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"چچی جان، وہ فرشتہ مجھے دے دو"

اُس نے آرام سے جواب دیا "نہیں میں نہیں دے سکتی۔ یہ درخت نئے سال تک اسی طرح رہے گا۔ یہ کیا بات ہے، تم کوئی ننھے بچے تو نہیں ہو۔"

ساشکا کو محسوس ہوُا کہ وہ کسی گہرے گڑھے میں گر رہا ہے۔ اُس نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں شریر تھا۔ اب میں شرارت نہیں کروں گا۔"

لیکن اس چال نے جو اُس کے اُستادوں کے حق میں ہمیشہ مؤثر ثابت ہوئی تھی۔ اس عورت پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ کہنے لگی "تم شریر ہی نہیں بلکہ چالاک بھی ہو۔"

ساشکا نے پھر کہا۔ "فرشتہ مجھے دے دو۔"

"میں نہیں دے سکتی، اور نہ دوں گی۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

لیکن ساشکا اس پر بھی نہ سمجھ سکا اور جب وہ عورت دروازے کی طرف چلی تو وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اُس کے دل میں اس وقت ایک لڑکے کا خیال آگیا۔ جس نے اپنے استاد سے ایک درخواست کی تھی۔ درخواست نامنظور کر دی گئی تھی۔ اور وہ لڑکا دو زانو ہوکر ہاتھ جوڑ کر منت کرنے اور رونے لگا تھا۔ استاد بہت ناراض ہوا تھا۔ لیکن اُس نے درخواست منظور کر لی تھی۔ ساشکا نے اپنی تصویروں والی کاپی میں اس واقعے کی تصویر بنا کر اس کو گویا بزعم خویش بقائے دوام دے دی تھی۔ اور اب اُسے ایسا معلوم ہوُا۔ کہ اُس کی مصیبت کا واحد حل یہی ہے۔ اس لئے اُس نے پھر اُس عورت کا لباس پکڑ لیا۔ اور جب وہ پلٹی تو دو زانو ہوکر اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ رو نہ سکا۔ وہ عورت کہنے لگی۔ "کیا تم پاگل ہو گئے ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ساشکا کی آنکھیں اُس کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے کہا۔ "فرشتہ مجھے دے دو۔"

اُس عورت نے جلدی سے جواب دیا "اچھا، اچھا، تمہیں مل جائیگا لیکن تم کتنے بیوقوف لڑکے ہو۔ اب اُٹھو۔ پھر کبھی کسی کے سامنے دو زانو نہ بیٹھنا۔ اس سے انسان ذلیل ہو جاتا ہے۔ صرف خدا کے سامنے دو زانو ہونا چاہیئے۔"

ساشکا نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ جب اُس نے وہ فرشتہ درخت سے اُتارا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں یہ عورت فرشتے کو توڑ نہ دے۔ اُس عورت نے ایسی خوبصورت چیز کو ایسے خراب لڑکے کو دینے پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "کیسا اچھا بنا ہوا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اسے اس جگہ کس نے لٹکایا اچھا اب میری بات غور سے سنو۔ تم اس کھلونے کو لے کر کیا کروگے؟ تمہیں پتہ ہے کہ تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ تمہارے یہ کس کام آئے گا۔ تم اُن باتصویر کتابوں میں سے ایک لے لو۔ میں نے کولیا سے وعدہ کیا تھا۔ کہ یہ فرشتہ اُسے دے دُونگی۔ اُس نے بڑی منت کی تھی۔"

ساشکا کی روحانی تکلیف زیادہ ہو گئی۔ اور وہ دانت پیسنے لگا۔ وہ عورت اس نظارے سے خوف زدہ ہو گئی۔ اس لئے اُس نے وہ کھلونا

اُس کے حوالے کردیا اور کہا۔" یہ لو۔ تم کتنے ضدی لڑکے ہو!"
ساشکا نے فرشتے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن اُس کی گرفت اتنی ڈھیلی اور نرم تھی کہ فرشتہ ہوا میں اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے سینے سے ایک لمبی گہری آہ نکلی اور دو آنسو اُس کی آنکھوں میں آکر رُک گئے۔ اُس نے فرشتہ کو سینے سے لگا لیا اور اُس عورت کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُسے جنت کی ساری خوشیاں مل گئی ہیں۔ جب فرشتے کے چمکدار پر ساشکا کے سینہ کے ساتھ لگے تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی عجیب بات ہو گئی ہے ایسا واقعہ جو اس سے پہلے اس غموں، مصیبتوں اور گناہوں سے بھری ہوئی دنیا میں کبھی نہیں ہوا۔ ساشکا نے ایک آہ بھری اور فرشتے کے سامنے وہ چمکدار درخت اُس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس قلیل وقفہ میں ہر ایک نے دیکھا۔ کہ اُس شریر لڑکے میں جو خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو رہا تھا اور فرشتے میں کتنی مشابہت ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں یہ نظارہ بالکل بدل گیا۔ ایک شکاری چیتے کی طرح ساشکا اُچھلا۔ اور شرارت سے لبریز آنکھوں سے ہر ایک کی طرف دیکھنے لگا۔ اور کہنے لگا۔" میں گھر جا رہا ہوں۔ اپنے والد کے پاس"

(۴)

اُس کی ماں سو رہی تھی۔ اور سارا دن کام کرنے اور شراب پینے کے بعد آرام کر رہی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی انگیٹھی جل رہی تھی اور اُس کی عجیب مدہم روشنی ساشکا اور اُس کے باپ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ساشکا اُس فرشتے کو ہاتھ میں لئے باپ سے دُور کھڑا تھا تاکہ وہ اُسے چھو نہ لے۔ اُس نے آہستہ سے کہا" کیا تمہیں یہ پسند ہے؟"

اُس کے باپ نے متفکرانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔
"ہاں، اس میں کوئی خاص بات ہے؟"
باپ بیٹے دونوں کے چہروں سے مسرت کی یکساں جھلک نمایاں تھی۔ باپ بولا۔" دیکھنا! کہیں یہ اُڑ نہ جائے۔"
ساشکا نے جواب دیا۔" نہیں یہ نہیں اُڑے گا۔ اس کے پر تو دیکھو۔ لیکن انہیں چھونا نہیں!"
باپ نے ہاتھ ہٹا لئے اور غور سے فرشتہ کے خدوخال دیکھنے لگا

ساشکا نے آہستہ سے کہا۔" دیکھو ابا تمہیں ہر چیز کو ہاتھ لگانے کی عادت ہے ایسا نہ ہو تم اِسے توڑ دو۔"

دیوار پر دونوں کے جھکے ہوئے سروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ باپ فرشتہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جو اُس کی نظروں کے سامنے بڑھتا جاتا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ پہلے سے زیادہ چمکیلا دکھائی دیتا تھا۔ اور اُس کے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اور اُس کے گرد و پیش کی ہر چیز گم ہو رہی تھی۔ اس غریب غم نصیب انسان کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ اُسے اُس دُنیا سے ایک آواز آ رہی ہے جس میں کبھی وہ رہا کرتا تھا اور جس سے اُسے ہمیشہ کے لئے جلا وطن ہونا پڑا تھا۔ وہاں گندگی کا نام و نشان تک نہیں۔ نہ پریشانی ہے نہ غم۔ اُس دنیا کے باشندوں کو اُس شخص کی تکلیف کی خبر نہیں۔ جسے بازار میں گرفتار کر کے تھانے میں لے جایا جائے۔ وہ سب نیک اور مسرور ہیں اور یہ نیکی اُس عورت کے سینہ میں پناہ گزیں ہے جس سے کبھی اُسے محبت تھی۔ اور جسے کھو کر اُس نے یہ زندگی شروع کی تھی۔ موم کی خوشبو میں جو اُس کھلونے سے نکل رہی تھی۔ ایک اور خوشبو بھی ملی ہوئی تھی اور اس دُہری خوشبو سے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس عورت کی نازک اُنگلیاں فرشتہ کو چھو رہی ہیں۔ وہ اُنگلیاں جنہیں وہ مرتے دم تک ایک ایک کے چومنا چاہتا تھا۔ اُس کے خیال میں یہ کھلونا محض اس وجہ سے حسین تھا کہ اُس نے اپنی اُنگلیوں سے اُسے چھوا تھا اور اُس میں سے یہ خاص قسم کی خوشبو آ رہی تھی۔ فرشتہ آسمان سے نازل ہوا تھا۔ اور اُس نے اس دُھندلے کمرے میں بیٹھے ہوئے غم نصیب انسان کے قلب کو ایک لطیف جذبے سے لبریز کر دیا تھا۔ اُس انسان کے قلب کو جس سے محبت، مسرت اور زندگی ـــــ سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اور اُس انسان کی آنکھوں کے قریب، جس نے زندگی کی کئی بہاریں دیکھی تھیں۔ اُس لڑکے کی نظریں فرشتہ پر گڑی تھیں۔ جس نے زندگی میں قدم رکھا تھا، اُس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل اُس کی دُکھی باپ، اُس کی سخت مزاج ماں اور گالیوں کی بوچھاڑ اور ذلتوں سے لبریز تھا۔ ساشکا کے خواب عجیب بے جوڑ سے تھے۔ لیکن اُس کا قلب بڑی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ اور وہ فرشتہ کی محبت اور خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔

باپ بیٹا ایک دوسرے کو بالکل نہیں دیکھ رہے تھے۔ اُن کے بیمار دل ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ لیکن دونوں کے رونے

اور ہنسنے کی وجہ مختلف تھی ۔ پھر بھی اُن کی حالتوں میں ایک قسم کی یکجہتی تھی جو اُنہیں ایک دوسرے سے وابستہ کر رہی تھیں۔ باپ نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بیٹے کی گردن پر پھیرا۔ اور بیٹے کا سر باپ کے سینہ سے لگ گیا۔ باپ نے فرشتہ پر دستور نظریں جمائے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"کیا یہ اُسی نے تم کو دیا تھا؟"

اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو ساشکا بدتمیزی سے جواب دیتا۔ لیکن وہ کہنے لگا "ہاں اور کس نے دینا تھا؟"

دونوں خاموش ہو گئے۔ دوسرے کمرے سے کوئی آواز آئی اور گھڑی نے تین بجائے۔ باپ نے پوچھا "ساشکا کیا کبھی تم نے خواب دیکھا ہے؟"

ساشکا نے کہا "ہاں ایک مرتبہ ضرور دیکھا تھا کہ میں ایک چھت سے نیچے گر پڑا ہوں۔ ہم پرندوں کے گھونسلے اُتار رہے تھے"۔

"میں ہمیشہ خواب دیکھا کرتا ہوں۔ حیرت انگیز خواب، جن میں مجھے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسے جیتے جاگتے ہیں ---- اور ایسا ہی غم بھی ہوتا ہے"۔

پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ساشکا نے دیکھا کہ اُس کا باپ رو رہا ہے اُس نے سسکی لیتے ہوئے کہا "ساشکا، ساشکا، اس کا کیا مطلب ہے؟"

ساشکا نے آہستہ سے پوچھا "کیا ہوا ابا! یہ تم رو کیوں رہے ہو؟"

اُس کی والدہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی، وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ اُنہیں نیند آ رہی تھی لیکن پہلے وہ فرشتہ کو کسی مناسب جگہ پر سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زمین پر نہ ٹھیر سکتا تھا۔ اس لئے اُسے دھاگہ باندھ کر لٹکا دیا گیا۔

دونوں باپ بیٹا اُسے دیکھ رہے تھے۔ ساشکا نے اپنے کپڑے ایک کونے میں پھینک دیئے۔ اور چت لیٹ گیا تاکہ فرشتے کو دیکھتا رہے اُس کے والد نے کانپتے اور لحاف اوڑھتے ہوئے پوچھا "تم کپڑے اُتار کر کیوں نہیں سوتے؟"

"میں صبح سویرے جاگنا چاہتا ہوں"۔

وہ یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ وہ سونا ہی نہیں چاہتا۔ لیکن وہ یہ کہنے نہ پایا تھا کہ نیند نے اُس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اُس کے تھوڑی دیر بعد اُس کا باپ بھی سو گیا۔ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کمرے میں چپ چاپ رہی۔ ایک سکون تھا۔ اور غم نصیب باپ اور بیٹے کے چہروں پر ایک عجیب سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن فرشتہ گرم انگیٹھی کے قریب ہی لٹکا ہوا تھا۔ اس لئے وہ پگھلنے لگا۔ اُس لیمپ نے جو ساشکا کے کہنے پر بجھایا نہیں گیا تھا۔ کمرے کو مٹی کے تیل کی بُو سے بھر دیا تھا۔ فرشتے کی گلابی ٹانگیں پگھل پگھل کر بستر پر گرنے لگیں۔ اور مٹی کے تیل کی بدبو میں موم کی بُو بھی مل گئی۔ اب فرشتہ نے اپنے پر پھڑپھڑائے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اُڑنا چاہتا ہے اور بڑے آرام سے جلتی ہوئی انگیٹھی میں گر پڑا۔ ایک عجیب سا شعلہ اُٹھا اور پھر فرشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

دن نکل آیا کمرے میں روشنی داخل ہو رہی تھی۔ اور سردی سے ٹھٹھرا ہوا سقہ مشکیزہ لئے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹا رہا تھا۔

(لیونڈ اینڈریف) سراج الدین احمد نظامی

کھانسی اور پھیپھڑے کی تمام
تکالیف سے نجات حاصل کیجئے
یقینی اور صاف راستہ

خلافِ اُمّید ملاقات

خلافِ اُمید آج تجھ سے مری ملاقات ہو گئی ہے
ہے صحنِ گلشن، کنارِ جُو ہے، محبّت انگیز ہیں ہوائیں
ادائیں دکھلا رہی ہیں آبِ رواں پہ مہتاب کی شعاعیں
سکوت چھایا ہوا ہے ہر سُو، تمام مخلوق سو گئی ہے

لپٹ کر اک دوسری سے لہریں ترانے الفت کے گا رہی ہیں
چل آ، گلے آج ہم بھی مل جائیں ایسے منظر کی سرخوشی میں
وہ دیکھ اندی کے پار، اُس سمت ماہِ کامل کی چاندنی میں
اُلجھ اُلجھ کر ہوا کے جھونکوں سے ٹہنیاں تھرتھرا رہی ہیں

یونہی مرے سامنے بتا کس لئے تو تصویر سی کھڑی ہے،
رہے گی کب تک یہ بے نیازی، بھرا رہے گا رُخِ منوّر
کرم کے طالب ہیں تجھ سے اے جانِ آرزو اشک دیدۂ تر
اگر تمنا ہے مجھ سے کھُلنے کی پھر عبث کیوں جھجھک رہی ہے؟

تخت سنگھ

سورج کا زوال

ستاروں کے ماہرین کے علم میں بہت ہی کم ایسے ستارے ہیں۔ جن کی جسامت کرۂ ارض سے کم ہو۔ لیکن ستاروں کی اکثریت کا جسامت کے لحاظ سے یہ حال ہے کہ ان میں کرۂ ارض جیسے ہزاروں لاکھوں کرتے سما جائیں اور پھر بھی جگہ بچ رہے۔ اور کہیں کہیں تو کوئی ایسا ستارہ بھی موجود ہے جس کی جسامت زمین سے کروڑوں درجے زیادہ ہے۔ اور اگر ہم کائنات کے کل ستاروں کا شمار کرنا چاہیں تو یوں جان لیجئے کہ ان کی تعداد اتنی ہے جتنی کہ ریت کے اُن ذرّوں کی، جو ہماری اس دنیا کے سارے سمندروں کے ساحلوں پر موجود ہیں کل اجرام سماوی کے مقابلے میں یہ کرۂ ارض جسے ہم اپنی دھرتی ماتا کہتے ہیں، ایک بے حقیقت اور ہیچ سی چیز ہے۔

اور ستاروں کا یہ ان گنت لاؤ لشکر فضا میں گردش کر رہا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو جھرمٹ بن کر ایک باقاعدہ صورت میں ایک دوسرے سے قریب قریب اور اکٹھے ہو کر اپنا سفر پورا کر رہے ہیں۔ لیکن اکثریت تنہا مسافروں کی ہے۔ اور یہ تنہا مسافر ایک ایسی وسیع خلا میں سرگرداں ہیں کہ یہ وقوعہ بے حد ناقابل تصور اور بہت ہی نادر ہے۔ کہ ان میں سے کوئی تنہا مسافر کسی دوسرے تنہا مسافر کے قریب آجائے۔ زیادہ تر ہر ایک ستارہ ایک مکمل علاحدگی میں رواں دواں ہے۔ جیسے کسی ویران سطح سمندر پر کوئی اکیلا جہاز چلا جا رہا ہو۔ اگر ہم ہر ستارے کو ایک جہاز تصور کر لیں اور ان جہازوں کے باہمی فاصلے کی اوسط نکالیں تو اس اوسط کے لحاظ سے کسی ایک جہاز کا کسی دوسرے نزدیک ترین جہاز سے جو فاصلہ ہوگا وہ دس لاکھ میل سے بہر صورت زیادہ ہی ہوگا، کم نہیں۔ چنانچہ ان کائناتی جہازوں کا کم سے کم باہمی فاصلہ جان لینے کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ایسے دو جہازوں کی ٹکر کیوں ایک نادر ترین وقوعہ ہے۔

بہر حال اس غیر معمولی نُدرت کے باوجود ماہرین کا اعتقاد ہے کہ اب سے قریباً دو ارب سال پہلے ایک نادر وقوعہ عالم شہود میں آیا۔ اور کوئی ایک ستارہ خلا میں اندھا دھند گھومتا ہوا اِس ہمارے سورج کے اس قدر قریب آگیا کہ دونوں میں آسانی سے باہم پیام رسانی ہو سکے۔ جس طرح چاند اور سورج کی وجہ سے ہماری زمین کی سطح سمندر پر جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے۔ ویسے ہی لازمی ہے کہ اس دوسرے نووارد ستارے نے سورج کی سطح پر بھی موجیں پیدا کی ہوں گی۔ کیونکہ ہر مادّی جسم میں کسی دوسرے جسم کو اپنی طرف کھینچنے کی ایک خاص طاقت چھپی ہوتی ہے۔ لیکن یہ موجیں اُن ننھی منّی بے مایہ موجوں سے کہیں مختلف ہوں گی جنہیں یہ ہمارا چھوٹا سا چاند دھرتی ماتا کے سمندروں میں پیدا کرتا ہے۔ ایک بہت بڑا زبردست سیلِ بے پناہ سورج کی سطح پر پیدا ہوا ہوگا اور آخر کار بڑھتے بڑھتے اُس طوفانی موج کی بلندی ایک بہت ہی اونچے پربت جتنی ہو گئی ہوگی اور جُوں جُوں یہ اجنبی ستارہ سورج سے قریب آتا گیا ہوگا۔ اس ہیبت ناک موج کی بلندی زیادہ ہوتی گئی ہوگی۔ اس اجنبی ستارے کے سورج سے دوری اختیار کرنے پر مقناطیسی قوت میں اتنی شدت پیدا ہو گئی ہوگی کہ وہ پربت جیسی موج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خلا میں بکھر گئی ہوگی۔ آج بھی جب ہمارے سمندروں کے ساحلوں پر چٹانوں سے ٹکرا کر موجیں بکھرتی اور پھیلتی ہوئی ایک بوچھاڑ بن کر منتشر ہو جاتی ہیں تو ایسا ہی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اُس وقت سے آج تک اس شمسی موج کے مختلف ٹکڑے اسی سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جس سے یہ علاحدہ ہوئے تھے۔ آسمان پر دکھائی دینے والے چھوٹے بڑے سیارے اسی سورج کے ٹکڑے ہیں اور اسی کا ایک ٹکڑا ہماری دھرتی ماتا ہے

سورج اور دوسرے ستارے جو ہمیں آسمان میں دکھائی دیتے ہیں بے حد گرم ہیں - یہ سب اتنے گرم ہیں کہ ان پر زندگی کسی صورت بھی برقرار نہیں رہ سکتی - سورج سے جو ٹکڑے علاحدہ ہوئے تھے ان سب کا بھی شروع میں یہی حال تھا - لیکن رفتہ رفتہ وہ ٹھنڈے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اب ان کی اندرونی گرمی بہت ہی کم ہے - اب ان سیاروں میں سورج سے مستعار لی ہوئی حرارت ہی باقی ہے - جس سے ان کے کام چلتے ہیں - رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ جب یہ کرّے ٹھنڈے ہو گئے تو ان میں سے ایک میں زندگی کی تخلیق ہوئی - لیکن یہ تخلیق کیسے ہوئی، کب ہوئی، اور کیوں ہوئی اس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں، زندگی کی ابتدا معمولی سیدھی سادی ترکیب جسمانی کی صورت میں ہوئی ان ابتدائی مرکبات میں صرف یہی اہلیت تھی کہ یہ پیدا ہوتے رہیں - اور مٹتے رہیں - لیکن اس معمولی آغاز ہی سے زندگی کا ایک دیا سرچشمہ پھوٹا جس کی پیچیدگیاں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئیں اور ارتقائے حیات کا عروج اس ہستی کی شکل میں ظاہر ہوا جس کی زندگی کی بنیاد زیادہ تر اس کی آرزوؤں، امنگوں اور احساسات پر ہے - اس کے جمالیاتی احساس ستائش پر ہے - اور ان مذاہب پر ہے جن کے ساتھ اس کی بلند ترین امیدیں اور توقعات وابستہ ہیں -

اگرچہ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے پھر بھی یہ بات بہت ممکن معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی ہستی کچھ اسی طرح وجود میں آئی ہوگی - اس ہیچ مقدار کرّے پر کھڑے ہو کر ہم اس جستجو میں ہیں کہ اس کائنات کی اصل و مقصد معلوم کریں - جس نے وقت اور خلا میں ہمارے ننھے سے گھر کو گھیر رکھا ہے - اس اتھاہ وسعت کو دیکھ کر ہم پر سب سے پہلے ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے - ہمیں یہ کائنات اس لئے ہیبتناک معلوم ہوتی ہے کہ اس میں بے معنی اور بے نہایت فاصلے ہیں - اس میں وقت کے شمار کا کچھ حساب ہی نہیں - کائناتی وقت کے مقابلے میں ساری تاریخ انسانی ایک آنکھ جھپکنے کے برابر ہے ہم پر کیوں نہ ہیبت چھا جائے - اس وسیع کائنات میں ہم بہت ہی اکیلے اور اداس سے معلوم ہوتے ہیں - اور مادی لحاظ سے بھی ہماری دھرتی ماتا خلا میں کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتی - یہ تو گویا ریت کا ایک ذرہ ہے ان تمام ذروں کے مقابلے میں جو کرۂ ارضی کے تمام سمندروں کے ساحلوں پر موجود ہیں - لیکن ان سب سے بڑھ کر کائنات کی ہیبت کی ایک اور وجہ بھی ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی صرف اس کرۂ ارض پر ہی برقرار رہ سکتی ہے - کائنات میں اور کہیں زندگی کو بار نہیں ہے - اور نہ ہو سکتا ہے - انسانی کارگذاریاں، احساسات، آرزوئیں، آرٹ اور مذاہب ان میں سے کسی کے لئے بھی اس دھرتی کے علاوہ باقی کائنات میں یکسر کوئی مقام نہیں ہے - بلکہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کائنات ہر اس قسم کی زندگی کے منافی ہے جو ہماری زندگی سے ملتی جلتی ہو - خلائے آسمانی کا زیادہ حصہ اتنا سرد ہے کہ اگر وہاں زندگی ہو بھی تو جم کر رہ جاتے - اور زیادہ اجرام سماوی اتنے گرم ہیں کہ ان پر زندگی ممکن ہی نہیں - خلا میں ہر وقت ایک حرکت جاری ہے - یا شاعرانہ زبان میں یوں کہئے کہ چرخ کج رفتار ہمیشہ گردش ہی کرتا رہتا ہے - اور اجرام فلکی مختلف قسم کی حرارت اور گردش سے پھوٹتے رہتے ہیں - یہ صورت حال زندگی کی دشمن ہے - بلکہ زندگی کے لئے تخریب کا باعث ہے -

یہ ہے وہ کائنات جس میں ہم سہواً یا کم از کم ایک ایسے واقع کے نتیجے کے طور پر جسے حادثہ کہا جا سکتا ہے اچانک نمودار ہو گئے ہیں - کرۂ ارض کی ابتدا ایک حادثہ ہے، اس پر کسی قسم کی حیرانی کی ضرورت نہیں ہے - کیونکہ حادثے تو سطح ارضی پر بھی آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں اور اگر نظام کائنات یونہی بہت عرصے تک جاری رہا تو ہوتے ہی رہیں گے - بلکہ مستقبل میں بھی ماضی ہی کی طرح ہر قسم کے حادثے کا امکان ہے - ان گنت سالوں سے ان گنت ستارے فضا میں گھوم رہے ہیں اور اس گردش کے دوران میں ہر قسم کے حادثے کا امکان ہے اور لازم ہے کہ ان میں سے ایک محدود و معین تعداد کو اس خاص قسم کا حادثہ درپیش ہو - جس کی وجہ سے نظام ہائے شمسی ظہور میں آتے ہیں - لیکن حساب لگایا گیا ہے کہ کل ستاروں کے مقابلے میں ایسے حادثات کا شمار بے حد کم ہے - نظام ہائے شمسی خلائے آسمانی میں بہت ہی کم ہیں -

نظام ہائے شمسی کی یہ ندرت ایک اہمیت رکھتی ہے - کیونکہ جہاں تک علم انسانی کا تعلق ہے اس قسم کی زندگی جو دھرتی پر موجود ہے کرۂ ارض کے قسم کے سیاروں پر ہی ممکن ہے - زندگی کی نمود کے

لئے مناسب طبعی حالات کی ضرورت ہے۔ اور ان طبعی حالات میں اہم ترین درجہ حرارت ہے وہ درجہ حرارت جس میں مختلف اجزائے صورت میں برقرار رہ سکیں۔

جتنے ستارے ہیں وہ بھی بے حد گرم ہیں اس لئے ان پر بھی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ستاروں کا تصور ہم یوں کر سکتے ہیں کہ وہ گویا آگ کے بڑے بڑے کرے ہیں جو خلا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس آب و ہوا میں حرارت مہیا کر رہے ہیں جو صفر سے چار درجے اوپر ہے . . . .

اور خلا کے اس پھیلاؤ میں جو کہکشاں کے اس پار ہے، درجہ حرارت اس سے بھی کم ہے۔ ان آتشیں کروں سے پرے کئی سو درجوں کی ایسی زبردست سردی ہے جس کا تصور ہی گویا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور ان ستاروں کے قریب یا ان کی سطح پر اتنی زبردست حرارت ہے جس میں تمام منجمد اشیا پگھل جاتی ہیں اور تمام مائع اشیا بننے لگتی ہیں۔ زندگی صرف ایک محدود درجہ حرارت کے طبقے میں ممکن ہے جو ان ستاروں کے ارد گرد ایک معین فاصلہ پر ہے۔ اس معین دور کے باہر زندگی جم کر رہ جائے گی۔ اور اس کے اندر بسر کرنا ہو جائے گی یہ قابل حیات طبقہ تمام کائناتی خلا کے مقابلے میں دس سنکھ اور ایک کی نسبت سے بھی کہیں کم کی نسبت رکھتا ہے۔ اور ان قابل حیات طبقوں میں بھی ہر جگہ زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ان میں بھی جہاں کہیں ہے زندگی ایک ندرت سی ہی ہے۔ کیونکہ سورج سے نظام شمسی کے قائم ہو جانے کا حادثہ محض حسن اتفاق ہی ہے۔ ہمارے سورج سے جدا ہو کر اس کے گرد گھومنے والے جو سیارے بن گئے ہیں۔ ایسے سیارے روز روز نہیں بنا کرتے۔ کائنات کے ستاروں میں ہر لاکھ میں سے صرف ایک اکیلا ستارہ ایسا ہوتا ہے جس کے گرد کوئی سیارہ گھوم رہا ہو۔ اور یہ بھی اس صورت ہیں کہ وہ مرکزی ستارہ اور اس کے گرد گھومنے والا سیارہ دونو اس معین قابل حیات طبقے میں ہوں، جہاں زندگی ممکنات سے ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ کائنات کے نقشہ کی تجویز بنیادی طور پر ہماری طرح کی زندگی کی خاطر عمل میں آئی ہو۔ اگر یوں ہوتا یعنی اگر نظام کائنات محض زندگی کی خاطر بنایا جاتا تو لازم تھا کہ کرۂ ارض کے علاوہ اور سیاروں پر بھی کہیں نہ کہیں زندگی ضرور ہوتی۔ پہلی نظر میں ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی تو بہت ہی غیر اہم ذیلی تخلیق ہے۔ ہم زندہ ہستیاں تو گویا مطلع ثانی ہیں۔

ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ آیا مناسب طبعی حالات بجائے خود زندگی کی تخلیق کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔ ماہرین سائنس کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جوں جوں زمین سرد پڑتی گئی یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی اور لازمی بھی کہ زندگی خود بخود پیدا ہو جائے۔ دوسرا گروہ اس خیال کو پیش کرتا ہے کہ جیسے ایک کائناتی حادثے کا نتیجہ سیاروں اور زمین کی تخلیق کا باعث ہوا۔ اسی طرح زندگی کی تخلیق کے لئے بھی کوئی نہ کوئی دوسرا ارضی حادثہ ضرور ہوا ہوگا۔ ایک زندہ جسم کے مادی اجزا بالکل معمولی کیمیائی ذرّوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک تو وہی کاربن ہوتی ہے جو کوئلے یا دھوئیں کی کالک میں پائی جاتی ہے۔ دوسرے ہائیڈروجن اور اوکسیجن جو پانی میں موجود ہے۔ تیسرے نائٹروجن جو فضا میں بہت زیادہ مقدار میں موجود ہے۔ اور اسی قسم کے اور کیمیائی جزو بھی ہوتے ہیں۔ زندگی کے لئے جس قسم کے ذرات کی بھی ضرورت تھی، لازمی ہے کہ وہ سب نوزائیدہ کرۂ ارض پر موجود ہوں گے۔ کبھی کبھی ان مختلف ذرات کا کوئی نہ کوئی گروہ اس انداز میں ایک مرکب کی شکل اختیار کر گیا ہوگا۔ اور یہ مرکب زندہ خلیئے کے مرکب کے عین مطابق ہوگا اور وقت کے ساتھ یہ ضروری بھی تھا کہ وہ کسی نہ کسی ایسی صورت میں آجاتے۔ کیونکہ متواتر مختلف مرکبات کی صورت بنتے رہنے سے کبھی نہ کبھی وہ لمحہ ضرور آسکتا ہے جب وہ ذرات ایک خاص مرکب کی صورت اختیار کر لیں۔ لیکن کیا یہی خاص مرکب ایک زندہ خلیہ ہو سکتا ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کیا ایک زندہ خلیہ محض معمولی ذرات کا ایک غیر معمولی مرکب ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے؟ کیا ایک زندہ خلیہ کی ترکیب صرف ذرات پر ہی مشتمل ہے یا ذرات اور زندگی کے ملنے سے یہ مرکب بنتا ہے؟ یہی خیال ہم ایک اور طرح بھی پیش کر سکتے ہیں۔ کیا جس طرح حسابدان دو کو دو میں جمع کر کے چار کی رقم نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ایک ماہر کیمیا ساز ضروری ذرات کی اس مخصوص ترتیب سے زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے؟ ——— اس بات کا جواب ابھی ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور جب ہمیں اس بات کا جواب مہیا ہو گیا تب ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ کیا کائنات میں زندگی سے لبریز اور دنیائیں بھی ہیں یا نہیں۔ اور اس دریافت کا شرح حیات پر ایک زبردست

اثر پڑے گا۔ یہ اثر ان انقلابات سے کہیں بڑھ کر ہوگا جنہیں فلکیات میں گلیلیو اور حیاتیات میں ڈارون نے پیدا کیا۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ زندہ مادّے کی تخلیق بہت ہی معمولی قسم کے ذرات پر مشتمل ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان ذرّات میں یوں مجتمع ہو جانے کی ایک خاص اہلیت ہوتی ہے۔ ذرّات کی اکثریت میں یہ خاصیت موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ذرّات کے ملنے سے جن مرکبات کی تخلیق کا امکان ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ ہائیڈروجن، آکسیجن یا اوزون، پانی یا ہائیڈروجن پیرا وکسائیڈ۔ لیکن ان مرکبات میں سے کسی میں بھی چار سے زیادہ ذرّے نہیں ہوتے۔ اگر ان میں نائٹروجن کا اضافہ کر دیا جائے تو بھی صورت حال قریباً وہی رہتی ہے۔ ہائیڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن، ان سب کے مرکبات میں نسبتاً بہت کم ذرّے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں کاربن کا اضافہ کیا جائے تو کیفیت یکسر بدل جاتی ہے۔ ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن کے ذرّات سے جو مرکبات تیار کئے جائیں ان میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سے بھی زیادہ ذرّے ہوتے ہیں۔ زندہ جسم کی ترکیب میں بھی اسی قسم کے مرکبات کی کثرت ہوتی ہے۔ اور یہی ایک زندہ جسم کے بنیادی اجزا ہوتے ہیں۔ ایک صدی پیشتر یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ ان کی تخلیق میں کسی خاص "قوتِ حیات" کی ضرورت لازمی ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اس قسم کے ہر ایک نظریئے کو سائنسدان اپنے تجزیاتی تجربوں سے غلط ثابت کرتے جا رہے ہیں۔ اور دیکھنے والوں کو اس نتیجے پر پہنچا رہے ہیں کہ اس مظہر کی علت طبیعیات اور کیمیا کا ایک بہت ہی معمولی سا عمل ہے۔ یہ "روح حیات" کا مسئلہ ابھی تک مکمل طور پر حل نہیں ہوا ہے۔ لیکن ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جا رہی ہے اور وہ یہ کہ زندہ اجسام کی ممتاز خصوصیّت کسی طرح کی "قوتِ حیات" نہیں بلکہ کاربن کا نہایت ہی عام سا جزو ہے۔ کیونکہ کاربن جب دوسرے ذرّات سے ملتی ہے تو غیر معمولی طور پر بڑے مرکبات بناتی ہے۔ اور یہ مرکبات ان مرکبات کی مانند ہوتے ہیں۔ جو کسی زندہ جسم میں بنیادی مواد کے طور پر شامل ہیں۔

اگر اس بات کو پختہ تسلیم کر لیا جائے تو کائنات میں زندگی کی موجودگی ایک سیدھی سی بات بن کر رہ جاتی ہے۔ یعنی کاربن کے ذرّات میں چند مقررہ خصوصیات ہیں۔ اسی لئے زندگی کو قرار ہے۔ کاربن اس لحاظ سے ایک نمایاں اور ممتاز کیمیائی مادہ ہے کہ یہ نہ تو دھات ہے۔ نہ "غیر دھات" لیکن ابھی تک کاربن کی ترکیب جسمانی میں کوئی ایسی بات دریافت نہیں ہوئی جس سے اس کے دوسرے ذرّوں کو ملانے کی وجہ سمجھ میں آ جائے۔ کاربن کے ذرّے میں چھ برقیئے ہوتے ہیں۔ اور یہ برقیئے اپنے مرکز کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مرکزی سورج کے آس پاس چھ سیارے گھوم رہے ہوں۔ کاربن سے قریبی مماثلت رکھنے والے دو اور کیمیائی اجزا بھی ہیں۔ یہ بورون اور نائٹروجن کے ذرّے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کاربن میں چھ، بورون میں پانچ اور نائٹروجن میں سات برقیئے ہوتے ہیں۔ یہ فرق کچھ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار اس فرق کو ہی زندگی کی موجودگی اور غیر موجودگی کی وجہ ٹھہرانا پڑے گا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ چھ برقیوں والے ذرّے ہی میں "حیات افروزی" کی خصوصیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر قانونِ قدرت ہی کے ماتحت ہوگی، لیکن "ریاضیاتی" طبیعیات ابھی اس مشکل کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

کیمیا کے ماہرین ہمیں زندگی کو ریڈیائی حرکت اور مقناطیسی قوت کے زمرے میں شمار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کچھ اس ڈھب پر ہے کہ اس کی تمام کارفرمائی چند خاص قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان مقررہ قوانین قدرت کے نتیجے کے طور پر ہی چند خاص برقیوں والے ذرات میں چند امتیازی خصوصیات موجود ہیں۔ اور ان امتیازی خصوصیات کی بنا پر ہی ریڈیائی حرکت، مقناطیسی قوت اور "زندگی" کا دارومدار ہے۔ خالق کل کو قادر مطلق کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُسے کسی قسم کے محدود معیّن اصولوں کا پابند نہیں ہونا چاہیئے۔ اس نے موجودہ مخصوص قوانین کے مطابق ہی کائنات کی تخلیق کیوں کی؟ ... وہ چند اور قواعد و ضوابط کے ماتحت یہ عمل کر سکتا تھا۔ اس نے یہی قوانین کیوں چنے؟ اگر وہ تخلیق کائنات کے کوئی اور اصول بناتا تو ممکن تھا کہ ان کے مطابق چند اور ذرّوں میں چند اور خصوصیات پائی جاتیں اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس صورت میں ریڈیائی حرکت، مقناطیسی قوت یا "زندگی" کا ظہور ہو سکتا یا نہیں۔ کیمیا کے ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ مقناطیسی قوت اور ریڈیائی حرکت کی مانند "زندگی" بھی

محض ایک اتفاقی نتیجہ ہو سکتی ہے ۔ ان مخصوص قوانین کا جن کے ماتحت
یہ کائنات ایک مقررہ نظام کی محکوم ہے ۔

اس جگہ ایک بار پھر اتفاقی یا حادثاتی نتیجہ کے لفظوں پر
اعتراض کیا جا سکتا ہے ۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ قادر
مطلق نے تخلیق کائنات کے لئے صرف اس وجہ سے موجودہ قوانین
قدرت کا انتخاب کیا ہو کہ انہی قوانین کا لازمی نتیجہ تخلیق حیات ہو
سکتا تھا ۔ عین ممکن ہے کہ وہ اسی صورت میں ظہور حیات کو عمل
میں لانا چاہتا ہو ۔ جب تک ہم خالق کا تصور ایک بہت بڑی
پر عظمت "انسان نما" ہستی کی خیالی صورت میں کریں جو ہمارے
ہی جیسے احساسات ' آرزوئیں اور مقاصد رکھتا ہے ہم اس
اعتراض کا جواب نہیں دے سکتے جو تخلیقِ حیات کی حادثاتی
نوعیت پر کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر
خالق کی ہستی کو ایک پر عظمت "انسان نما" ہستی ہی فرض کر لیا جائے ۔
تو پھر کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔ لیکن اگر ہم خالق کو
انسان نما ہستی فرض نہ کریں تو ہمیں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ موجودہ
قوانین قدرت کا انتخاب محض تخلیق حیات کے لئے عمل میں آیا تھا ۔ یا یہ
قوانین محض اس لئے منتخب کئے گئے تھے کہ ریڈیائی حرکت یا مقناطیسی
قوت ان کا نتیجہ ہوگی ۔ بلکہ ریڈیائی حرکت اور مقناطیسی قوت ہی کے لئے
یہ انتخاب ہوا تھا کیونکہ کائنات میں حیاتیات کی بہ نسبت طبیعیات کی
کارفرمائیاں کہیں بڑھ کر ہیں ۔ یکسر مادی نقطۂ نظر سے زندگی کی
ہیچ مقداری سے ہمیں صرف یہی خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مدعا فطرت
کا بنیادی مقصد تخلیق حیات نہیں بلکہ صرف تخلیق کائنات ہی تھا ۔
نیز جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نظام کائنات کی عملی حرکت میں نظام حیات
ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے تو ہمیں مجبوراً یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے
کہ خالق کی نظر میں کائنات ہی سب کچھ ہے ، حیات کچھ بھی نہیں ۔

نمود نوع انسانی ایک حیران کن عمل ہے اور سائنس ہمیں اس
سلسلے میں یہی کچھ بتاتی ہے جو اب تک لکھا گیا ۔ اور جب ہم ابتدائے
حیات سے گذر کر مقصد حیات پر غور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو
ہماری حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اور انجام کا تصور تو ہمیں
ایک ایسے عالم تحیر میں ڈال دیتا ہے کہ ہم سوچ کر کچھ فیصلہ کرنے کے
قابل ہی نہیں رہتے ۔ ہم یہ سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ ہماری اولاد کا
ہماری آئندہ نسلوں کا ' بنی نوع انسان کا انجام کیا ہوگا ۔

اس قسم کی زندگی جس سے ہم شناسا ہیں ، روشنی اور حرارت
کی مناسب صورت حالات میں ہی برقرار رہ سکتی ہے ۔ خود ہماری
ہستی کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ زمین سورج سے روشنی کی مناسب
اور معین مقدار ہمیشہ حاصل کرتی رہتی ہے ۔ اس مقررہ توازن میں کسی
صورت بھی فرق پیدا ہو جائے ، قلت یا کثرت تو کرۂ ارضی سے زندگی
کا معدوم ہو جانا لازم ہے ۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس توازن میں
بہت ہی آسانی سے خلل پیدا ہو سکتا ہے ۔

جب نوع انسانی کے ابتدائی افراد منطقۂ معتدلہ میں زندگی بسر
کرتے ہوں گے ۔ تو موسم گرما میں پہاڑوں کی برف کا پگھلنا ان کے لئے
ایک زبردست اور ہیبت ناک وقوعہ ہوتا ہوگا ۔ وہ دیکھتے ہوں گے کہ
ہر سال گرمیوں میں برف کے پہاڑ کے پہاڑ پگھل کر وادیوں میں نازل ہو
جاتے ہیں ۔ وہ دیکھتے ہوں گے کہ ہر سال سردیوں میں سورج باقی عرصے
کی بہ نسبت کم حرارت مہیا کرتا ہے ۔ وہ حرارت جس کی ضرورت
بقائے حیات کے لئے لازمی ہے ۔ ہم آج بھی سمجھتے ہیں ۔ اور وہ تو سمجھتے ہی
ہوں گے کہ یہ نظام قدرت زندگی کا دشمن ہے ۔ اُن کا اعتقاد ہوگا کہ سردی
ایک یقینی خطرہ ہے ۔ لیکن ہمارا علم اُن سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے اور
ہمیں ایک اور قسم کا "سرد خطرہ" مستقبل میں نظر آ رہا ہے ۔ ہمیں یہ معلوم
ہوتا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کی قسمت میں ایک اور قسم کی "سرد موت"
اٹل ہے ۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جب آخری انسانی نسل یوں سردی کے
مارے ناپید ہو رہی ہوگی ۔ اس وقت کائنات کا وہ باقی حصہ جہاں
حیات پرور حرارت ہوگی ۔ اتنا گرم ہوگا کہ وہاں حیات ممکن ہی نہ ہوگی
سورج کو حرارت کی کوئی خارجی رسد حاصل نہیں ہے ۔ اس لئے
لازمی ہے کہ اس کی حیات پرور گرمی روز بروز کم سے کم ہوتی جائے ۔
اور چونکہ سورج کی حرارت کی روز افزوں کمی ایک حقیقت ہے ۔ اس لئے اس
کے گرد کا معتدل اور حیات پرور دائرہ بھی رفتہ رفتہ گھٹتا ہی جا رہا ہے
زندگی کا امکانی مسکن بننے کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ کرۂ ارض
مستقبل میں اس زوال پذیر سورج کے قریب سے قریب ہوتا جائے
لیکن اس کے باوجود سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ قوانین قدرت زمین اور سورج
کے موجودہ فاصلے کو کم کرنے کی بجائے زیادہ ہی کئے جا رہے ہیں اور
اور یوں کرۂ ارضی رفتہ رفتہ بیرونی سردی اور تاریکی کی طرف چلا جا رہا

ہے اور جہاں تک نوع انسانی کے موجودہ علم کا تعلق ہے یہ مسلّم ہے کہ یہی طریق کار جاری رہے۔ اور زمین گرمی سے دور اور سردی سے قریب تر ہوتی جائے۔ یہانتک کہ آخرکار تمام زندگی سطح ارض پر جم کر رہ جائے۔ اس اٹل نتیجے سے صرف ایک ہی بات ہمیں دور رکھ سکتی ہے اور وہ یہ کہ سیاروں کی کسی ٹکر کی وجہ سے زمین کے سرد ترین دور میں پہنچنے سے پہلے ہی زندگی ایک تیز رفتاری سے یک قلم معدوم ہو جائے اس مجوزہ انجام کی ہمارے کرۂ ارضی کے ساتھ ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کائنات کے دوسرے سورج بھی ہمارے ہی سورج کی طرح ایک نہ ایک دن زوال پذیر ہو جائیں گے۔ اور اگر اور سیاروں پہ بھی کسی قسم کی زندگی موجود ہے تو وہ بھی اسی طرح آخرکار ایک بسطرہ انجام سے دوچار ہوگی۔

طبیعیات کی کہانی بھی فلکیات سے ملتی جلتی ہی ہے۔ اس کے ذریعے سے بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ستاروں سے اخذ کردہ نتائج سے دور رہ کر طبیعیات کا ایک قانون بھی ہمیں یہی بتاتا ہے۔ کہ کائنات کا انجام کمیٔ حرارت ہی کی وجہ سے ہوگا۔ اور کائنات کی کل قوتِ عمل برابر برابر تقسیم ہو جائے گی۔ اور کائنات کے ہر مادّے کا ایک ہی درجۂ حرارت ہو جائے گا۔ اور یہ درجۂ حرارت اس قدر کم ہوگا کہ اس میں کسی قسم کی بھی زندگی یکسر ناممکن ہوگی۔ لیکن اس سے ہمیں کیا غرض کہ انجام کیونکر ہوگا۔ قیامت کس صورت میں آئے گی۔ یہی جان لینا کیا کافی نہیں ہے کہ انجام ہوگا، ضرور ہوگا، اور یہ انجام ایک کائناتی انجام ہوگا۔

تو کیا زندگی کا یہی مقصد ہے؟ یہی زندگی کا حاصل ہے کہ یہ اچانک ایک ایسی کائنات میں نمودار ہو جائے جو اس کے لئے تخلیق نہیں کی گئی تھی، اور جس کی طبعی کیفیت زندگی سے بے نیاز بلکہ اس کی دشمن ہے: اور کیا اس کرۂ ارضی پر، اس ناچیز ذرّے پر رینگتے رہنے کے بعد جم کر رہ جانا ہی ہماری قسمت کا نوشتہ تھا! ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ یہ جانکاہ حقیقت ہی ہماری ہمدم رہے گی کہ انجام کار ہمیں تباہ و برباد ہو کر ہی رہنا ہے! اور ہماری تمام کارگزاریاں ہمارے ساتھ ہی مٹ کر رہ جائیں گی۔ یہ فضائے لامحدود یوں رہ جائے گی گویا ہماری ہستی کبھی وجود میں ہی نہ آئی تھی۔

فلکیات سے ہم صرف ان سوالات تک ہی پہنچتے ہیں، ان کے جواب کے لئے ہمیں طبیعیات کی طرف ہی رجوع ہونا پڑے گا۔ کیونکہ فلکیات سے ہمیں موجودہ نظام کائنات کا علم ہوتا ہے۔ خلاء لامحدود کی وسعت اور حیات انسانی کی ہیچ مقداری کا علم ہوتا ہے اور اس سے کسی حد تک ہم وقت کے انقلابات اور امتداد زمانہ کے متعلق بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن انجام کے متعلق ہمیں اپنے سوالوں کا جواب حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بنیادی ماہیت اشیاء کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں۔ اور یہ کام فلکیات کے ذریعے سے سرانجام نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمیں لامحالہ جدید طبیعیات کا آسرا لینا ہوگا۔

بسنت سہائے

سپیشل رائل ہیر ڈائی

قیمت مع محصولڈاک
ایک بکس ایک روپیہ دو آنے
تین بکس دو روپے بارہ آنے
چھ بکس پانچ روپے چار آنے
بارہ بکس نو روپے

اس خضاب کے استعمال سے قدرتی رنگ کے مطابق بال سیاہ نرم اور چمکدار ہو جاتے ہیں اور مطلقاً امتیاز نہیں کیا جا سکتا کہ خضاب لگایا گیا ہے یا نہیں رنگ اس قدر پائدار ہے کہ ہمیشہ قائم رہتا ہے بسرف کھونٹیوں کو جو سفید نکلتی ہیں ہفتہ عشرہ میں خضاب لگانے کی ضرورت ہے۔ ایک بکس کئی مہینوں کیلئے کافی ہے

نوٹ:۔ مجھے دی مقبول کیمیکل ورکس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ فرم ہذا نے مجھے والیان ریاست اور یوروپین و ہندوستانی معززین کے وہ تعریفی خطوط دکھائے جو انھوں نے مندرجہ بالا سپیشل رائل ہیر ڈائی استعمال کرنے کے بعد لکھے ہیں فی الحقیقت مقبول کیمیکل ورکس کا تیار کردہ سپیشل رائل ہیر ڈائی بہترین ہے اور ہندوستانی صنعت کو فروغ دینے کے نقطہ نظر سے اس امر کا حق ہے کہ ہر ضرورت مند اس کا استعمال کرے۔ منیجر ادبی دنیا لاہور

دی مقبول کیمیکل ورکس ناگ دیوی سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

تار کا پتہ
ایجنسی بمبئی

میرے رنگ میں حیرت انگیز تبدیلی
جلد ہمیشہ کے لئے گوری ہو جاتی ہے

جلد سفید کرنے کا سائنٹفک طریقہ جس سے کالی جلدیں گوری ہو جاتی ہیں جلد گوری کرنے کے مختلف تجربات نے ثابت کیا ہے کہ جسمانی ساخت میں رنگ کا مادہ اوزون سے جو آکسیجن کی سب سے تیز صورت ہے بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے۔ یہ اصول اوزون سے ترکیب پائی ہوئی ایک کریم کی تیاری میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کریم کا نام کریموزون ہے۔ اور کریموزون سے ۲۰۰ مکعب سینٹی میٹر تازہ اور مرتکز آکسیجن خارج ہوتی ہے

کریموزون کا عمل

کریموزون کا عمل بہت سادہ ہے۔ اس جلد پر ملنے سے کریموزون جذب ہو کر مسام سے گزرتی ہوئی جلد کے رنگین مادہ تک جا پہنچتی ہے اور اس کی آکسیجن اس مادہ کو سفید بنانا شروع کر دیتی ہے اور آخرکار جلد پہلے سے کئی درجہ سفید ہو جاتی ہے

کریموزون بے ضرر ہے

کریموزون کا کیمیائی عمل نہایت ہلکا اور بے ضرر ہے اور سفید بنانے کا عمل ارادتاً آہستہ رکھا گیا ہے۔ تاکہ جلد کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے

کریموزون کے دیگر فائدے

کریموزون میں آکسیجن قائم کرنے کیلئے جلد کو غذا بہم پہنچانے والے اجزا ملائے گئے ہیں جن کی وجہ سے جلد نہ صرف گوری ہو جاتی ہے بلکہ اس میں ایک گونہ ملائمت اور تازگی آجاتی ہے۔ کریموزون کے استعمال سے جھائیاں۔ داغ اور جلد کی شکنیں دور ہو جاتی ہیں کریموزون کا عمل ان جراثیم کو بھی مار دیتا ہے جو جلدی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے یہ ایک مفید قاتل جراثیم بھی ہے

گارنٹی کریموزون کے ساتھ یہ گارنٹی دی جاتی ہے کہ اگر کریموزون سات دن میں جلد کو گورا نہ کرے تو پورے کی قیمت واپس کر دی جائے گی

CrémOzon
OXYGEN CREAM
GUARANTEED TO MAKE
DARK SKIN WHITER

کشمکش

میں حیراں ہوں کہ تکمیلِ محبت کس طرح ہوگی
بساطِ بے بسی آغوشِ رحمت کس طرح ہوگی
پریشانی دوائے دردِ فرقت کس طرح ہوگی
ہلاکت لاکھ پلٹے کھائے راحت کس طرح ہوگی
جنونِ عشق سے مجبور فطرت کس طرح ہوگی

یہ مانا جذبہ دل میں بڑی تاثیر ہوتی ہے
سیاہی چونک کر آئینہ تنویر ہوتی ہے
تصور کی مہارت مستقل تصویر ہوتی ہے
مگر تدبیر پھر منت کشِ تقدیر ہوتی ہے
یہ دنیا، یہ جہنم زار، جنت کس طرح ہوگی!

مجھے موقعہ تو ہے تنہائی میں آنسو بہانے کا!
غبارِ روح دھونے کا، لگی دل کی بجھانے کا
خبر بھی ہے کہ مجھ سے کیا رویہ ہے زمانے کا
مجھے ہے حکم بہتے آنسوؤں سے مسکرانے کا
نہیں معلوم آساں یہ مصیبت کس طرح ہوگی

ترا منشا ہے یہ رعنائیاں شاداب ہو جائیں
وفورِ غم سے تپتی ساعتیں نایاب ہو جائیں
شبِ سرما کی پیاسی خلوتیں سیراب ہو جائیں
سحر تک جاگتی تنہائیاں اک خواب ہو جائیں
بجا ہے! ہمنوا لیکن مشیت کس طرح ہوگی!

تو ہے محبوبۂ آئینہ و مرغوبۂ شانہ
لبالب ثروت و دولت سے چشم و دل کا پیمانہ
کہاں تو شمعِ محبوبی، کہاں میں خاکِ پروانہ
امیدیں تیری متوالی، تصور میرا دیوانہ
مرے پہلو میں تو اے حور طلعت کس طرح ہوگی

ترے نازِ امارت بے زری کیونکر اٹھائے گی
مری مجبوریوں پر تیری چاہت مسکرائے گی
تجھے راتوں کو جب افلاس کی شدت جگائے گی
مری مردانہ غیرت دل پکڑ کر بیٹھ جائے گی
وہ روحانی اذیت آہ راحت کس طرح ہوگی؟

مجھے اب بھول جا شاید سکوں ہو بھول جانے سے!
کہ حاصل کچھ نہیں اس یاد کرنے یاد آنے سے،
سمجھ لینا کہ کوئی ہو گیا رخصت زمانے سے!
سرشکِ یاس پینے سے غمِ دوری اٹھانے سے
نہ جانے ورنہ دونوں کی شہادت کس طرح ہوگی

احسان دانش

GLYCO THYMOLENE
گلائیکو
تھائیمولین
کو
روزانہ استعمال کرنے کی عادت کرلو۔ یہ چالیس سال کا پرانا
انکلین سلیوشن ہے۔ ناک اور گلے کی رگوں میں سوزش اور جلن
کو فوری آرام دیتا ہے۔ ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے
ایم اے جے نزل نمبر ۹۰۱ پارسی سٹریٹ فورٹ بمبئی

ہندوستان سنو
HINDOSTAN SNOW
اگر آپ ہمیشہ ہندوستان سنو استعمال
کریں گے تو یقیناً آپ کے چہرہ کی
جلد کبھی خراب نہ ہوگی بلکہ تازہ۔ نرم
اور گلاب جیسی ملائم رہے گی۔ ہندوستان
سنو کے استعمال سے جلد کی کوئی مرض
نزدیک نہیں آتی۔ گرمی کے موسم میں
چہرے پر لگانے سے ٹھنڈک محسوس
ہوتی ہے مچھر کے کاٹنے کے بعد
ہندوستان سنو لگانے سے جلن دور ہو جاتی ہے۔ گھر سے باہر نکلنے سے پہلے
استعمال کیا کریں۔ سورج کی تپش اثر نہ کرے گی۔ غرض ہندوستان سنو گالوں کو
ملائم کرنے چہرے سے مہاسے اور جھریاں دور کرنے کے لئے بہترین سنو ہے
ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ایجنٹ ملتے ہیں۔ بندرجہ ذیل پتہ پر خط وکتابت کریں
یونیورسل پرفیومری ورکس نمبر ۹۵۰ کامبیکر سٹریٹ بمبئی نمبر ۳

ولایتی خوشبو سے بنے ہوئے مصنوعی تیلوں سے پرہیز کریں
بادامی چمیلی تیل پان مارکہ
رجسٹری شدہ
آپ ہمیشہ استعمال کریں
آج تک ایسا بہترین تیل نہ تو یورپ پیش کر سکا نہ ایشیا۔
ہندوستان کی یہ بہترین ایجاد ہے (۱) یہ تیل کاغذی بادام کے تیل چمیلی کے پھولوں سے بسا کر بنایا گیا ہے جو نہایت
عمدہ خوشبودار اور مقوی دماغ ہے (۲) سر کا درد۔ دماغ کی خشکی اور کمزوری دماغ
کو دور کرتا ہے (۳) دماغی قوت اور بالوں کے حسن کو بڑھاتا ہے (۴) عورت و
مرد دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ ملک کے ہر طبقہ میں بیحد مقبول ہو رہا ہے
پان مارکہ بادامی چمیلی تیل اپنی خوبیوں اور فوائد کی وجہ سے ملک کے
کونے کونے سے سیکڑوں زریں سرٹیفکیٹ و سونے کے تمغے حاصل کر چکا ہے فقط
ایک بار آزمائش شرط ہے قیمت دو اونس شیشی ایک روپیہ چھ اونس کی شیشی دو
روپے بارہ آنے (۲/۱۲) (نوٹ "ادبی دنیا" کا حوالہ دینے سے ہر آرڈر
میں فی روپیہ ایک آنہ منہا کر دیا جائیگا" ادبی دنیا کا حوالہ ضرور دیں
شیخ محمد حسین عطا حسین پرفیومرس گولڈ سپلائیرس ۱۳ کھنگرہ پٹی سٹریٹ کلکتہ

Pelican
ہر قسم کے فاؤنٹین قلموں کے لئے
یہ سیاہی کام دیتی ہے اور نہ تو سونے کی
نب کو اور نہ قلم کو نقصان پہنچاتی
PELICAN WORKS – GÜNTHER WAGNER
لوکل سٹاکسٹ: پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انار کلی لاہور
سٹینڈرڈ بک ڈپو مال روڈ۔ لاہور

ریل کے سفر میں

وہ دلنواز منظر، برسات کا مہینہ
قسمت سے ہم سفر تھی اک نازنیں حسینہ

زلفوں کے پیچ و خم میں ذرات کوئلے کے
ماتھے کی سلوٹوں پر چھٹکا ہوا پسینہ

نازک سے ناخنوں کی کوروں پہ سرخ دھاری
مہندی سے ہر ہتھیلی رنگین آبگینہ

کروٹ بدل رہا تھا، انگڑائی لے رہا تھا
سینہ کے جزر و مد میں اُمید کا سفینہ

گردن میں اُس کی خم تھا لیکن بقدرِ مینا

جھجکی ہوئی نگاہیں، بہکی ہوئی ادائیں
یہ دل نواز دھوکے، اتنی حسیں جفائیں

رخسار پر نمی کی کچھ یوں ہی سی جھلک تھی
جیسے چمن میں کلیاں شبنم سے بھیگ جائیں

اُس نے نظر چرا کر، کس سادگی سے دیکھا
میرے لبوں کی آہیں، دینے لگیں دعائیں

کتنا صبیح چہرہ! کتنی سیاہ زلفیں!
پھیلا ہوا اُجالا، سمٹی ہوئی گھٹائیں

سانچے میں ڈھل گئی تھیں فردوس کی ہوائیں

نظروں کے سامنے تھی وہ روحِ شادمانی
میں یہ سمجھ رہا تھا، دنیا ہے غیر فانی

ساری کو کچھ سمیٹا، بیٹھی ذرا سنبھل کر
ڈبہ کی کھڑکیوں سے آنے لگا جو پانی

پھر اس نے مسکرا کر اس طرح گنگنایا
جیسے کوئی سنائے بیتی ہوئی کہانی

آنکھوں کے سرخ ڈورے، پیمانہ کی لکیریں
ہونٹوں کی مسکراہٹ فردوسِ زندگانی

جاتا ہوا لڑکپن، آتی ہوئی جوانی!

ماہر القادری

سالنامہ ادبی دنیا

بدلا ہوا زمانہ

کردار

ہیم راج ― ایک جاگیردار
پاربتی ― اس کی بیوی
پریم ― اُن کا اکلوتا بیٹا جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹر بن کر آیا ہے
سدرشن ― پریم کا دوست
شیاما ― سدرشن کی بڑی بہن
ہردیال ― ایک سیٹھ
سداما ― اس کی بیوی
اوشا ― ان کی اکلوتی بیٹی جس سے پریم کی منگنی ہو چکی ہے
دل آرام ― اوشا کی گہری سہیلی
― نوکر اور مہمان وغیرہ

(۱)

(ہیم راج پاربتی، اور پریم اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں)

ہیم راج۔ (غصہ سے) اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ انگلستان سے آکر تمہیں ماتا پتا کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ تو میں ہرگز تمہیں بیرسٹری کے لئے وہاں نہ بھیجتا۔

پریم۔ (آہستہ سے) لیکن پتاجی ....

ہیم راج۔ (اونچی آواز سے) بس خاموش رہو مجھے معلوم ہو گیا تم پتاجی کو کیا سمجھتے ہو۔

پاربتی۔ (نرمی سے) آپ غصہ میں نہ آئیے۔ پریم سمجھ جائے گا۔

ہیم راج۔ (پھر اُسی طیش سے) لڑکی پڑھی لکھی، شکل صورت کی اچھی، خاندان اُن کا مشہور، امیر وہ، تو پھر یہ چاہتا کیا ہے؟

پاربتی۔ (لجاجت سے) پریم تمہیں کیا ہو گیا! تم کتنے اچھے ہوا کرتے تھے۔!

پریم۔ ماتاجی میں ....

ہیم راج۔ کیا اپنے ساتھ کوئی میم صاحبہ لا چکے ہو یا یونہی اپنی من مانی کرنا چاہتے ہو! آخر ہم بھی تو جانیں کہ بنی بنائی بات کیوں بگاڑتے ہو!

پریم۔ (متانت سے) پتاجی! آپ تو ناحق ناراض ہو رہے ہیں۔

ہیم راج (غصے میں جیسے کچھ سنا ہی نہیں) اُف پرماتما میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

پاربتی (محبت بھری آواز سے) پریم! دیکھو میری طرف! تم سب کچھ بھول جاؤ گے وہ تو چاند جیسی سندر ہے۔

پریم۔ مگر ماتاجی! میں شادی سے پہلے اُسے ایک بار دیکھ تو لوں آخر پرماتما نے دو آنکھیں کس لئے دی ہیں اسی لئے نا کہ ضرورت کے وقت کام آئیں

ہیم راج۔ (غصے سے) منگنی ہو چکی ہے ہماری سماج اس بے باکی کی ہرگز اجازت نہیں دیتی۔

پاربتی۔ پریم ولایت جاکر تو تمہاری عقل ٹھکانے نہیں رہی اس دنیا

میں ہم سے بڑھ کر تمہارا بھلا چاہنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ جب ہم
نے سب کچھ دیکھ بھال کر تسلی کر لی ہے تو تم کیوں اتنی چنتا کرتے ہو!

پریم۔ شادی کے لئے تو دو دلوں میں گہرے لگاؤ کی ضرورت ہے۔ لیکن
سماج ہے کہ اس بندھن سے پہلے صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔

ہیم راج۔ (حقارت سے) نئی تہذیب! نیا زمانہ! اس کا یہ مطلب ہے کہ
ہم اُن لوگوں سے یہ کہہ کر کہ ہمارے انوکھے سپوت پہلے کنیا
کے درشن کرنا چاہتے ہیں اپنی ناک کٹوالیں۔ وہ لوگ مجھ سے
یہ نہ کہیں گے کہ سر پھرے اپنے لال سے پہلے پوچھ لیا ہوتا۔

پاربتی۔ پریم بیٹا اب تو تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے تم بچے نہ بنو۔

ہیم راج۔ (سختی سے) ہم نے بہو والوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر وان لیا اور
جانے کس شبھ گھڑی میں وہ اپنی لڑکی کا پلّو تم سے باندھنے کے لئے
تیار ہو گئے اگر میں جانتا کہ یہاں آکر تمہاری چال ڈھال ہی بدل
ہو جائے گی تو تمہیں تمہارے لگن کے لئے اتنی منتیں کرنے کی
بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔

پریم۔ لیکن پتاجی میں کب نہیں مانتا۔ میں نے جس لڑکی کی جھلک تک نہ
دیکھی ہو۔ میں اُس سے شادی کیسے کروں مجھے یہاں آئے ہوئے
پورا ہفتہ بھی نہیں گذرا اور آپ نے میری مرضی کے بغیر پہلے ہی
شادی مقرر کر رکھی ہے۔ یہ شادی ہے یا بھان متی کا کھیل۔

پاربتی۔ آج تک تو ماتا پتا اپنی اولاد کی شادیاں ان سے بن پوچھے ہی
کرتے رہے۔ تیرے پتاجی نے بھی تو بیاہ سے پہلے مجھے
نہیں دیکھا تھا۔

ہیم راج۔ اور نہ کسی نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ تیرا بیاہ کریں یا نہ کریں۔

پریم۔ پتاجی یہ تو میری ایک جائز خواہش ہے اول تو آپ خواہ مخواہ
مجھے کسی لڑکی سے شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور اگر مجھے
اُسے دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔

ہیم راج۔ (غصہ سے) تو تم اپنی ہٹ پر قائم رہو گے؟ دنیا کیا کہے گی
میری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔

پریم۔ (آہستہ سے) اور میری بنی بنائی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

ہیم راج (طیش سے) بے شرم میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ میں نے
اسے پالا اسے لکھایا پڑھایا اور آج میں اس کی زندگی تباہ کرنے
لگا ہوں! بے حیا کہیں کا۔

(پریم اُٹھ کر چلا جاتا ہے)

پاربتی۔ پریم او پریم! میری بات تو سن جائیے بھگوان میں کیا کروں۔

ہیم راج۔ (غصہ سے) کیوں کس لئے بلاتی ہو لاڈلے سپوت کو! واپس بلاؤ
گی تو یہ بھی آکر کہہ دے گا کہ میرے تو باپ کا بر ڈھونڈنے میں بھی
بڑوں سے چوک ہو گئی تھی۔

پاربتی۔ (سرد آہ بھر کر) ہے بھگوان! تو ہی اب میری لاج رکھیو۔

(۲)

(سیٹھ بردیال کا مکان۔ اوشا اپنے کمرے میں بیٹھی کسی گہرے خیال
میں ڈوبی ہوئی ہے ایک نوجوان حسین لڑکی جو اس کی ہم عمر ہے اندر
داخل ہوتی ہے)

اوشا (چونک کر) کون؟ ....

دل آرام۔ کیوں کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کتنی دیر دروازے پر کھڑی
رہی رانی نے دیکھا ہی نہیں۔

اوشا۔ (مسکرا کر) تو تو بڑے اچھے موقعہ پر آئی۔ دل آرام! میں سوچ ہی رہی
تھی کہ کوئی آ جائے۔

دل آرام۔ ہوں! یہ نہ کہو! کہ اس وقت میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے
ہونے والے پتی میرے پاس ہیں میرے ....

اوشا۔ (بات کاٹتے ہوئے) بڑی شریر ہو۔

دل آرام۔ اوشا میں نے سنا ہے تیرے پتی بہت سندر ہیں اور ہوگا بھی
بے شک جب اُن کا نام ہی پریم ہے تو باقی رہ کیا گیا بس یہی نا
"پریم نگر" میں گھر بنانا سو وہ بھی اب بن جائے گا۔

اوشا۔ (جھنجھلا کر) دل آرام تم ہر وقت مذاق نہ کیا کرو۔

دل آرام۔ (شرارت سے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) ہاں اب تم ہماری
باتوں کو کب دھیان میں لاؤ گی۔ تمہاری آنکھوں میں تو اب کسی کی
سندر مورت چھائی رہتی ہے۔

اوشا۔ (بے پروائی سے) میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں .....
اب یہ ٹر ٹر بند کرو۔

دل آرام (مسکرا کر) پریم بھیا خوش تو بہت ہوں گے۔ بی۔ اے پاس سندر
پتنی مل جائے گی اور پھر ذرا ایکٹنگ کرتے ہوئے جب تُو نے
ان آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھا تو بس مر ہی جائیں گے۔

اوشا۔ (ہنس کر) ارے وہ تو خود بڑے قابل ہیں۔ آخر انگلینڈ ریٹرنڈ ہیں

انگلینڈ ریٹرنڈ۔

دل آرام۔ تو پھر کئی جگہ دل دے چکے ہوں گے یہ انگلینڈ ریٹرنڈ پچھے بیٹھنے والے نہیں ہوتے۔

اوشا۔ وہ تو اپنی شادی بھی ماتا پتا کی مرضی ہی سے کر رہے ہیں۔

دل آرام۔ تو پھر ہوں گے بدھو انگلینڈ ریٹرنڈ۔

اوشا۔ (ذرا ٹھہر کر) تم بے فکر رہو تمہارا بیاہ کسی موج دین ہی سے ہوگا بھائی جان کے سر پر چھوٹی سی پگڑی ہوا کرے گی پاؤں میں فلیٹ فٹ، لیکن دونوں انگوٹھے باہر نکلے ہوئے۔ پاجامہ گھٹنوں پر سے میلا اور ابھرا ہوا۔ چھاپہ ڈورئیے کی قمیض۔ آنکھوں میں آدھا سرمہ اندر اور آدھا باہر لمبی لمبی مونچھیں۔ سنا! یہ ہوں گے تمہارے میاں اور تم اُن کی جورو۔

دل آرام۔ (ہنستے ہوئے) بہت بڑھ بڑھ کے باتیں نہ بناؤ۔

اوشا۔ (بناوٹی سنجیدگی سے) دن بھر کی تکان کے بعد آیا کریں گے بیچارے بھائی جان۔ تم رات کو دال پکایا کروگی۔ لکڑی تک پاس نہ ہوگی۔ اُپلوں کے دھوئیں میں پھونکیں مار مار کر ان بڑی بڑی آنکھوں کا ستیاناس ہو جائے گا جن پر تمہیں اتنا ناز ہے۔ پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر کبھی کبھی تمہارے ہاں جایا کریں گے۔ باقی لوگ تو موٹر ہی میں بیٹھے رہا کریں گے . . . .

دل آرام۔ (بات کاٹتے ہوئے) باقی لوگوں سے تمہارا مطلب مسٹر ریکھ چند بہادر ہوگا۔

اوشا۔ (جیسے کچھ سنا ہی نہیں) خیر سنو تو میں ہی صرف اندر جایا کروں گی ڈیوڑھی کے بعد دالان ہیں۔ دالان کے بعد ایک کمرہ میں سے ہو کر تمہیں باورچی خانہ میں جا پکڑا کروں گی میں کہوں گی "کیا ہو رہا ہے۔ دل آرام" تو تم ہنس کر جواب دوگی۔ "ذرا آٹا گوندھنے لگی تھی تمہارے بھائی جان آنے والے ہیں نا" پھر تم مجھ سے پوچھوگی "اوشا لسی پیوگی یا لیمونیڈ یا دودھ یا صرف سادہ پانی" میں تمہارا اصل مطلب سمجھ کر جواب دونگی صرف سادہ پانی ہی کافی ہے۔ اتنے میں باہر دالان سے مرغی کے کڑکڑانے کی آواز آئے گی۔ میں حیران ہو کر کہوں گی "ہیں یہ کیا ہے"؟ تو تم جواب دوگی خیر سے مرغی انڈوں پر آئی ہوئی ہے۔

دل آرام۔ (ہنس کر) بھئی اب بس کرو!

اوشا۔ اب ذرا اپنے میاں کی گفتگو بھی سن لو باہر سے آیا کریں گے نا بھائی جان تو تمہارا سب سے پہلا سوال یہ ہوا کرے گا "کیوں جی کچھ لائے" وہ پہلے تو "یا میرے مولا" کہہ کر چارپائی پر بیٹھا کریں گے اور پھر جواب دیں گے "نہیں دل آرام پیاری لیکن بھلا کرے خدا نانو کمہار کا۔ تم اُسے جانتی ہو؟ نہیں تم نہیں جانتیں۔ چار آنے کے پیسے لینے تھے۔ اس سے لال دروازے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو کبھی کا چونا لاد کر چھوٹو مل کی عمارتوں پر جا چکا ہے۔ خیر میں نے کہا ہماری دلھن صاحبہ خوش ہو جائیں۔ میں وہیں چلا گیا۔ بیچارے نے ہاتھ ملایا، اچھا آدمی ہے۔ اُسی وقت چار آنے کے پیسے نکال کر دے دیئے۔

(دونوں ہنستی ہیں)

اور جاتی دفعہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ بھائی جی آپ میرے ساتھ گدھے پر ہی بیٹھ کر شہر کو واپس چلے جاتے مگر آپ کو جلدی ہوگی میں تو جیل روڈ کو جا رہا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں "دل آرام" امیروں سے یہ غریب اچھے۔

دل آرام۔ (ہنستے ہوئے) اُوشا خدا کے واسطے اب بس کرو۔

اوشا۔ (ذرا ہنس کر) ٹھہرو! ٹھہرو! ہاں تو تم کہوگی تو پھر آج آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ بھائی جان کہیں گے "بس تمہیں دیکھ کر سب تکان دور ہو جاتی ہے"۔ جب پہلگام میں گرمیاں گزارنے کے بعد میں تمہیں پھر ملنے کے لئے آؤں گی تو ڈیوڑھی میں سے "پیں پیں" کی آواز آ رہی ہوگی۔ ملنے کے بعد میں تم سے پوچھوں گی۔ دل آرام یہ "پیں پیں۔ پیں پیں" کیا ہو رہا تھا تو تم جواب دوگی اوشا کیا کروں اللہ رکھے کو کچھ ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ جب تک پاؤں پہ بٹھا کر پس پس۔ نہ کروں پیشاب ہی نہیں کرتا۔

میں جواب دوں گی ننھے کی عادت تو بہت پیاری ہے اور تم نہال ہو جایا کروگی۔ مجھے رخصت کرنے کے لئے تم اُسے گود میں اٹھا کر باہر تک تو ضرور آیا کروگی۔ آتی دفعہ میں تمہارا دل خوش کرنے کے لئے کہوں گی "نٹ نٹ"! اللہ رکھے ہنستے ہو! کیا کر رہے ہو! میرے پاس آؤگے! نہیں اماں کے پاس ہی رہو۔ تم کہوگی اوشا یہ تمہاری ہی طرف دیکھ کر ہنستا ہے اُن کے تو پاس تک نہیں جاتا۔

دل آرام۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) جہنم میں جائے تمہارا یہ موج دین۔

اوشا۔ کیوں اب بھی کسی شریف آدمی کی پھبتیاں اڑاؤ گی؟

دل آرام۔ اچھا اچھا۔ بہت چل نکلی ہو۔

(۳)

(مسٹر سدرشن کا بنگلہ۔ پریم برآمدے میں داخل ہوتا ہے)

پریم۔ (بلند آواز سے) سدرشن!

سدرشن۔ اندر چلے آؤ۔ (پھر پریم کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) کیوں خیر تو ہے۔

پریم۔ (لمبا سانس لے کر) ہاں . . . خیر ہی تو نہیں۔

سدرشن۔ آخر پتہ بھی چلے۔

پریم۔ بس آہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

سدرشن۔ لیکن سدرشن شادی کے معاملے میں تمہاری یہ بچوں والی ضد دیکھ دیکھ کر مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ کسی نہ کسی جنم میں تم گدھے بھی ضرور رہ چکے ہو۔

پریم۔ لیکن . . . لیکن . . . تمہیں کس نے بتایا۔

سدرشن۔ تمہارے پتا جی نے اور کس نے۔ وہ ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں۔ بھئی یہ بہت بری بات ہے۔ ان کے تو بدن میں لہو تک نہیں رہا۔ بے چارے بہت پریشان ہیں۔

پریم۔ تم سے کیا کہہ رہے تھے؟

سدرشن۔ یہی کہنے آئے تھے کہ اسے کچھ سمجھاؤ۔ تم خود ہی غور کرو کہ ان کی پوزیشن کتنی خراب ہو رہی ہے۔ توبہ ان لوگوں نے بھی تو حد کر دی۔ مہمانوں کے نام رقعے تک بھیج دیئے۔

پریم۔ (غصے سے) تو پھر میں کیا کروں مجھ سے پوچھ کر سب کچھ کیا ہوتا۔

سدرشن۔ میں نے تو ماتا جی سے کہا تھا کہ پریم جب آئے تب ہی اس کی شادی کی بات چیت بھی کیجئے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ انہیں تمہاری فرمانبرداری پر حد سے زیادہ ناز اور یقین تھا . . . اخوہ! . . . چائے منگوانا تو بھول ہی گیا۔

پریم۔ نہیں میں چائے وائے کچھ نہیں پیوں گا۔

سدرشن۔ ہاں تو پھر کیا سوچا ہے۔

پریم۔ بس میں نے اچھی طرح سے غور کر لیا ہے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔

سدرشن۔ تو گویا تم خاندان کی لٹیا ڈبو کر ہی رہو گے۔

پریم (ہونٹا غصہ سے) بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ جس لڑکی کو میں نے دیکھا تک نہ ہو۔ اس سے شادی کیسے کر لوں۔ مجھے تو یہ بات بے حد مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

سدرشن۔ (نہایت متانت سے) میرا خیال ہے کہ جو شادیاں ماں باپ کی مرضی سے کی جائیں وہ محبت کی شادیوں سے بہت زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔ تم شادی اور محبت کو ایک بات کیوں سمجھتے ہو محبت مٹ جاتی ہے۔ لیکن دنیا میں شادی کی رسم پھر بھی چلی آتی ہے۔ شادی تو صرف ایک سماجی مقصد کو پورا کرتی ہے۔

پریم۔ لیکن میں تو اس بات کو خلاف اخلاق، قابل نفرت، اور خلاف فطرت سمجھتا ہوں کہ دو ایسے انسان جنہیں ایک دوسرے سے محبت نہ ہو ایک جگہ مل کر رہیں۔ میرے دل میں ان کنواروں کی زیادہ عزت ہے جو فریب اور بناوٹ سے تو زندگی بسر نہیں کرتے۔ شادی تو محبت کا ایک وعدہ ہے یا کم از کم عمر بھر کے نباہ کا ایک معاہدہ، اگر یہ نہیں تو پھر یہ ایک بے حقیقت اور ذلیل چیز ہے

سدرشن۔ خیر یہاں یہ فلسفہ چھانٹنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے گھر کا خیال نہیں کرتے تو نہ سہی۔ ایک اور گھرانے کے خوش گوار حالات جس بھیانک سین میں بدلنے والے ہیں کیا تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے! تمہارے انکار سے اس لڑکی کی کیا حالت ہوگی جسے سوسائٹی نے شروع ہی سے یہ سبق دیا ہے کہ اپنے ہونے والے پتی سے خواہ اسے دیکھا تک نہ ہو محبت کی جائے۔

پریم۔ لیکن فرض کیا اُسے محبت کا جواب محبت میں نہ ملا، اس کی ذمہ دار بھی تو ہماری معاشرت ہی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک کی وجہ سے دوسرے کی زندگی تباہ ہونے کا امکان ہو تو اس کی بہ نسبت موجودہ بد مزگی بہتر ہے۔

سدرشن۔ لیکن ابھی تو یہ تمہاری سب باتیں فرضی ہیں۔ کیا معلوم بعد میں لڑکی تمہیں ہر لحاظ سے پسند آئے۔

پریم۔ (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) خیر میں تمہارے ان چکروں میں نہیں آتا۔ اچھا تو اب میں جا رہا ہوں ایک ضروری کام ہے۔

(۴)

(ہیم راج اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں بے چینی سے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں سدرشن آتا ہے)

ہیم راج۔ (اضطراب سے) آؤ سدرشن بیٹا۔ بہت راہ دکھائی۔ کیوں کچھ بنا۔

نذیر احمد مرغوب

مشفق ملتانی

زروش صدیقی

قیوم نظر

باٹا نگر

(۱) فیکٹری اور بنگلوں کا ایک منظر

(۲) رہائشی مکانات و دفاتر کا ایک حصہ

(۳) مزدوروں کی آبادیاں

(۴) مزدوروں کی آبادی کا ایک اور منظر

سدرشن (کرسی گھسیٹتے ہوئے) جی نہیں اس سے کچھ بات کرنے لگیں تو وہ شادی کے مسئلہ پر ایک دھواں دھار تقریر شروع کر دیتا ہے بجائے اس کے کہ میں اُسے قائل کرتا اس نے سُنی اَن سُنی ایک کر کے اُلٹا مجھے اُلّو بنا دیا . . . . جب وہ آپ کی نہیں سنتا تو بھلا میں اس کے سامنے کیا ہوں!

ہیم راج۔ نہ جانے پرماتما مجھے کس پاپ کی سزا دے رہے ہیں۔

سدرشن۔ (ذرا چونک کر) یہ گتھی شاید ایک طریقہ سے سلجھ بھی جائے آپ کل باہر چلے جائیے اور واپس آ کر ہنستے ہنستے پریم سے کہہ دیجئے کہ لڑکی والے رخصت سے پہلے تمہاری اور لڑکی کی ملاقات میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور اس کا انتظام برات کے آنے پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کوئی چال چلوں گا چلئے پھر برات کے ساتھ پریم کو لے جانا میرا ذمہ رہا اور پھر وہاں معزز سسرال اور براتیوں کی چلت پھرت میں پریم جی کی یہ ٹائیں ٹائیں پل بھر میں فِش ہو جائے گی۔

ہیم راج (خوشی سے) ٹھیک ہے میرا کیا ہے آج شام کو ہی کسی دوسرے شہر کے ہوٹل میں جا ٹھہرتا ہوں۔

(بات ختم کرنے کے بعد ٹھنڈی سانس لیتا ہے)

سدرشن۔ جی ہاں میں پریم سے کہہ دوں گا کہ پتا جی کو تمہارے سسرال میں بات چیت چھیڑنے کے لئے بھیج آیا ہوں۔

(۵)

(سیٹھ ہردیال کا مکان۔ برتنوں کو ادھر سے اُدھر رکھنے سے آوازیں پیدا ہو رہی ہیں)

سیٹھ ہردیال (ہنستے ہوئے) مسٹر کامروپ آپ تین چار دن سے بہت کام کر رہے ہیں برات آنے سے پہلے گھڑی دو گھڑی آرام بھی کر لیجئے۔

کام روپ۔ اجی واہ سیٹھ صاحب ایسے موقعوں پر کام کرنے سے تکان تھوڑا ہی ہوا کرتی ہے۔ وہ باہر کے دونوں گیٹ آپ نے دیکھے؟

سیٹھ ہردیال۔ سجاوٹ تو آپ نے ٹھاٹ ہی محل جیسی کر دی۔

کام روپ۔ اجی سماں تو رات کو بندھے گا جب بجلی کے ہنڈولے درختوں پر آنکھیں جھپکائیں۔

ایک نوکر۔ بابو جی وہ بڑے دروازے پر ہنڈرڈ ہارس پاور کا بلب لگے گا یا چھوٹا۔

کامروپ۔ (ہنستے ہوئے) ارے چیت رام تو تو اچھی بھلی انگریزی بولتا ہے۔

چیت رام۔ اجی بابو جی پھر موٹر ڈرائیور کاہے کو ہوئے جو اتنی سی گٹ پٹ بھی نہ جانیں

سیٹھ ہردیال۔ میری تو ٹانگیں شل ہو رہی ہیں صبح سے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر برتنوں کا انتظام کروایا۔ سائبان لگوائے اور ابھی سنا ہے باورچیوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں۔ اُدھر زنانہ سے بار بار بلاوا آتا ہے کہ یہ نہیں ہوا وہ نہیں ہوا۔ لیجئے وہ سائبان کے رسّے بچوں نے پھر کھول دیئے۔

کام روپ۔ اجی سیٹھ صاحب بگڑ کر ایک ایک چپت لگائیے۔ انہوں نے تو اچھا خاصہ مذاق بنا رکھا ہے لو حد ہو گئی یار۔ یہ بچے تو جان کا روگ ہوتے ہیں۔

سیٹھ ہردیال۔ بڑے کون وہ تو جھٹ سے گھس جاتے ہیں زنانے میں۔ ابھی آپ کہتے ہیں ریڈیو باہر رکھوا دیجئے۔

ایک نوجوان۔ (نوکر کو مخاطب کرتے ہوئے) جگو کے بچے وہ چینی کے برتن ابھی تک تیری جان کو رو رہے ہیں۔ تجھے کہا تھا بھاگ کر بازار سے سگرٹوں کے چھ ڈبے لے آیو۔ ارے تمباکو لائے ہو یا نہیں حقے تو تیار نہ کر جاؤ

نوکر۔ (جھنجھلا کر) بابو جی جگو تو ہوا ایک، جائے کدھر میں تو چھوٹی بی بی کے لئے ربن لینے جا رہا ہوں۔

. . . .

(چند نوجوان ایک کمرہ میں بیٹھے ہیں)

ایک نوجوان۔ (آئینے کے سامنے جھکے ہوئے جھنجھلا کر) واہ صاحب نکٹائی کی کمبخت گرہ ہی نہیں [illegible] اُدھر برات آیا چاہتی ہے (پھر ذرا ہنس کر) اور آئینہ الیسا ہے کہ اس میں اچھا بھلا آدمی کنگ کانگ دکھائی دیتا ہے۔

دوسرا نوجوان (جیسے چونک کر) ارے بھئی وہ لڑکی کون تھی چلبلی سی دیکھ تو نہ سکے مگر چال غضب کی مستانی تھی۔

پہلا۔ (قہقہہ لگا کر) اے کمبخت . . . . وہ تو شانتا بہن تھی۔

دوسرا۔ (شرمندہ ہو کر) جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ اچھا بھئی ذرا باہر چلتے ہیں۔

(نوجوان معنی خیز طور پر ہنستے ہیں)

ایک نوجوان۔ لو موہن تمہارے کرانے کے چچا بھی آگئے۔ ذرا شکل ملاحظہ ہو

دوسرا نوجوان۔ (ہنس کر) بکواس مت کرو۔

نووارد۔ کُ کُ کیوں بھائی یہ تمہارا ٹ ٹ ٹائلٹ ہی ختم نہیں ہوتا۔

(ایک چھوٹا سا لڑکا روتے روتے اندر داخل ہوتا ہے)

ایک نوجوان۔ (پہلے منہ سے سیٹی بجا کر) ہیلو رچے! ارے! یہ کیا ہوا اچھے لڑکے رویا نہیں کرتے۔ آؤ میرے پاس۔

دوسرا نوجوان۔ اخاہ! بھئی رچے یہ قمیص تو مجھے دے دو۔

پہلا نوجوان۔ (روتے ہوئے بچے سے) یہ باجا بند کرو جی!

دوسرا نوجوان۔ ابھی دولھا میاں آئیں گے ننھے کے لئے چھوٹا سا گدھا لائیں گے۔

بچہ۔ (منہ بسور کر) ممّیا ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ لیمن نہیں گے۔ ہمارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

نوجوان۔ (بچہ کو پچکارتے ہوئے) اچھا یہ تو بتاؤ سر میں پیٹ درد ہو رہا ہے یا ٹانگ میں۔

بچہ۔ (دردنی صورت بنائے) ٹانگ میں ۔ ۔ ۔ ۔

(سب ہنستے ہیں)

نوجوان۔ تو سیدھی طرح یوں کہئے نا کہ آپ کو لیمونیڈ چاہئے اچھا یہ تو بتاؤ ممی کیا کر رہی ہیں؟

بچہ۔ وہ خود تو سرخی اور پاؤڈر مل رہی ہیں اور مجھے مارتی تھیں۔

نوجوان۔ (ہنس کر) اچھا چلو تمہیں لیمونیڈ پلائیں۔

. . . .

(گھر کی دو ادھیڑ عمر بیبیاں چینی کے برتنوں کو صاف کر کے ایک دوسرے پر رکھ رہی ہیں)

ایک عورت۔ بہن گنگا دئی یہ آج کل کے فیشن دیکھ رہی ہو بیبیوں نے کیا کیا لباس پہن رکھے ہیں۔ توبہ میری انگریجوں کے راج نے کون کونسی باتیں نہیں دکھائیں اور کیوں جائیں آج کل کی جوتیاں ہی دیکھو پھونک مارو تو اڑ جائیں۔ اگر انگوٹھا اندر ہے تو ساتھ کی انگلی کے لئے ایک اور ہی ٹھکانا بنا ہوا ہے۔ ایڑیوں کے پیچھے جانے کیا کیا فیتے لگے ہوتے ہیں ایک بندھا ہوا ہے تو دوسرا کھلا ہے پرماتما میرے ابھی کیا کیا اور باتیں ہوں گی۔ بہن گنگا دئی آج بی بی دل آرام کی شان دیکھی پھر میں تو جانوں بی بی اوشا سے وہ بھی لگا نہیں کھاتیں۔

دوسری عورت۔ ہاں بہن شکلیں تو دونوں کی بہت ملتی ہیں مگر بی بی اوشا کی بات ہی اور ہے آنکھیں پرماتما نے ایسی دی ہیں کہ نظر نہیں ٹلتی جاتی۔ کل باہر سے پیازی ساڑھی پہن کر آئیں تو میں سمجھی کوئی میم آگئی ہے۔ جب ہنستی ہیں تو جی چاہتا ہے واری ہی ہو جاؤں جب چلتی ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی رانی تخت سے اتر کر جا رہی ہے۔ کل کی بات ہے نہ کل کی کیوں پرسوں کی شاید کہیں دھوپ میں سے آ کر بیٹھی ہوں گی۔ رنگ انار کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے تو کپڑوں کے نام بھی نہیں آتے۔ خبر نہیں آنکھ کی پیاس تھی یہ کیا الا بلا۔ کوئی ایسی ویسی ہی قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پہ کیسری رنگ کا دوپٹہ تھا۔ دیکھ کر مجھ سے تو نہ رہا گیا۔ میں نے کہا بی بی تم تو پری لگ رہی ہو۔ دل چاہتا ہے تمہاری طرف دیکھتی ہی رہوں۔ ناک، ہونٹ تو پرماتما نے سوچ سوچ کر بنائے ہوں گے۔ یوں بی بی دل آرام بھی اپنی جگہ کم نہیں مگر اوشا بی بی کی اور ہی بات ہے۔

پہلی عورت۔ ہاں بہن تم ٹھیک ۔ ۔ ۔ ۔

دوسری عورت۔ (بات کاٹتے ہوئے) چل جلدی جلدی برتن صاف کرے ابھی بڑی بی بی آگئیں تو تم سے یہ نہ پوچھیں گی کہ بی بی اوشا بی بی دل آرام سے بڑھ کر کیوں سندر ہیں۔ وہ تو کام کو دیکھیں گی۔

. . . .

(دو کم عمر لڑکیاں ایک کمرے میں بناؤ سنگار میں مشغول ہیں)

ایک لڑکی۔ کیوں ملا یہ جارجٹ کی ساڑھی پہنوں یا بنارسی۔ بنارسی ساڑھی کے شکن ذرا ٹھیک نہیں آتے اور یوں بھی بھدی سی لگوں گی۔

دوسری لڑکی۔ (چڑ کر) بھئی میں کیا بتاؤں مجھ سے خود ساڑھی کا پن ٹھیک نہیں لگتا۔

پہلی لڑکی۔ دیکھو تو میرے بال ٹھیک ہیں۔

دوسری لڑکی۔ بائیں کان پر سے ذرا اوپر کر لو۔ اری سینڈل کے ساتھ

جرابیں کون پہنتا ہے۔

پہلی لڑکی۔ پھر تم نے کیوں پہن رکھی ہیں۔

دوسری لڑکی۔ میرے تو پاؤں کا ناخن ذرا تراشتے وقت خراب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے چھپایا ہے اور تمہارے پاؤں تو خاصے خوبصورت ہیں۔

پہلی لڑکی۔ اس ڈپٹی کی لڑکی کو دیکھو لال ساڑھی پہن کر بیربہوٹی بنی پھرتی ہے اور رکمنی کو دیکھا بھبھوکا سا رنگ۔ سادہ پن میں لاکھ لاکھ بناؤ اور یہ سنجاف کا کوٹ پہن رکھا۔ ہے میم مارکرنے۔

دوسری لڑکی۔ دل آرام کی شان دیکھی بھئی اوشا سے اس کی ناک نقشہ ملے مگر دل آرام اسے پہنچتی نہیں۔ ابھی نظریں نیچے کئے۔ اوشا ہمارے مذاق پر تھوڑا تھوڑا ہنس رہی تھی تو جی چاہتا تھا گلے سے لگا لوں۔

پہلی لڑکی۔ خوش تو بڑی ہوگی۔ دولہا بیرسٹر ہے اور سنا ہے ناک نقشہ بھی اچھا ہے اری دولہا سے مذاق کیا ہوگا۔؟

دوسری لڑکی۔ چپ رہو ایسی ایسی شرارتیں سوچ رکھی ہیں کہ آتے ہی ساری انگلینڈ ریٹرنڈی نکل جائے گی۔ دل آرام نے ڈی۔ ایم۔ سی کے دھاگہ سے کرسی بن رکھی ہے۔ اچھا آؤ تو اوشا کے کمرے میں چلیں مگر وہاں تو وہ آپا دھاپی مچی ہے کہ توجہ پراوبیں تجھ پر۔

(بینڈ باجے کی آواز آتی ہے۔ موٹروں کے ہارن بجتے ہیں "برات آگئی" "برات آ رہی ہے" کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور پھر نمسکار نمستے۔ نمستے۔ ہیلو۔ ہیلو کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا)

ایک آواز۔ دولہا میاں آگے آئیے نا۔

دوسری آواز۔ اری اوشا کے دولہا ہیں تو بڑے بانکے۔

تیسری آواز۔ اجی اس طرف آئیے۔

(ہنسی۔ قہقہے۔ براتیوں کو بٹھا دیا جاتا ہے)

(۶)

(باجے دھیمے دھیمے سروں میں بج رہے ہیں)

پریم۔ (بلند آواز سے سدرشن کو بلاتے ہوئے) سدرشن! سدرشن! پتا جی سدرشن کہاں ہے۔

سدرشن۔ کیوں بھئی پریم کیا بات ہے۔

پریم۔ سدرشن ذرا میری بات سُن جاؤ۔

سدرشن (مسکراتے ہوئے) آیا بھیا۔

ایک مہمان۔ اچھا تو یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے۔

دوسرا مہمان۔ جی ہاں۔ اکلوتا۔ ابھی ابھی ولایت سے آیا ہے۔

پہلا مہمان۔ بہت خوب! لیکن بہت خاموش طبیعت پائی ہے کل سے آئے ہیں مگر . . . .

[وقفہ]

سدرشن (ہنس کر) کیوں پریم تم یہاں اکیلے کیوں آ کھڑے ہوئے کیا بات ہے۔!

پریم۔ (آہستہ سے) سنو! سدرشن! آج دوسرا دن ہے میں لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔

سدرشن۔ (حیرت سے) ارے! پاگل ہو اس وقت یہ بات اٹھانی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

پریم۔ (غصہ سے) یہ الو کیسے بنا رہے ہو میں لڑکی کو پہلے ضرور دیکھوں گا۔

[وقفہ]

ایک مہمان۔ جی ہاں۔ جتنا اونچا گھرانا سیٹھ ہردیال جی کا ہے اسی کے مطابق ہی انہیں بھی ملا۔

دوسرا مہمان۔ (حقے کا کش لگاتے ہوئے) ہاں مہاراج اچھوں کو اچھے ہی ملتے ہیں۔

پہلا مہمان۔ تو برات آج شام کو واپس جا رہی ہے نا۔

دوسرا مہمان۔ جی ہاں۔

ایک مہمان۔ (جمائی لے کر) پرشوتم داس کے کہنے پر تھوڑا تھوڑا کہتے بھی بہت کچھ کھا لیا۔ اب جو حقہ کے دو کش لگائے ہیں تو نشہ سا ہو رہا ہے۔

دوسرا مہمان۔ اجی شادی بیاہ کے موقعہ پر ناناکرتے بھی بدپرہیزی ہو ہی جاتی ہے۔

[وقفہ]

پریم۔ (ذرا بلند آواز سے) سدرشن! ایک دفعہ اچھی طرح سن لو خوب اچھی طرح میں لڑکی سے ضرور ملوں گا۔

سدرشن۔ (عاجزی سے) پرماتما کے لئے اونچی نہ بولو۔ لوگ سن لیں گے۔ خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔

پریم۔ (بظاہر متانت سے) سدرشن جو میں کہہ رہا ہوں وہی ہوگا۔

سدرشن (طیش سے مگر دبی آواز میں) یہ کیسے ہوسکتا ہے پریم ساری دنیا جنم میں تھوکے گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے بھیا۔

پریم۔ (بے پروائی سے) جب مجھ سے خود دھوکا ہو رہا ہے تو میں دنیا کو کیا کروں۔

(وقفہ)

ایک عورت۔ کیوں بہن سدا ما برات ساتھ والے مکان میں ٹھہری ہے یا پرے کوٹھی میں۔

سدا ما۔ ہاں بہن مکان میں تو جگہ کم تھی انہوں نے کوٹھی ہی خالی کروالی۔ دیکھتی ہو اس مکان میں تو ہم عورتوں کو بھی تکلیف ہو رہی ہے . . . لڑکیاں جہیز نکال رہی ہیں۔ میں نے سوچا ذرا اوشا کو ہی دیکھ آوں۔

عورت۔ پرماتما کرے جیسے اوشا یہاں ہنستی کھیلتی رہی ویسے ہی سسرال میں بھی سکھی رہے۔

سدا ما۔ بہن ہمارا تو بیٹا بھی یہی ہے اور بیٹی بھی یہی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اوشا چلی جائے گی تو میرے دن کیسے کٹیں گے۔ وہ ابھی اوشا کے کمرے میں گئے تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے اوشا یہاں سے چلی جائے گی تو مکان ویران ہو جائے گا۔ مگر اتنی تسلی ہے کہ جن سے ناطہ جوڑا ہے وہ لوگ اچھے ہیں۔

عورت۔ تو لڑکا اندر سے ہو گیا ہے۔

سدا ما۔ (ہنس کر) نہیں تو لڑکیوں نے غریب کو کہیں دھاگے سے بُنی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔ بے چارے کو کہیں چوٹ نہ آئی ہو۔ لڑکیاں ہیں شریر اور وہ ہے سیدھا سادا۔

[وقفہ]

سدرشن (عاجزی سے) چلو پریم بھیا۔ یہ وقت یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کا نہیں۔ سب کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔

پریم۔ (غصہ سے) مجھ سے دھوکا ہو رہا ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں تم سمجھتے ہو میں یہاں دھن دولت سمیٹنے کے لئے آیا ہوں۔

سدرشن۔ (آہستہ سے) پرماتما کے لئے کیا ہو گیا تمہیں۔ تمہارے خسر آرہے ہیں۔

پریم۔ میرے تو نہیں تمہارے ہی کچھ ہوتے ہوں گے۔

سیٹھ ہردیال۔ (شفقت آمیز لہجہ میں) کیوں پریم بیٹا یہ چھپ کر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ تمہیں تو بھئی کبھی سے اندر بلایا جا رہا ہے۔

سدرشن۔ (گھبرا کر) ہاں . . . . ہاں . . . . آئیے چچا جی۔

سیٹھ ہردیال۔ چلو نا بیٹا پریم۔

سدرشن۔ (گھبراتے ہوئے) چچا جی یہ . . . . . یہ . . . .

سیٹھ ہردیال (نرمی سے) ہاں، ہاں کہئے کہئے۔

سدرشن۔ نہیں۔ نہیں۔ بات تو کچھ نہیں یہ . . . .

سیٹھ ہردیال اجی مسٹر سدرشن آپ نڈر ہو کر کہئے۔ گھر کی بات ہے اب ہم کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔

سدرشن۔ (ذرا رک رک کر) چچا جی . . . . میرے کہنے کا مقصد یہ ہے . . . . میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ . . . . کہ ہم ایک پرائیویٹ بات کر رہے تھے۔

سیٹھ ہردیال۔ (ہنس کر) اوہو! ہاں ہاں بڑے شوق سے کیجئے۔

(سیٹھ ہردیال چلا جاتا ہے)

پریم۔ (نہایت سنجیدگی سے) بات یہ ہے سدرشن کہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔ میں تو اس ہندوستانی رواج کے مطابق شادی کرنے کا سرے سے قائل ہی نہیں سو ذرا پتا جی کو تو بلاؤ میں اُن سے بھی صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔

سدرشن۔ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ برات واپس چلی جائے۔

پریم۔ (بڑے وثوق سے) بالکل۔

سدرشن۔ یہ لو میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پرماتما کے لئے اپنے باپ کے سفید بالوں کا ہی خیال کرو۔ اس وقت ان کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے

پریم۔ (جھنجھلا کر) یہ تم لوگ مجھے انگلیوں پر کیوں نچا رہے ہو (ٹھنڈی سانس لے کر) سدرشن مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ باقی رہا شادی کا سوال تو میں جا رہا ہوں تم لوگ یہاں رنگ رلیاں مناتے رہو۔

(وقفہ)

سدا ما۔ (ذرا غصہ سے) توبہ! اوشا کے پتا جی کو کچھ سوجھتے بھی۔ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر۔ لڑکی کو کبھی سے کپڑے پہنا رکھے ہیں۔ بلاتے بلاتے پنڈت جی کا گلا بیٹھ گیا۔ موڑ پہ ہار اور پھول سوکھے جا رہے ہیں لڑکا بے چارہ الگ باہر بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوگا۔ ان جیسا بھی بھلا کوئی بدھو ہوگا۔

(وقفہ)

پریم۔ میرے خیال میں پتاجی سے تو اس وقت کچھ کہنا فضول ہے۔ اچھا تو
پھر الوداع۔

سدرشن۔ (افسردگی سے) پریم ٹھہرو۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ (ٹھنڈی سانس)
میں کوشش کرتا ہوں کہ لڑکی سے تمہاری ملاقات ہو جائے۔

پریم۔ نہیں سدرشن۔ نہیں تم مجھے جانے دو۔ میرے لئے شاید یہی
بہتر ہوگا۔

سدرشن۔ (افسردگی سے) نہیں۔ نہیں تم ایک گھنٹہ تک اور انتظار کرو۔
لیکن خاموشی سے ۔ ۔ ۔ جو کچھ میرے بس میں ہے میں وہ کر دوں گا۔

(۷)

(سدرشن اور اس کی بڑی بہن ایک کمرے میں کھڑے ہیں)

شیاما۔ سدرشن بھئی کیا بات ہے دولہا جیا اندر کیوں نہیں آتے۔ ارے
کمبخت بخار تو کہیں پھر نہیں ہو گیا۔ تمہارا چہرہ اُترا ہوا سا کیوں ہے؟

سدرشن۔ (دبی آواز میں) جی جی تم دولہا کو اندر بلوا رہی ہو اور وہ ہاں کام
ہی بگاڑ رہا ہے۔

شیاما۔ (چونک کر) کیوں کیا ہوا۔

سدرشن۔ پریم تو واپس لوٹ رہا ہے ۔ ۔ ۔ کوئی سُن تو نہیں رہا۔

شیاما۔ (حیرت سے) نہیں نہیں۔ کیا ہوا کیا؟

سدرشن۔ بس وہ یہی کہتا ہے کہ میں لڑکی سے پہلے ملنا چاہتا ہوں۔

شیاما۔ (فرط حیرت سے) یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ یہ ادھرم کبھی سننے میں بھی
آیا ہے۔ انہیں اپنی لڑکی بھاری نہیں۔ وہ یہ توہین برداشت
نہیں کریں گے۔

سدرشن۔ جی جی آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔

شیاما۔ تو تم نے اس پاگل کو کچھ سمجھایا ہوتا۔

سدرشن۔ سمجھایا! میں نے اُسے مشکل سے ایک گھنٹہ کے لئے روکا ہے

شیاما۔ (مایوس لہجہ میں) تو اب کیا ہوگا۔

سدرشن۔ ہو کیا سکتا ہے بس یہی کہ تم چپکے چپکے کسی طرح لڑکی سے پریم
کی ملاقات کرادو۔

شیاما۔ کہیں تم بھی پاگل تو نہیں ہو گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُدھر
پنڈت جی شلوک پڑھنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ اور ادھر یہ بھی
معلوم نہیں کہ شادی ہوگی یا نہیں۔

سدرشن۔ (ایک لمبی سانس لے کر) کاش اس وقت زمین پھٹ جائے

اور ہم سب اس میں سما جائیں۔ کون جانتا ہے کہ ابھی اسی گھر
میں کہرام مچنے والا ہے۔

شیاما۔ ایک بات ہو سکتی ہے۔ سدرشن! میں دل آرام کو سب کچھ
بتائے دیتی ہوں۔

سدرشن۔ وہ کون ہے؟

شیاما۔ اوشا کی سہیلی ہے مگر وہ بھی کیا کرے گی؟ اس وقت تو اوشا کو کوئی
ایک منٹ کے لئے بھی اٹھنے نہ دے گا۔

سدرشن۔ اور اگر اس سہیلی نے الٹا سب کو بتا دیا تو پھر؟

شیاما۔ پھر جو کچھ ہوگا اُس کا انتظار کرو میں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔ اچھا
تو اب تم جاؤ اگر ضرورت ہوئی تو تمہیں پھر بلوا بھیجوں گی۔

(۸)

(اوشا اور شیاما ایک جگہ اکیلی کھڑی ہیں)

شیاما۔ (سانس پھول رہی ہے) دل آرام ۔ ۔ ۔ دل آرام

دل آرام۔ (ہنستے ہوئے) اری شیاما کیا کسی دوڑ میں اول رہ کر آئی ہو۔
بڑی ہانپ رہی ہو۔

شیاما۔ دل آرام میری بات سن جاؤ۔ جلدی

دل آرام۔ کیا دولہا آرہے ہیں۔

شیاما۔ (گھبراہٹ میں) نہیں نہیں۔ چلو گی بھی؟

دل آرام۔ اوہو ایسی بھی کیا بات ہو گئی؟

شیاما۔ (آہستہ سے) دل آرام غضب ہو گیا۔ دولہا واپس لوٹ رہے ہیں۔

دل آرام۔ (چونک کر) کیوں؟

شیاما۔ وہ کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ وہ کہتے ہیں میں پہلے لڑکی سے ملنا چاہتا
ہوں۔ وہ کسی طرح نہیں مانتے تم ۔ ۔ ۔ تم۔

دل آرام۔ (حیران ہو کر) یہ کیسی باتیں کر رہی ہو شیاما!

شیاما۔ (گھبراہٹ میں جلد جلد) وہ کہتے ہیں میں اس طرح شادی
نہیں کروں گا۔ مجھ سے دھوکا ہو رہا ہے۔ ابھی یہ بات باہر نہیں
نکلی۔ تم چپکے سے کہیں اوشا اور دولہا کی ملاقات کرادو۔ نہیں تو
اندھیر مچ جائے گا۔ قیامت آجائے گی۔ دنیا بدل جائے گی۔

دل آرام۔ نہیں شیاما یہ بات اَن ہونی ہے۔ مگر اوشا ۔ ۔ ۔ اوشا جیسی
سندر لڑکی جسے چاند بھی دیکھ کر شرما جائے۔ انہوں نے بہت
غلطی کی۔ وہ زیادتی کر رہے ہیں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

شیاما۔ یہ باتیں تمہارے لئے تم اوشا کو کچھ سمجھاؤ۔ وہ تمہارا کہنا مان جائے گی
تم دو گھروں کو ذلت سے بچا سکتی ہو دل آرام۔

دل آرام۔ یہ مٹا ولایت سے کیا ہو آیا۔ اس کا تو بھیجا ہی الٹ گیا۔ دوسروں
کی عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اور بیچاری اوشا سے یہ سلوک جس
کے روپ کی کرنوں سے سارا گھر روشن ہے۔

شیاما۔ اُف میرا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اب کیا ہوگا!

دل آرام۔ شیاما میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہیں اوشا سے یہ بات کیسے
کہوں! برات واپس چلی جائے تو چلی جائے گر وہ اسے اپنی توہین سمجھے گی۔

(ایک لڑکی ہانپتے ہوئے دل آرام کو بلاتی آ رہی ہے)

دل آرام۔ (آہستہ سے) ارے وہ ملا آ رہی ہے۔

شیاما۔ (ہنستے ہوئے بات بدل کر بلند آواز سے) تو دل آرام دولھا
ابھی اندر آنے والے ہیں بس اب وہی شرارت ہوگی۔

لڑکی۔ (نزدیک آ کر) دل آرام! دل آرام! تم نے کچھ سنا تم نے کچھ سنا!

دل آرام۔ کیوں کیا ہوا؟

لڑکی۔ شیاما نے تمہیں بتایا نہیں ابھی اپنے بھائی سے چھپ کر کیا
باتیں کرائی ہے۔ لڑکا کہتا ہے میں لڑکی کو دیکھ کر شادی کروں گا۔

(دل آرام اور شیاما بناوٹی قہقہہ لگاتی ہیں)

شیاما۔ کیوں تجھے نارا آیا ہے ارے یہ میں ابھی بھیا کو کرشن کے بیاہ کی باتیں
سنا رہی تھی اس کے بھی کان میں کچھ پڑ گیا ہوگا۔

دل آرام۔ اچھا شیاما وہی کرشن جسے دولھا نے شادی سے پہلے دیکھا
تھا؟

شیاما۔ وہی تو اس کا پتی آیا ہوا ہے نا یہاں جبھی تو بھیا پوچھ رہے تھے۔

لڑکی۔ (جھینپ کر) اچھا تو میں سمجھی تم ہمارے دولھا کی باتیں کر رہی ہو۔

شیاما۔ جا پہلے کانوں میں تیل ڈلوا۔ پھر بازار سے اگر تھوڑی سی عقل
ملے تو ضرور خرید لیجو (پچکارتے ہوئے) جا میری بہن!

دل آرام۔ اچھا ملا تو چل کرسی سے دولھا کا کوٹ باندھنے کے لئے
تھوڑا سا دھاگہ بٹ لے میں کاغذ پر FOOL لکھ کر ابھی آئی۔

(لڑکی چلی جاتی ہے)

شیاما۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) مجھے ایسے معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے
ساری دنیا ڈوبتی ہوئی نیا کی طرح ہچکولے کھا رہی ہے (پھر
ٹھنڈی سانس لیتی ہے) تم نے سن لیا۔ یہ کترنی ابھی ڈھنڈورا

پیٹے دیتی ہے۔

دل آرام۔ اچھا تو ٹھہر میں دیکھ آؤں اوشا کے پاس کون کون بیٹھا ہے۔

شیاما۔ (آہستہ سے) بس سب کچھ پندرہ منٹ میں۔ پانی سر سے
گزر رہا ہے تم اتنے تھوڑے سے وقت میں اُسے اتنی لمبی بات
کیسے سمجھاؤ گی۔ وہ ڈر جائے گی۔ کانپ جائے گی۔ اس کی سمجھ
میں کچھ نہیں آئے گا۔

(وقفہ)

ایک عورت (پیار سے آواز دیتے ہوئے) دل آرام . . . . دل آرام
کہاں بھاگی جا رہی ہو۔ بیٹی ذرا میری بات تو سن جائیو۔

دل آرام۔ (جلدی سے) بھابھی ابھی آئی۔ میں ذرا اوشا کے پاس جا رہی
ہوں۔ آپ کھانا کھانے کو کہہ رہی ہوں گی۔ میں تو کھا چکی۔

عورت۔ اری نہیں ادھر تو آ تجھے ایک ہنسی کی بات سناؤں (پھر آہستہ
سے) چھوٹا کرشن ابھی آ کر مجھ سے کہنے لگا بھابھی دولھا بھیا تو
جا رہے ہیں میں بھی اُن کے ساتھ جاؤں گا بچہ سا تو ہے ہی منہ
بنا کر کہنے لگا بھابھی تم دی دی سے کہو نا . . . دی دی
اوشا کو کہتا ہے . . . . دولھا بھیا سے پہلے مل لیں (پھر ہنس کر) نہ
جانے کیا سن آیا ہے اور کیا کہہ گیا ہے۔

دل آرام۔ (ہنس کر) بڑا شریر ہے۔

عورت۔ اوشا کی ماں کو ذرا میری طرف بھیجیو اری لڑکا اندر کیوں نہیں آتا
کیا قسم کھا رکھی ہے؟

دل آرام۔ (جیسے کچھ سنا ہی نہیں ہیں) اوشا کے پاس جا رہی ہوں۔
مجھے ذرا جلدی ہے۔

عورت۔ اری بات تو سن جاؤ۔

(وقفہ)

سدا ما۔ (خفا ہو کر) اوشا کے پتا جی شکر ہے۔ آپ بھی اندر آئے یہ بات
کیا ہے آخر آپ لڑکے کو اندر بلانے میں کیوں ہچکچا رہے ہیں
بس سگریٹ کوئی منہ میں ٹھونس دے پھر انجن کی طرح چلتا رکھنا
ان کا کام ہے۔

سیٹھ ہردیال۔ بھئی ناحق خفا رہی ہو۔ وہ لوگ کچھ صلاح مشورہ کر رہے
ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں۔ تم تو ایسے کر رہی ہو جیسے کہیں گاڑی
سوار ہونا ہے۔

(وقفہ)

ایک لڑکی۔ (آواز دے کر) دل آرام . . . دل آرام ٹھہر جاؤ بہن ذرا میری نئی ساڑھی تو دیکھ جاؤ۔

دل آرام۔ بکواس مت کرو جی۔

لڑکی۔ واہ! تیری پھرتی

(وقفہ)

(شیاما دل آرام کو آوازیں دیتے ہوئے ڈھونڈ رہی ہے)

شیاما۔ ارے کسی نے دل آرام کو کہیں دیکھا ہے۔

دل آرام۔ (فوری جواب دیتے ہوئے) شیاما میں یہاں ہوں۔ ڈریسنگ روم میں۔

شیاما۔ (جل کر) اری کمبخت تو اس وقت آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر کیا کر رہی ہے تو آئی کہاں تھی۔

دل آرام۔ (ہنس کر) دیکھ تو میرے کپڑے ٹھیک ہیں؟

شیاما۔ (غصہ سے) بھاڑ میں جائیں تیرے کپڑے۔ تو اوشا کے پاس آئی تھی یا اپنا روپ دیکھنے۔ جی چاہتا ہے سر ہی پیٹ لوں۔

دل آرام۔ گھبراتی کیوں ہو سر پیٹیں تمہارے دشمن۔

شیاما۔ (جل کر) دل آرام تیرا ہی دل اس وقت ٹھنڈا ہوگا میری تو جان نکل رہی ہے۔

دل آرام۔ نہ بھئی اس وقت نہ مرنا۔

شیاما۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ اب بس بھی کروگی یہ سنگار۔

دل آرام۔ (جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو چپ کراتے ہوئے) "بس بس۔ بس۔ اب سیدھی اوشا کے پاس جا رہی ہوں۔

شیاما۔ (گھبرا کر) لیکن سنو تو۔ کالج کی لڑکیوں نے اس کے کمرے میں بڑا ہجوم کر رکھا ہے۔ عورتیں اُسے گھیرے بیٹھی ہیں۔ تم اُسے یہ سب کچھ سمجھاؤ گی کہاں۔ اری میری ایک اور بات تو سن جا۔ ہائے پرماتما میں کس کے پلے پڑی ہوں۔

(وقفہ)

ایک لڑکی۔ (کپڑا سینے کی مشین چلاتے ہوئے) اونہہ . . . اُدھر دولہا اندر آرہے ہیں اور میں دلھن صاحبہ کے بیٹی کوٹ سینے لگی ہوں۔

(مشین چلتی ہے)

"پہلے سوئی ہوئی تھیں نا"

(مشین چل رہی ہے)

(جھنجلا کر) اری کمبخت یہاں تو سفید دھاگے کی کوئی ریل ہی نہیں"

(مشین چلتی ہے اور پھر کپڑا پھاڑنے کی آواز آتی ہے)

(۹)

(شیاما اور دل آرام کھڑی باتیں کر رہی ہیں)

شیاما۔ تو دل آرام پھر کون سا کمرہ ٹھیک رہے گا، جلد بتا۔

دل آرام۔ شیاما میں تو کہتی ہوں اوشا کا میوزک والا کمرہ بالکل ٹھیک ہے، وہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔ سب کمروں سے الگ ہے۔

شیاما۔ تو تم اوشا کو کس راستہ سے بھیجو گی۔

دل آرام۔ (ہنستے ہوئے) یہ سب باتیں مجھ پر چھوڑو تم اپنے بھائی جان سے کہہ دو دولہا کو پچھلے راستہ سے اُدھر کی سیڑھیوں میں چھوڑ جائیں۔ وہاں انہیں کوئی نہ دیکھے گا۔ ہاں تو تم خود اُس کمرے میں جا کر ایک منٹ پہلے ہی بیٹھ جانا۔

شیاما۔ (جھینپ کر) نہیں بھئی دل آرام میں تو وہاں نہیں جاؤں گی پریم سدرشن بھیا کے لاکھ دوست ہوں مگر میں تو اُن کے سامنے کبھی گئی نہیں۔ بھئی مجھے شرم آتی ہے۔

دل آرام۔ واہ تم نظریں نیچی کئے بیٹھی رہنا . . . . بس شیاما اب یہ وقت بحث کرنے کا نہیں۔

شیاما۔ (ہنس کر) اچھا بھئی یوں ہی سہی، اوشا سے کہہ دینا وہاں سمٹ سمٹا کر بیٹھ جائے اور صرف ایک بار جھکی جھکی آنکھوں سے ذرا دیکھ لے بس پھر اُس انگریز کے بچے کو غش نہ آگیا تو میرا نام شیاما نہیں۔

دل آرام۔ (ہنس کر) بڑی شریر ہو شیاما۔

شیاما۔ (ہنس کر) اچھا تو اب جلد جاؤ ماں گُمی ہوں گی نہیں۔

(۱۰)

(اوشا کا میوزک روم۔ شیاما اندر کھڑی ہے)

شیاما۔ سدرشن آگئے۔

سدرشن۔ جیجی پریم نیچے کھڑا ہے۔

شیاما۔ ہاں بس تو پھر انہیں اوپر بھیج دو اور دیکھو انہیں بتا دینا کہ کمرے میں پہلے ایک اور لڑکی کھڑی ہوگی، اُس کے بعد اوشا آئے گی۔ ہاں اور دیکھو دولہا کو یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ سمجھے؟

سدرشن۔ (خوشی سے) O. K جیجی، بس پریم اوپر آرہا ہے

(دل آرام ایک نفیس سا لباس پہنے اندر داخل ہوتی ہے)

شیاما۔ (چونک کر) ارے دل آرام تم ہو!۔

دل آرام۔ (انگلی دانتوں میں دبا کر آہستہ سے) خاموش ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اوشا کہو۔

شیاما۔ (گھبرا کر آہستہ سے) دل آرام دولھا اندر آ رہے ہیں۔

دل آرام (آہستہ سے) چُپ

(پریم کمرے میں داخل ہوتا ہے)

شیاما۔ (گھبرا کر) دولھا بھیا ۔ ۔ ۔ ۔ دولھا بھیا بیٹھئے میں دلھن کی سہیلی

ہوں اور یہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ

پریم۔ (ذرا ہنس کر) اُفوہ! آپ اِن کا نام لینے سے کیوں گھبرا رہی ہیں۔ چلئے میں بتائے دیتا ہوں۔ اِن کا نام اوشا ہے۔

دل آرام۔ (متانت سے) جی ہاں فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

پریم۔ آپ کی ۔ ۔ ۔ آپ کی تعلیم ۔ ۔ ۔ ۔

دل آرام۔ (فقرہ ختم ہونے سے پہلے) صرف بی اے تک۔

(خاموشی)

دل آرام۔ کچھ اور فرمائیے گا۔

پریم۔ آپ کو راگ سے بھی ضرور لگاؤ ہوگا۔

دل آرام۔ جی ہاں میں ستار بھی بجا لیتی ہوں اور وائلن بھی۔

پریم۔ آپ کو ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ یہ لیجے میں آپ کو ستار دیتا ہوں۔ یہ آپ ہی کی ہوگی۔ صرف دو تین منٹ کے لئے ذرا تار چھیڑ دیجئے۔ ارے اب آپ نے گھونگٹ کیوں نکال لیا؟

(ستار کے دلنشیں نغموں سے کمرے کی فضا معمور ہو جاتی ہے)

پریم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہت خوب شکریہ۔ آپ تو خوب بجاتی ہیں۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ آپ ۔ ۔ ۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ تو ۔ ۔ ۔ ۔ بھلا اس سے بڑھ کر ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے آپ سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ میں آپ کو دیکھ کر اب کیا کہوں (پھر ہنس کر) تکلیف کے لئے بہت بہت شکریہ اب آپ تشریف لے جا سکتی ہیں اور دیکھئے یہ لیجئے انگوٹھی اگر آپ نے اِسے اسی وقت نہ پہن لیا تو ۔ ۔ ۔ (پھر ہنس کر) میرا نام تو آپ ضرور جانتی ہوں گی۔

دل آرام۔ انگریز چند سنا ہے۔

پریم۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) اچھا تو انگریز چند کو اجازت دیجئے میں آپ سے اسی لئے ملنے آیا تھا کہ ذرا جلدی کروا دیجئے میرا کہنا تو کوئی مانتا نہیں کوئی اندر ہی نہیں بلاتا۔

(۱۱)

(اوشا اور پریم اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں)

پریم۔ (ہنستے ہوئے) کہیے آپ کو کوٹھی پسند آ گئی۔

اوشا۔ (شرماتے ہوئے آہستہ سے) جی ہاں۔

پریم۔ (ہنستے ہوئے) اور یہ انگریز چند

(اوشا ذرا ہنس دیتی ہے)

پریم۔ خیر میں تو آپ کا قائل ہو گیا ہوں بعض دفعہ انسان جو کچھ سمجھتا ہے بعد میں بالکل اُس کے اُلٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ بعض دفعہ کتنا غلط ثابت ہوتا ہے۔

اوشا۔ (آہستہ سے) جی ۔ ۔ ۔ ۔ ای

پریم۔ (ہنس کر) آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہیں نا۔

اوشا۔ جی نہیں۔

پریم۔ یہی کہ بعض دفعہ وہ ایک پھول کو بھی جس کی ایک ایک پتی ۔ ۔ ۔ ۔

اوشا۔ (بات کاٹتے ہوئے مذاق کے طور پر) آپ شاعر بھی ہیں۔

پریم۔ (ذرا ہنستے ہوئے) شاعری سے مجھے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور ہے مگر آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟

اوشا۔ میں آپ کی باتیں سمجھ نہیں رہی۔

پریم۔ (ہنس کر) اُفوہ! میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک میں نے آپ کو دیکھا نہ تھا۔ میں کتنے عجیب وہموں میں پھنسا ہوا تھا اور اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میں آپ کی نظروں میں ۔ ۔ ۔

اوشا۔ آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟

پریم۔ کل میں نے وہاں آپ کو اچھی طرح دیکھا نہ تھا اُس وقت بھی تو آپ کسی سے کم نہ تھیں لیکن اس وقت تو بس رُوپ کی دیوی ہی دکھائی دیتی ہیں ۔ آپ کی اُس شریر سی سہیلی کا کیا نام ہے؟ بڑی پردھان بنی پھرتی تھی! ہاں شاید دل آرام۔ جب میں اندر گیا تو اُس نے اپنی عجیب عجیب شرارتوں سے میرا ناک میں دم کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو شاید جتنا خوبصورت سمجھتی ہے۔ اتنی ہے نہیں بچاری۔

اوشا۔ کیوں آپ نے اس کی شکل میں کیا نقص دیکھا۔

پریم۔ تو اُس کی شکل آپ سے تھوڑی سی بہت ملتی جلتی ہے۔ گر وہ ایسی ہے کہ ایک جھلک میں شاید کسی کو خاص اچھی لگے لیکن ذرا غور کریں تو اس کی شکل میں کوئی کمی سی نظر آنے لگتی ہے۔ (پھر ذرا ہنس کر) اور بعض شکلیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اُن کی طرف آدمی جتنا دیکھے اتنی ہی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

اوشا۔ (پریم کی بات سمجھنے کے باوجود) کم از کم میں نے تو ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی آپ جیسے بیوٹی اکسپرٹ ہی جانتے ہوں گے!

پریم۔ (ہنس کر) جانتا تو میں بھی نہ تھا۔ صرف اس سے شناسائی ہو گئی ہے۔ . . . اچھا ذرا ستار۔ تو سنا دیجئے۔ آپ نے کس ماہر سے ستار بجانا سیکھا تھا۔

اوشا۔ جس سے آپ نے دوسروں کو الّو بنانا سیکھا تھا۔

پریم۔ بھئی خوب میں تو سچ مچ کہہ رہا ہوں۔ اچھا تو یہ لیجئے نا ذرا ستار، بس کل ہی کی طرح۔

اوشا۔ (ذرا شرما کر) میں اتنا اچھا بجاتی تو نہیں لیکن اگر آپ مجبور کرتے ہیں تو . . . (ستار کے ایک تار کو چھیڑتے ہوئے) معلوم نہیں میں آپ کی بعض باتوں کا مطلب کیوں نہیں سمجھتی۔

پریم۔ (چونک کر) ارے آپ نے میری انگوٹھی کیوں اتار دی۔

اوشا۔ (حیران ہو کر) کون سی انگوٹھی؟ دونوں تو پہن رکھی ہیں۔

پریم۔ (حیران ہو کر) اور کل والی کیا ہوئی؟ وہ میں نے آپ کو رکھ چھوڑنے کے لئے تھوڑا ہی دی تھی۔

اوشا۔ شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔

پریم۔ کل جب آپ مجھ سے ملنے آئی تھیں اُس وقت جو انگوٹھی میں نے آپ کو دی تھی۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔

(نوکر اندر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ حضور آپ کو کوئی بی بی جی ملنے آئی ہیں۔

اوشا۔ (خوشی سے اچھل کر) اوہو! دل آرام مجھے لینے کے لئے آئی ہو گی۔

(دل آرام کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

دل آرام۔ (آتے ہی قہقہہ لگاتے ہوئے) دولہا بھائی نمسکار۔ یہ دیکھئے آپ کی دی ہوئی انگوٹھی میرے ہاتھ میں کیسی اچھی لگتی ہے۔

اوشا۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) امی دل آرام تو بڑی شریر ہے ان سے کہیں پہلے ہی مل آئی ہے

دل آرام (ہنستے ہوئے) سنو اوشا میں نے اور شیاما نے جیجا جی سے ادھر اُدھر کی چار باتیں کیں۔ میں نے ستار سنایا۔ یہ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اپنی انگوٹھی ہمیں انعام میں دے دی اور تم سے کیا کہہ رہے تھے۔

اوشا۔ (ہنس کر) مجھ سے بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے اور کیا

دل آرام (ہنستے ہوئے) اچھا اوشا یہ سنبھالو اپنی انگوٹھی۔

پریم۔ نہیں نہیں۔ اب آپ کو یہ پھر انعام میں دی جاتی ہے۔ آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا (پھر ذرا گھبرا کر) جگو ایک گلاس پانی۔

دل آرام۔ اوشا تمہارا ڈریسنگ روم کہاں ہے۔ میں لباس تبدیل کروں گی۔

اوشا۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) برآمدہ میں سے ہو کر اگلا کمرہ۔ مگر ٹھہر تو جاؤ۔

دل آرام۔ نہیں میں ابھی آئی۔

(دل آرام چلی جاتی ہے)

اوشا۔ (ہنس کر) مجھے بتایئے تو۔ اس نے آپ سے کوئی بڑی دلچسپ شرارت کی ہے۔

پریم۔ (ذرا ہنس کر) نہیں (نہیں بات تو کچھ نہیں۔ جگو ایک گلاس پانی۔

(پردہ گرتا ہے)

فاروق علی خاں

غزل

کب تک یہ بارِ ہجر اٹھایا کرے کوئی؛ کب تک سرشکِ خون بہایا کرے کوئی؟
کب تک مزارِ حسرت وارمان و یاس پر شمعِ اُمید و بیم جلایا کرے کوئی؟
کب تک غمِ فراق میں اُٹھ اُٹھ کے رات کو دامن کو لالہ زار بنایا کرے کوئی؟
کب تک بنا بنا کے نشانِ قدم ترا سجدوں سے میری جان! بسایا کرے کوئی؟
کب تک فریبِ لطف کی دے کر تسلیاں بے تاب دل کو صبر سکھایا کرے کوئی؟
کب تک ترے وصال کی شیریں امید پر بستر پہ لا کے پھول بچھایا کرے کوئی؟
کب تک ہنسی ہنسی میں غمِ دل کا ماجرا احباب راز جُو سے چھپایا کرے کوئی؟
کب تک سرابِ وعدۂ عشرت فروز پر آنکھوں کو فرشِ راہ بنایا کرے کوئی؟
کب تک ہر ایک چیز پہ لکھ لکھ کے تیرا نام رُسوائیوں کے ڈر سے مٹایا کرے کوئی؟
کب تک گدازِ ہجر کی رُودادِ خونچکاں پیکِ مہ و صبا کو سُنایا کرے کوئی؟

کب تک وفورِ یاس میں ہو ہو کے دل فگار
دستِ دُعائے مرگ اُٹھایا کرے کوئی؟

شہید ابن علی

قائم شدہ ۱۹۱۹ء

جوپیٹر جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہیڈ آفس بمبئی!!

بیمہ زندگی۔ آگ۔ موٹر کے لئے بہترین کمپنیوں میں سے ایک ہے:

منظور شدہ سرمایہ ۵ کروڑ روپیہ، فروخت شدہ سرمایہ۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ، اداشدہ سرمایہ۔ ۲۳۷۴۸۰۰ روپیہ

لائف فنڈ ۵۵۱۸۱۲۷۱ روپیہ - کل اثاثہ ۶۵۴۰۵۴۸

بونس
تا زندگی پالیسیوں پر ـــــ ۱۰ روپے فی ہزار فی سال
میعادی پالیسیوں پر ـــــ ۱۴ روپے فی ہزار فی سال

خاص خصوصیتیں (۱) ناکارہ ہو جانے کا مفاد (۲) توسیع یافتہ بیمہ (۳) حادثات سے موت ہو جانیکی صورت دُگنا زر بیمہ کی ادائیگی (۴) ناقابل ضبطیت کا مفاد (۵) سالانہ پریمیم کی صورت میں ۲½ فیصدی کمی۔ (مزید حالات دریافت کیجئے)

برانچ منیجر۔ دی مال لاہور

ضبطِ عشق

مری پردہ نشیں میرے لئے رسوا نہ ہو جائے
زمیں پر اک بہشتی گیت کی آواز ہے نجمہ

یہی باعث ہے اظہارِ محبت سے میں ڈرتا ہوں
ابھی کیوں کھینچ لاؤں اس کو ارمانوں کی دنیا میں!

جگر کو تھام لیتا ہوں جب آہِ سرد بھرتا ہوں
گنہگاروں کی بستی یعنی حیوانوں کی دنیا میں

بہت مشکل ہے ضبطِ عشق لیکن ضبط کرتا ہوں
وہ حورِ آسمانی اور انسانوں کی دنیا میں؟

کہیں اس حسنِ چہرہ پوش کا چرچا نہ ہو جائے
مجسّم نور ہے، اک آسمانی راز ہے نجمہ

~~~

مری نجمہ ستاروں کی طرح معصوم ہے اب تک
وہ نذرِ موجۂ آلام ہونے کے نہیں قابل،

ابھی اس کی جوانی کو میں کیوں دوزخ بنا ڈالوں
میں اپنے آپ کو نذرِ غم و آلام کر لوں گا

ابھی کیوں اس کو احوالِ دلِ شیدا سنا ڈالوں
ہر آسائش کو وقفِ گردشِ ایّام کر لوں گا

ابھی کیوں داغ ہائے سینۂ سوزاں دکھا ڈالوں
میں بدنامِ محبت خود ہی کو بدنام کر لوں گا

وہ سینہ، سوزِ دردِ عشق سے محروم ہے اب تک
وہ شرمیلی نظر بدنام ہونے کے نہیں قابل!

~~~

سیّد ضمیر جعفری بی۔اے

اِس
دُنیا میں

نوبل کا اینٹی ملیریا
NOBLE'S
ANTI MALARIA
پلورائیڈ
نسخہ کونین ہائی ڈرو کلورسنکو ڈین
ایسڈ آرسینوس ایک روپیہ بارہ گرین
ایسڈ کاربولک ایک روپیہ آٹھ آنہ گرین
اکسٹریکٹ نکس وامیکا چار آنہ گرین
کیپسین منتھول وغیرہ
خوراک ایک گولی سے دو گولی
دن میں دو یا تین بار
جو ٹائیفائیڈ کے علاوہ باقی سب بخاروں کا علاج ہے۔ ملیریا
انفلوانزا اور بڑھی ہوئی تلی کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔
خوراک ایک گولی دن میں دو بار۔ پچاس اور سو کی بوتلوں میں۔
قیمت پچاس والی پندرہ روپے فی درجن۔ سو والی ستائیس روپے
فی درجن۔ ہر دوا فروش سے مل سکتا ہے
سول ایجنٹ
ایم اے جے نوبل نمبر ۱۰۹ پارسی بازار سٹریٹ فورٹ بمبئی

کاکی

اُس دن بڑے سویرے جب شیامو کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گھر میں کہرام مچا ہوا ہے اُس کی کاکی اُوما سر سے پیر تک کپڑا اوڑھے نیچے ایک کمبل پر پڑی ہوئی ہے اور گھر کے سبھی لوگ اُس کو گھیرے ہوئے ہیں اور رو رہے ہیں

لوگ جب اُوما کو جلانے کے لئے "شمشان گھاٹ" پر لے جانے لگے تو شیامو نے بڑا ادبلا مچایا۔ لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ اُوما کے اوپر ہی جا گرا۔ روتے ہوئے وہ بولا "کاکی تو سو رہی ہے اس کو اس طرح باندھ کر کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں ہرگز نہ لے جانے دوں گا۔"

لوگوں نے بڑی مشکل سے اس کو ہٹایا۔ کاکی کا چتا پر جلنا وہ نہ دیکھ سکتا تھا اس لئے ایک نوکرانی "رام رام" کہہ کہہ اس کو کسی طرح گھر ہی پر سنبھالے رہی۔

اگرچہ کئی عقلمند بزرگوں نے شیامو کو یقین دلایا کہ اس کی کاکی اس کے ماموں کے یہاں گئی ہوئی ہے لیکن یہ جھوٹ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ پاس پڑوس کے ناسمجھ لڑکوں کی زبان سے یہ راز فاش ہو ہی گیا۔ یہ بات اس سے چھپی نہ رہ سکی کہ "کاکی" کہیں اور نہیں "اوپر رام" کے یہاں گئی ہے!

کاکی کے لئے کئی دنوں تک مسلسل رو رو کر آخر اس کا رونا تو بند ہو گیا مگر اس کا غم کسی طرح غلط نہ ہو سکا جس طرح بارش ختم ہونے کے دو تین دن بعد ہی زمین کے اوپر کا پانی تو نہیں رہتا مگر اندرونی سطح کی نمی جوں کی توں باقی رہتی ہے شیامو اکثر تنہائی میں بیٹھ کر آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن اُس نے اوپر ایک پتنگ اڑتا ہوا دیکھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر اس کا دل یکایک کھل گیا۔ وہ بشیشور کے پاس جا کر بولا "کاکا مجھے ایک پتنگ بھی منگا دو ابھی!" بیوی کی وفات کے بعد سے بشیشور اکثر کھوئے کھوئے سے اور اداس رہتے تھے۔ "اچھا منگا دوں گا" کہتے ہوئے وہ باہر چلے گئے۔

شیامو پتنگ کے لئے بے چین ہو گیا۔ ایک کھونٹی سے بشیشور کا کوٹ لٹک رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے اُس کے پاس ایک سٹول کھسکا کر رکھا اور اوپر چڑھ کر کوٹ کی جیب ٹٹولنے لگا۔ اس میں سے ایک چونی برآمد کر کے وہ فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

سکھیا مزدور کا لڑکا بھولا شیامو کا ہم عمر اور ساتھی تھا۔ شیامو نے چونی اس کے حوالے کر کے کہا "اپنی جیجی سے کہہ کر چپ چاپ ایک پتنگ اور ڈور میرے لئے منگا دے۔ دیکھنا خوب اکیلے میں لانا کہیں کوئی دیکھ نہ لے؟"

پتنگ آ گیا۔ ایک اندھیرے کمرے میں لے جا کر اس میں ڈور باندھی گئی۔ شیامو نے دھیرے سے کہا۔ "بھولا کسی سے نہ کہے تو ایک بات بتاؤں"۔

بھولا نے سر ہلا کر کہا "نہیں۔ کسی سے نہ کہوں گا۔"

شیامو نے پردہ فاش کیا "میں یہ پتنگ اوپر "رام" کے پاس بھیجوں گا اس کو پکڑ کر کاکی نیچے اتر سے گی میں لکھنا نہیں جانتا۔ نہیں تو اس کا نام بھی لکھ دیتا۔

بھولا شیامو سے زیادہ سمجھدار تھا۔ اُس نے کہا بات تو بڑی اچھی سوچی مگر ایک مشکل ہے۔ یہ ڈور تو بڑی پتلی ہے۔ اس کو پکڑ کر کاکی نہیں اتر سکتی اس کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہے۔ پتنگ میں موٹی رسی لگائی جائے تو بات بن جائے"۔ شیامو سنجیدگی سے غور کرنے لگا "بھولا نے بات لاکھ روپے کی سجھائی ہے لیکن آفت یہ ہے کہ موٹی رسی کس طرح منگائی جائے۔ پاس کوڑی نہیں اور جو لوگ کاکی کو بے رحمی سے نہ جانے کہاں پھینک آئے وہ بھلا اس کام کے لئے پیسے کب دینے لگے"!

اُس دن شیامو کو بڑی رات گئے نیند آئی۔

پہلے دن کی ترکیب پر عمل کر کے اُس نے بشیشور کا کاکی جیب سے ایک روپیہ نکالا! اور اُسے لے جا کر بھولا کے حوالے کیا اور کہا "دیکھ بھولا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو خوب اچھی اچھی دو رسیاں منگا دے اور سن۔ جواہر بھیا سے ایک کاغذ پر کاکی" لکھوا لینا۔ نام لکھا رہے گا تو پتنگ ٹھیک اُسی کے پاس پہنچے گا"!

دو گھنٹے کے بعد شیامو اور بھولا خوشی خوشی پتنگ میں رسیاں باندھ رہے تھے۔ اچانک اس کارِ خیر میں روڑا اٹکانے کے لئے بشیشور آ پہنچے۔ اُن کا منہ غصہ سے لال تھا۔ بھولا اور شیامو کو دھمکا کر انہوں نے کہا "تم نے ہمارے کوٹ سے روپیہ نکالا ہے؟"

بھولا ایک ہی ڈپٹ میں سہم کر مخبر بن گیا اور بولا "شیامو بھیا نے پتنگ اور رسی کے لئے نکالا تھا"! بشیشور نے شیامو کے گال پر زور کا تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "چوری سیکھ کر جیل جائے گا۔ اچھا تجھے اچھی طرح بتاتا ہوں" یہ کہہ کر دو طمانچے اور رسید کئے اور پتنگ پھاڑ کر بولے" اور یہ رسی کس لئے منگائی ہے"؟

بھولا نے کہا "انہیں نے منگائی ہے یہ کہتے تھے کہ اسی سے پتنگ تان کر رام کے یہاں سے کاکی کو اتاریں گے"! بشیشور کا دل یک بیک دھڑکنے لگا۔ انہوں نے پھٹا ہوا پتنگ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر لکھا تھا "کاکی"۔

چندر بھوشن سنگھ

جذب محبت کی شکایت

میں نہ کہتا تھا، رہِ عشق میں رکھو نہ قدم؟
لگ گئی تم کو بھی افسوس، کہ بیماریٔ غم
دل سے دل نے وہ غمِ کیفِ دروں لے ہی لیا
عشق نے حسن سے بھی صبر و سکوں لے ہی لیا
غم نے آخر دلِ معصوم بھی توڑا! افسوس!
عشق نے تم کو بھی آزاد نہ چھوڑا! افسوس!
غم کی زردی سے لپٹتی ہے بہارِ رخسار
خونِ امید سے آنکھیں بھی ہوئیں لالہ زار
کتنا بے چین ہے دل، روح ہے کتنی بیکل
بات میں ایسی ہے تاثیر کہ ہے رنگِ غزل
پھول سا چہرہ ہے اندوہ سے کمھلایا ہوا
دل ہے مرجھایا ہوا جیسے خزاں کھایا ہوا
کر کے بے چین مجھے خود بھی ہوئی ہو بے چین
ربطِ غم دیکھ لیا تم نے دلوں کے مابین
عمر بھر مجھ کو رلانے کا اثر دیکھ لیا
یاد رکھنا کہ بھلانے کا اثر دیکھ لیا!

فطرت واسطی

محبت اور مفلسی

جب میں راتوں کو اے مری محبوب   تجھ سے کرتا ہوں عشق کا اقرار
جب مئے بے خودی سے ہوتی ہیں   دو سہانی جوانیاں سرشار
آمد و شد کے ساتھ آتی ہے   جب تری سانس سے ہوائے بہار
روبرو دیکھتی ہے دونوں کو   جب دریچے سے چاندنی کی پھوار
رقص کرتے ہیں برق کی صورت   جب تری مسکراہٹوں کے شرار
مفلسی میرے در پہ آتی ہے   ہاتھ میں لے کے مشعلِ ادبار
زرد ہونٹوں سے حسرتوں کی نمود   سرخ آنکھوں میں بھوک کے آثار
دست و پا پر مصیبتوں کی گرد   پیرہن پر تباہیوں کا غبار
دیر تک دیکھتی ہے وہ مجھ کو   بیٹھ کر زیرِ سایۂ دیوار
میں اسی طرح بے خطر ہو کر   پیتا رہتا ہوں بادۂ انوار
میرے ہاتھوں میں زلفِ آوارہ   نظر آتی ہے زر کا اک انبار
شمع کے کیف زا اُجالے میں   مسکراتے ہیں شب کے تیرہ سنگار
آبشاروں کی طرح آتے ہیں   میرے ہونٹوں پہ رس بھرے اشعار
دیکھ کر میرے پاس دولتِ عشق
لوٹ جاتی ہے مفلسی ناچار!

سراج الدین ظفر